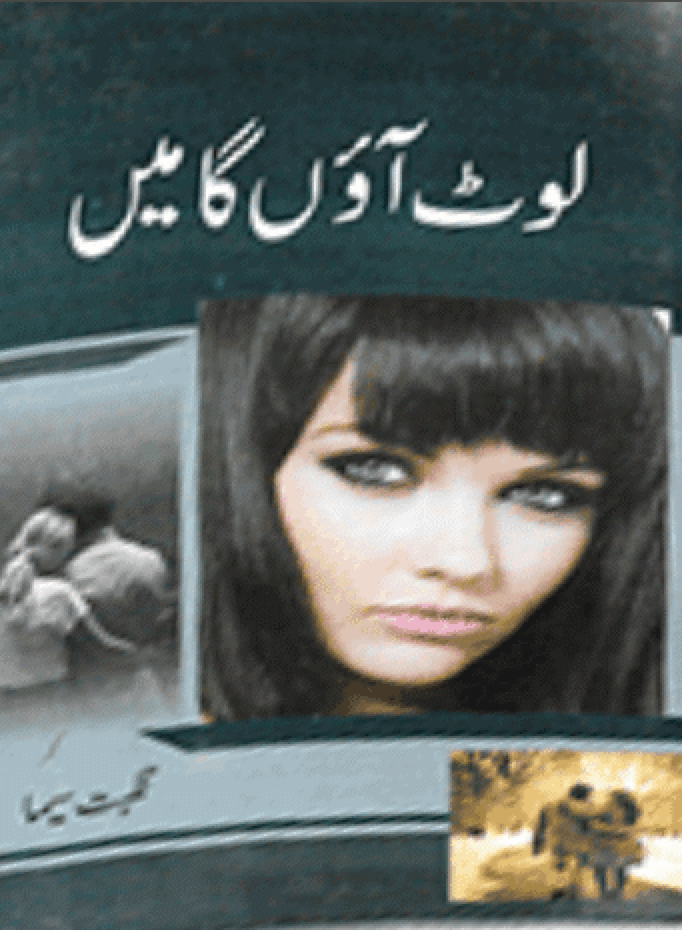
لوٹ آؤں گا میں
نگہت سیما

انتساب

صبح کے بھولے
شام کو گھر
آنے والوں
کے نام

اور جب آسمان پر سیاہ بادل جھوم جھوم آتے تو دادی اماں چیزیں سمیٹتی پھرتیں کمرے سے دالان سے چھت سے اور کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آتا سوائے گڑیا کے۔ وہ پکارتی ہی رہتیں۔

"ارے بیا تے ہماری پلنگ کہاں اٹھیں گے ہم سے۔"

"سچ بچ! تارا جان!"

لیکن سب بے فکر پرچق رفیق ستارا کی گنگناہٹ میں مست ہو گئے۔ ایسے میں میں اور بے بی چپکے سے باہر نکل جاتے۔ ہمیں ایسے موسم سے عشق تھا۔ جب بادل جھوم جھوم کر آتے۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں موتیوں کے قطروں کی طرح گرتیں اور ہم برٹی کالونی کی چوڑی سڑک کے کنارے لگے درختوں کے نیچے چلتے جاتے اور جب پتوں میں سے چھن چھن کر پانی کے قطرے ہم پر پڑتے تو بے بی کہتی۔

"یہ ہم نے اس طرح آ کر کچھ غلط تو نہیں کیا؟ بے چاری بوڑھی دادی اور سارا کی دھان پان سی گڑیا بھلا کہاں اٹھا بھاری بھاری سامان اٹھائیں گی۔"

اور پانی کے قطروں کو اپنے ہاتھوں پر لیتے ہوئے میں لاپرواہی سے کندھے اچکاتی۔

"اوہ وہ بچارے ہیں نا ..... وہ کس لیے ہیں؟"

"وہ بچاروں....." بے بی زور سے قہقہہ لگاتی۔

"ان سے تو کبھی مل کر پانی تک نہیں پیا گیا۔ ہاں گرم ہوئے تو اور گرم چائے اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔"

میں اداس ہو جاتی۔

کتنی ذمہ داریاں تھیں گڑیا پر۔

کتنے بوجھ آ پڑے تھے اس پر۔

اور وہ بڑے حوصلے سے بڑی ہمت سے سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔

کتنی محنت کرنی پڑتی تھی انہیں۔

کاش! میں ہی ان کا ہاتھ بٹا سکتی۔

اور بے بی کو پتا ہی نہ چلتا کتنے سارے آنسو بارش کے قطروں کے ساتھ میری ہتھیلی میں جذب ہو جاتے۔

مکرم گھر میں سب سے بڑے تھے اور ان کے بعد معظم پھر کاظم اور پھر احسن ......اور بے بی تھے۔ پانچوں تایا جان کی اولاد تھے۔

گڑیا اور بادل کا ہم سے کوئی رشتہ نہ تھا لیکن پھر جب جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا انہیں اپنے گھر میں ہی دیکھا تھا اور تایا جان ان کی ضروریات کا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے ہماری۔

تائی اماں اور دادی جان نے بھی کبھی ہم میں فرق نہیں کیا تھا۔ میں اکلوتی تھی اور میری پیدائش پر ہی میری امی کا انتقال ہو گیا تھا اور پھر تائی اماں نے مجھے پالا تھا اور وہ باتیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ تائی اماں کا انتقال اور پاکستانی فوجی آفیسرز کا قتل عام۔ بابا اور تایا بہت گھبرا گئے تھے اور جونہی حالات معمول پر آئے انہوں نے ہمیں راولپنڈی دادی اماں کے ساتھ بھجوا دیا۔

مکرم کسی صورت بھی آنے کے لیے تیار نہ تھے۔

''خطرہ اگر ہمارے لیے ہے تو آپ کے لیے بھی تو ہے۔''

مگر بابا نے انہیں رضا مند کر ہی لیا۔

''تم بڑے ہو مکرم! اور یہ سبھی تو ابھی بچے ہیں۔ زندگی کی سختیوں سے نا آشنا انہوں نے کبھی مشکل وقت نہیں دیکھا۔ اگر کوئی کڑا وقت آ گیا تو تمہیں ان کا سہارا بننا ہے۔ موتیوں کی اس مالا کو بکھرنے نہ دینا۔''

شاید انہیں پہلے ہی ادراک ہو گیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

ہم دادی اماں کے ساتھ آ گئے تھے۔ کوہ نور کالونی کے قریب بڑے سے صحن اور لمبے چوڑے برآمدے والا یہ گھر جس میں صرف تین کمرے تھے۔ شروع شروع میں تو ہم بہت گھبرائے۔ کہاں وہ دھان منڈی والی شاندار کوٹھی اور کہاں یہ تین کمروں کا گھر......لیکن اب تو لگتا ہے جیسے ہم برسوں سے سالوں سے اسی گھر میں رہ رہے ہوں۔ یہیں پیدا ہوئے ہوں پلے بڑھے ہوں۔

مشرقی پاکستان کے حالات بہت خراب تھے۔ ایک دن مکرم نے کہیں سے بابا کو فون کیا تو پتا چلا کہ تایا ابا کو ایک روز فیکٹری سے واپس آتے ہوئے مکتی باہنی کے غنڈوں نے مار دیا۔ دراصل......''

بابا نے بتایا۔

''ڈرائیور ساتھ ملا ہوا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور پھر......''

اور ابھی ہم تایا جان کی موت کا غم سہہ بھی نہ پائے تھے کہ مشرقی پاکستان چھن گیا اور بابا جان کی کچھ خبر نہ ملی۔ شاید وہ بھی کسی کے ستم کا نشانہ بن گئے تھے لیکن ایک آس تھی جو ٹوٹتی نہ تھی بارہ تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی نہیں۔

ہولے ہولے ہم ایڈجسٹ ہو گئے تھے۔

مکرم نے ملازمت کر لی تھی۔

وہ مکرم جو کبھی شیخ برادرز کا مالک تھا۔ اب ایک معمولی ملازم تھا۔ ہم سب پڑھنے لگے تھے۔

''شکر ہے......یہ ٹھکانا بھی تھا۔''

دادی جان شکر کرتیں۔

''یہ اس ٹھکانے پر شکر ادا ہو رہا ہے۔''

معظم کھل کھلا کر ہنستا۔

''ارے بیٹا! تم کیا جانو بے گھری کا عذاب...... جب پاکستان بنا تھا تو میں تمہارے دادا اور تمہارے ابا اور چچا کیا بھرا ہوا گھر چھوڑ کر آئے تھے۔ یہ بڑی حویلی نوکروں کی فوج اور کہاں وہ کیمپ کا کونا جس میں میں دونوں بچوں کو لیے سکڑی بیٹھی رہتی اور تمہارے دادا مکان کی تلاش میں خوار ہوتے اور پھر ایک عزیز نے لکھا راولپنڈی آ جاؤ۔ ایک گھر تمہارے لیے ڈھونڈ رکھا ہے اور ہم یہاں آ گئے ہیں اس میں......''

''اور یہ پلنگ کیا موہنجوداڑو کی کھدائی میں سے ملے تھے۔'' کاظم پوچھتا۔

سرخ پایوں والے بڑے بڑے نواری پلنگ جنہیں میں بے بی اور گڑیا اکیلے ہلا بھی نہیں سکتے تھے۔

"ارے کہاں بیٹا! یہاں پڑوس والے گھر خالی کر گئے تو پرانا سامان بیچا تو تمہارے دادا نے خرید لیے۔"

"دادا کو اس سے بہتر پلنگ اور کہیں سے نہیں ملے تھے۔"

معظم کو شکوے کرنے کی بہت عادت تھی اور اسے خطرہ تھا کہ ان پلنگوں کو اپنی جگہ سے گھسیٹ گھسیٹ کر کسی دن اس کی کمر ضرور داغ مفارقت دے جائے گی۔

"سستے مل رہے تھے۔ سوچا تھا زمین پر سُونے سے بہتر ہیں۔"

"اس سے زمین پر سونا زیادہ بہتر تھا دادی جان۔"

معظم کراہتا۔

اس گھر میں صرف تین کمرے تھے۔ (اور وہاں دھان منڈی میں ہم سب کے الگ الگ کمرے تھے۔)

ایک میں وہ چاروں ہوتے تھے۔

اور ایک میں بے بی گڑیا اور دادی جان۔

تیسرے کمرے سے دونوں نواڑی پلنگ اٹھا کر اسے ڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرف ایک سنگل بیڈ تھا جسے کاظم ایک دن نیلامی سے لے آیا تھا اور مکرم گھر پہ ہوتے تو وہ ڈرائنگ روم میں ہی سو جاتے تھے۔ گھر بہت بڑا تھا۔ اگر صحیح طریقے سے تعمیر کیا جاتا۔ اتنا بڑا صحن تھا جس میں گڑیا نے بہت سی سبزیاں اگا رکھی تھیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔"

چلتے چلتے بے بی رک جاتی۔

ہمیں اس طرح کے موسم میں درختوں تلے کالونی کی سڑکوں پر چلنا بہت پسند تھا۔ لیکن پھر بے بی کو دادی جان کا خیال آ جاتا۔ جو اکیلی چیزیں سمیٹتی پھر رہی ہوں گی۔ سب سے مشکل کام تو ان پلنگوں کو گھسیٹ کر کونے میں کھڑا کرنا ہوتا تھا۔ کیونکہ جہاں وہ بچھے ہوئے تھے وہاں بارش کی بوچھاڑ سیدھی پڑتی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دادا جان نے اتنی بڑی فیکٹری لگائی تھی تو اس موہنجوداڑو کی یادگار کو اٹھا کر باہر کیوں نہیں پھینکا؟"

معظم غصے کا بھی تیز تھا۔

"ارے بیٹا! یہاں رہے ہی کب؟ ڈھاکہ میں کارخانہ بناتے ہی وہ سب کو وہیں لے گئے اور یہاں اماں نوراں کو چھوڑ گئے۔ کبھی کبھار پانی بدلنے کو آ جاتے تھے۔ میں نے تو کئی بار کہا بھی کہ یہ گھر فروخت کر دو لیکن وہ ہی نہ مانے۔ کہتے تھے وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کیا خبر کب کیا مشکل وقت آ جائے اور اب دیکھو...... ٹھکانا تھا نا سر چھپا کر بیٹھ گئے۔"

"ہاں...... دادا تو ولی اللہ تھے جیسے......"

کاظم چڑ کر کہتا۔

"پر کہتے تو ٹھیک تھے ناں۔"

احسن چپکے سے دادی کی تائید کرتا۔

"تو پھر دس پندرہ لاکھ روپیہ بھی کیوں نہ ادھر رکھوا دیا یہاں کے بینکوں میں۔"

معظم کو سب سے گلے تھے حالانکہ وہ مکرم سے چھوٹا اور باقی سب سے بڑا تھا لیکن وہ بارہ سال گزرنے کے بعد بھی ابھی تک ایڈجسٹ نہیں ہو پایا تھا۔ اسے وہ گھر یاد آتا تھا، وہ سہولتیں یاد آتی تھیں۔ تو ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔ بارہ سال پہلے وہ بارہ سال کا تھا اور اب چوبیس میں لیکن ابھی پچھلے سال ہی اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

پورے دو برس اس نے یونہی آوارہ گردی کرتے اور جوتیاں چٹخاتے گزار دیئے تھے۔ مکرم کی لاکھ منتوں کے باوجود بھی اس نے داخلہ نہیں لیا تھا۔ اور اب پتہ نہیں کیسے اس کے جی میں آیا تھا کہ خود ہی اس نے داخلہ لے لیا تھا۔ وہ پاکستان اسٹڈی میں ایم اے کر رہا تھا۔

اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی واپس آ جاتے۔

اور جب ہم اپنی دانست میں چپکے سے اندر داخل ہوتے تھے تو کوئی نہ کوئی دیکھ ہی لیتا تھا۔

"کہاں گئی تھیں تم دونوں؟" معظم گھورتا۔

"اب بیمار پڑنا تم...... پہلے ہی خرچ پورا نہیں ہوتا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔"

ہم اپنے بالوں سے پانی کے قطرے جھاڑتے اور تولیے سے صاف کر لیتے۔

"اور تم کھڑے یہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ شرم تو نہیں آتی بے چاری گڑیا اور دادی......"

بے بی اسے جھاڑتی۔

اور معظم سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورتا ہوا پلنگ گھسیٹ کر کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتا اور پلنگ پر پڑا ہوا کپڑوں کا ڈھیر، کتابیں اخبار اور دوسرا الم غلم سب نیچے گر جاتا۔

"ہائے میری کتابیں۔"

بے بی تولیہ پھینک کر بھاگتی۔

پتا نہیں کیوں سب اتنے کاہل سست و پھوہڑ ہو گئے تھے۔ میں نے کتنی بار احسن اور کاظم سے کہا تھا۔

"بھائی! یہ پہلے کپڑوں کا ڈھیر یہاں پلنگ پر نہ پھینکا کرو اور یہ اپنی فائلیں اور کتابیں...... کوئی آجائے تو کیسا برا لگتا ہے۔"

مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے۔

"جب آدمی کے پاس پیسہ نہ ہو اور زندگی تنی "اوکھی" ہو تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ پھوہڑ، سست ورکاہل۔"

"ناشکرو اللہ کا شکر کیا کرو۔"

بے بی بڑی قناعت پسند تھی۔

"تم تھوڑی ہو شکر کرنے کے لیے۔"

معظم چڑ جاتا۔

"اللہ دو وقت کی روٹی تو دے رہا ہے نا۔"

میں بھی بے بی کا ساتھ دیتی۔

"اور یہ دو وقت کی روٹی ایک شخص صرف ایک شخص کا لہو نچوڑ کر حاصل کی جاتی رہی ہے۔ ارے تم سب خود غرض ہو۔ لالچی، حریص۔"

وہ کن اکھیوں سے گڑیا کی طرف دیکھتا۔ جو پیلی پڑ جاتی تھی اور چیزیں سمیٹتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح کانپتے۔

"بکو نہیں......"

بے بی اسے دھموکا مارتی اور جھک کر زمین پر گری ہوئی چیزیں اٹھانے لگتی اور میں گڑیا سے

نظریں چرا کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں گھس جاتی یہاں جہاں وہ تینوں ابھی تک فرینک سناترا کی گولڈن ڈسک میں مست ہوتے اور پھر گڑیا چائے بنا لیتی اور دادی اماں خود کو گرم شال میں اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھ جاتیں اور ماضی کا کوئی نہ کوئی قصہ چھیڑ دیتیں اور گڑیا اپنی ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹیکے بڑے انہماک سے ان کی باتیں سنتی۔

اور وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا بادل یوں ہی جھوم جھوم کر آئے تھے اور ننھی ننھی بوندیں ایک تواتر سے گر رہی تھیں۔ گڑیا اور دادی جان صحن سے چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھیں۔ اور وہ چاروں جانے کہاں تھے۔ میں اور بے بی دادی جان کی آنکھ بچا کر باہر نکل آئے اور کالونی کی چوڑی سڑک پر بارش کا لطف لیتے چلنے لگے۔

"مجھے مکرم کی بہت فکر ہے۔"

بے بی نے چلتے چلتے کہا۔

"آج کل رات کو بہت دیر سے آنے لگے ہیں۔ لگتا ہے کوئی پارٹ ٹائم جاب کر لی ہے۔ پہلے ہی اوور ٹائم کر کر کے حلیہ خراب کر رکھا ہے اور یہ معظم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس نے دو سال ضائع کیے کیوں۔ اب تک سروس کر رہا ہوتا اور مکرم کا آدھا بوجھ بٹ جاتا۔"

"دراصل......"

میں نے بے بی کو سمجھایا۔

"معظم کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے کر مکرم کا بوجھ کم کر رہا ہے اور یہ دو سال اس نے بے کار جوتیاں نہیں چٹخائیں۔ بلکہ نوکری تلاش کرتا رہا ہے۔"

"اور اسے نوکری نہیں ملی۔"

بے بی نے جل کر کہا۔

"ڈھونڈنے والوں کو تو خدا بھی مل جاتا ہے اور اگر وہ نوکری کرنا چاہتا تو مل جاتی، کہیں نہ کہیں۔ وہ تو بس غصہ کرنا ہی جانتا ہے۔ اور ہم سب...... ہم سب کا بس خود غم بھی ہیں۔

مگر بھائی فیس، مکرم کا پی، مکرم بس کا کرایہ گھر مکرم نے روپے بنانے کی مشین لگا رکھی ہے۔ اللہ کرے جائیں تم سب......"

بے بی آج بہت ڈیپریسڈ ہو رہی تھی۔

"اور ہم سب سے اچھی تو گڑیا تھی جو میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ کر گھر ہی بیٹھ گئی تھی۔"

"ارے کیوں گڑیا بیٹے یہ غلط ہے۔" مکرم نے پوچھا۔

"بس مجھے شوق نہیں ہے۔"

حالانکہ ہم سب کو پتا تھا کہ اسے پڑھنے کا کتنا شوق ہے، اور ہر کلاس میں وہ فرسٹ آتی رہی ہے۔ لیکن وہ ایسی چھوٹی موٹی قربانیاں دیتی رہتی تھی۔ بغیر جتائے اور ہم سب اس کی ان قربانیوں کے عادی ہو چکے تھے اور ہم میں سے وہ کوئی بھی اس کی طرح قربانی نہیں دے سکتا تھا سب باہر ہی ہوتے تھے اور بس...... ان کا خون چوسے جاتے تھے۔

میں جو مکرم سے محبت کرتی تھی۔

میں بھی۔

میں نے بھی کچھ نہیں کیا تھا اور کچھ نہیں گڑیا کی طرح پڑھائی چھوڑ کر ان کا بوجھ کم کر سکتی تھی۔ ہم سب کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن شاید ہم سب تن آسان تھے سوائے گڑیا کے کتنی محنت سے کیاریاں بنا کر اور احسن کی منتیں کر کر کے بیج منگوا کر اس نے سبزیاں لگائی تھیں اور سردی گرمی میں ان کی حفاظت کرتی تھی اور بڑے غیر ٹھوس طریقے پر اس نے سبزی کا خرچ بچا لیا تھا۔

بارش میں بھیگتے ہوئے پہلی بار میں نے سوچا کہ ہم سب کو اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔

بارش یک دم ہی تیز ہو گئی۔ میں اور بے بی سڑک سے ہٹ کر درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ باتوں باتوں میں احساس بھی نہیں ہوا تھا اور ہم بہت آگے نکل آئے تھے۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی تو ہم درخت کے نیچے سے ہٹ کر ایک بنگلے کے شیڈ تلے کھڑے ہو گئے۔ مگر بارش پھر بھی ہمیں بھگوئے جا رہی تھی۔

"کھڑا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

بے بی نے کہا۔

"بارش کم نہیں ہوگی چلو......"

اور ہم چل پڑے۔ ایک دم ہی اندھیرا ہو گیا تھا۔ حالانکہ تین چار بجے کا وقت تھا لیکن لگتا تھا رات ہو گئی ہو۔ دور نزدیک کوئی نہیں تھا۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے کہ پیچھے سے ایک سیاہ گاڑی

بالکل ہمارے قریب آ کر رکی۔ بہت سے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑے۔

"آئیے...... میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

کھڑکی سے ایک مہذب سے شخص نے جھانکا۔

"شکریہ......"

میں نے کہا اور ہم نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

"دیکھیے موسم بہت خراب ہے اور......"

"ہم پانیوں کے دیس سے آئے ہیں اور یہ موسم ہمارا کچھ نہیں بگاڑتا۔"

"اے پانیوں کے دیس کی شہزادی! گھر میں سب پریشان ہو رہے ہیں۔"

احسن نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"ارے ٹیپو کے بچے! پہلے کیوں نہیں بولے۔"

بے بی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں ذرا جھجکی کپڑے بارش میں بھیگ چکے تھے۔

"پلیز جلدی کریں۔"

"ڈرائیو کرنے والے نے کہا تو میں بھی جلدی سے بیٹھ گئی۔

"اب بکو...... یہ گاڑی اور یہ بندہ......"

بے بی کی سرگوشی بھی کافی اونچی تھی۔

"یہ تمہارا احمقوں والا شوق ضرور کسی دن تمہاری جان لے لے گا۔" احسن نے سرزنش کی۔

"مگر تم لوگ گھر پر نہیں تھے۔"

"جی...... اور جب آئے تو گڑیا کو دھاروں دھار روتے پایا۔ پتا چلا تم دونوں ہمیشہ کی طرح فرار ہو گئی ہو اور گڑیا کو خطرہ ہو چلا تھا کہ تم دونوں ضرور آج ڈوب جاؤ گی اور خواہ مخواہ اس مہنگائی میں کفن دفن کا خرچا مجبوراً کاظم اور میں تمہیں ڈھونڈنے نکلے، کاظم تو دوسرے گیٹ سے اور میں ادھر سے چھوٹے گیٹ سے کالونی میں آیا اور مجھے اتفاق سے مدثر بھائی مل گئے۔"

"کون......؟" بے بی نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"ہمارے نئے پڑوسی ہیں......"

"اچھا...... وہ سفید ماربل والی کوٹھی میں آئے ہیں۔"

"جی......"

اور میں نے بے بی کو ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کو کہا۔ کیا کہے گا یہ شخص کہ کس قدر بولتی ہیں یہ لڑکیاں۔

اور جب گاڑی گھر کے سامنے رکی تو ہم دونوں تو فوراً اتر کر اندر بھاگیں۔ احسن مدثر صاحب سے مذاکرات کر رہا تھا۔ گڑیا برآمدے میں کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے ہونٹ لرزنے لگے اور پلکیں بھیگ گئیں۔

"اچھا......اچھا۔"

بے بی نے اس کے کندھے تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

"ہم مرے مرائے کچھ نہیں ہیں، زندہ سلامت آ گئے ہیں اور پھر اتنی سی بارش میں کوئی ڈوبتا ووبتا تھوڑا ہی ہے۔"

"اچھا......اچھا اب مرو جا کر کپڑے تبدیل کرو۔"

احسن نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے مدثر بھی تھا۔

"اور گڑیا! تم فٹافٹ چائے بناؤ گرما گرم......ابھی کاظم بھی آ رہا ہوگا۔"

اور ہم دونوں جب تولیے سے خوب اچھی طرح بال خشک کر کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آئے تو کاظم برآمدے میں کھڑا حسرت سے صحن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں صحن میں کھڑے پانی میں اس کا جوتا تیر رہا تھا۔

"سوری کاظم......"

گڑیا نے ندامت سے کہا جو چائے کی ٹرے لیے کچن سے نکلی تھی۔

"دیکھا نہیں تھا۔"

"چھوڑو سوری......اس کا اپنا قصور ہے۔"

بے بی نے کاظم کو چڑایا۔ کاظم کی عادت تھی کہ کالج سے آتے ہی پلنگ پر گر جاتا۔ اور پھر جوتا صحن کے ایک کونے میں جرابیں دوسرے کونے میں یونہی پھینکتا چلا جاتا۔

"کاظم تم بھیگے کپڑے اتار کر آ جاؤ، ڈرائنگ روم میں ہی مکرم بھی آ گئے ہیں۔"

"ارے مکرم اتنی جلدی......"

مجھے اور بے بی کو یکساں خوشی ہوئی اور ہم کاظم کو وہیں چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگے۔

مکرم دری پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ان کی ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

بے بی ان کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں......بس شاید فلو ہو رہا ہے۔ گڑیا مجھے چائے کے ساتھ ڈسپرین بھی دے دینا۔"

احسن اور مدثر بھی وہیں دری پر بیٹھے تھے۔ مجھے احسن پر غصہ آیا کہ اس نے مدثر کو بھی وہیں دری پر بٹھا دیا تھا۔ آخر وہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔ لیکن احسن کو تو عقل چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

چلیں اسی بہانے آپ سے بات کرنے کا موقع تو ملے گا نا ورنہ آپ اتنی رات گئے تھکے ہوئے آتے تھے کہ......

بے بی کو بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔

"تم چاہتی ہو کہ انہیں ہر روز فلو ہو جائے۔"

کاظم نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔ اس لیے تم ہمیشہ الٹا ہی سمجھتے ہو۔"

"مدثر!" مکرم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"یہ تینوں میری بہت پیاری بہنیں ہیں اور یہ دونوں شریر بھی میرے بھائی ہیں۔ دو بھائی اور بھی ہیں جو اس وقت اتفاق سے گھر پر نہیں ہیں اور یہ جو مدثر ہے ناں۔ اس شہر میں آ کر سب سے پہلے میری جس سے ملاقات ہوئی تھی اور دوستی ہوئی تھی۔ وہ یہ ہی مدثر ہے۔ پھر اچانک یہ باہر چلا گیا اور اب اتنے سارے سالوں بعد آج اتفاقاً ملاقات ہوئی ہے۔"

"اب یہ اتفاقیہ ملاقات اکثر ہوتی رہے گی کیونکہ یہ سامنے والی سفید کوٹھی ان ہی کی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

مکرم خوش لگ رہے تھے جبکہ مدثر کچھ تکلف سے بیٹھا تھا۔

"یار! ایزی ہو کر بیٹھ جاؤ۔ یہاں سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگرچہ سب کی عمروں میں تھوڑا بہت فرق ہے لیکن سب ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوستوں کی

طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے۔"

گڑیا ڈسپرین لے آئی تھی۔ اس نے سب کو چائے سرو کی۔

"اس موسم میں خالی خولی چائے کچھ مزا نہیں دیتی گڑیا! تھوڑے سے پکوڑے بھی بنا لیتیں۔" کاظم نے کہا۔

"بیسن نہیں تھا۔"

گڑیا نے آہستگی سے کہا۔

"اس وقت کچھ اور مانگتا تو تجھے وہ بھی مل جاتا۔"

بادل ہاتھ میں پکوڑوں کا لفافہ لیے کھڑا تھا اور اس کے پیچھے معظم تھا۔ ہمیشہ کی طرح پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آؤ معظم! ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔ بہت دنوں سے ملے نہیں۔"

مکرم نے اپنے پاس اس کے لیے جگہ بنائی۔

دراصل مکرم رات کو دیر سے آتے۔ معظم سو چکا ہوتا اور صبح معظم بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ کیونکہ اسے اسلام آباد جانا ہوتا تھا اور ذرا دیر ہو جاتی تو پھر گھنٹہ گھنٹہ بس کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

معظم خاموشی سے جوتے اتار کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے ایک بار بھی مدثر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"یہ مدثر ہے۔"

مکرم نے خود ہی تعارف کرایا تو اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ گڑیا جب بادل اور معظم کے لیے چائے بنا کر لائی تو دادی اماں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ باہر ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ مدثر گھبرا کر اٹھا لیکن مکرم نے اسے بٹھا لیا۔

"بیٹھو نا ابھی تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ ان بیتے سالوں میں کیا گزری۔"

"کیا گزری...... لمبی کہانی ہے۔ پیسہ البتہ کما لیا۔ اتنا کہ یہ گھر بن گیا۔ بہن بھائی پڑھ رہے ہیں اچھے کالجوں، سکولوں میں اور بہنوں کی شادیاں آرام سے ہو جائیں گی۔"

"تم واپس آ گئے ہو؟"

"نہیں...... چھٹی پر آیا ہوں۔ چند دنوں بعد چلا جاؤں گا۔"

"کیا آپ مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ میں بھی باہر جانا چاہتا ہوں۔"

معظم نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔

"لیکن مکرم نے ابھی بتایا کہ تم پڑھ رہے ہو۔"

"ہاں...... اس لیے کہ مکرم چاہتے ہیں۔ میں پڑھوں ورنہ میں پیسہ کمانا چاہتا ہوں۔ کوئی آسان سہل راستہ پیسہ کمانے کا۔ اس لیے کہ مجھے پتا ہے کہ ایم۔اے کی ڈگری بھی مجھے نوکری نہیں دلا سکے گی۔"

"پیسہ کمانا آسان نہیں ہے۔"

مدثر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہاں اجنبی ملکوں میں جا کر بڑی خواری ہوتی ہے۔ بڑی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ بڑا عذاب ہوتا ہے۔ وہاں تم اس ماحول کو ترسو گے۔ کیا پتا تمہیں کیا کرنا پڑے۔ پتھر کوٹنے پڑیں۔ یا ہوٹلوں میں برتن دھونے پڑیں یا اس سے بھی بدتر کوئی کام۔"

"میں......" اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

مکرم سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور ان کی پیشانی پر لکیریں تھیں۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں نے سب کام کیے ہیں۔ برتن دھونے سے لے کر پتھر کوٹنے تک کا۔ شروع شروع میں مجھے برتن دھونے کا کام ملا تھا۔ سفید ربڑ کے دستانے پہن کر برتن دھوئے جاتے تھے۔ گرم ابلتے پانی سے برتن نکالنے کی وجہ سے میری انگلیوں کی کھال اترنے لگی تھی اور ناخن خراب ہو گئے تھے۔ مگر منیجر مجھے دستانے اتار کر برتن دھونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔"

مکرم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"لیکن مدثر! تمہارے پاس یہاں بھی تو بڑی اچھی جاب تھی۔"

"ہاں...... لیکن وہ جاب صرف روٹی اور کپڑا ہی مہیا کر سکتی ہے جبکہ زندگی کے تقاضے کچھ اور بھی تھے۔"

"مدثر صاحب پلیز Request you اگر اس سلسلے میں آپ میری راہنمائی کر سکتے

ہیں تو ضرور کیجیے۔"

"ہاں ......اگر میرے اختیار میں کچھ ہوا تو ضرور۔"

وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔

مکرم نے بڑی شاکی نظروں سے معظم کو دیکھا۔

"کیا مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی معظم؟"

"نہیں ......نہیں مکرم! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

معظم کے تنے ہوئے چہرے پر نرمی اتر آئی تھی۔ اس نے ایک دم مکرم کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں تو ......میں تو بس آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ آپ کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب منزل پہ آ کے میرے حوصلے کم کیے دے رہے ہو۔ اب تو سارا سفر طے کر آئے ہیں۔ تھوڑی سی راہ باقی ہے۔ وہ بھی کٹ جائے گی۔ تم پڑھو اطمینان سے ......اور پریشان نہ کرو خود کو......"

مکرم نے ہولے سے اس کی پیٹھ تھپکی اور آنکھیں موند کر تکیے سے ٹیک لگا لی۔ بے بی ان کا سر دبانے لگی تو ہم سب چپکے سے باہر نکل آئیں۔ تاکہ وہ آرام کر سکیں۔

باہر آ کر میں نے سب کی طرف دیکھا۔

"آپ سب لوگ خودغرض ہیں۔ مجھ سمیت ہم چاہتے تو ہم مکرم کا ہاتھ بٹا سکتے تھے اور اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے اور کچھ نہیں تو اپنی اپنی تعلیم کا خرچ اٹھا سکتے تھے دو چار ٹیوشن کر کے۔"

میری آواز بھرا گئی۔

"میں تو کل سے ہی کوئی ٹیوشن ڈھونڈتی ہوں۔"

احسن اور کاظم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"بڑی جلد خیال آیا مس خوشنود فضل......"

معظم ہمیشہ جلا بھنا رہتا تھا۔

"آ تو گیا نا۔"

"اور سنو......"

میں نے کاظم، احسن اور بادل کو مخاطب کیا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ مکرم کتنے کمزور ہو رہے ہیں۔"

"بات یہ ہے بی بی کہ ہم سب ہی کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔"

بادل مجھے بی بی کہتا تھا۔

"کاظم تو دو بجے سے پانچ بجے تک ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب کرتا ہے۔ میں اور احسن دو تین ٹیوشنز پڑھاتے ہیں معظم بھی......"

"اوہ......"

میں ایک دم شرمندہ ہو گئی۔

یعنی سب کو ہی خیال تھا، سوائے میرے اور بے بی کے۔ میں جو اپنے آپ کو مکرم کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتی تھی۔ میں ہی......یعنی میں۔

"کیا مجھے کوئی ٹیوشن نہیں مل سکتی بادل......؟"

میں نے ندامت سے سر جھکائے جھکائے پوچھا۔

معظم نے غصے سے کہا۔

اسے خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی عادت تھی۔

"میں نے تم سے مشورہ تو نہیں لیا نا۔"

"مگر میں راہنمائی کرنا فرض سمجھتا ہوں اور پھر مکرم بھی اسے ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ تمہیں ان کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔"

اس کے لہجے کی سختی کم ہو گئی تھی۔

"دیکھو نودی! میں بہت جلد باہر چلا جاؤں گا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم گھبرانا نہیں۔"

"ہم تو ذرا بھی نہیں گھبراتے عظمیٰ صاحب! اور ہم بہت مطمئن ہیں۔ گھبراہٹ تو......تمہیں رہتی ہے ہر وقت۔ کیا رکھا ہے بھائی پیسے میں؟"

"ہاں......ہاں......مجھے گھبراہٹ رہتی ہے۔ تم تو ولی اللہ ہو۔ بغیر کھائے پیے بھی زندگی گزار سکتے ہو۔"

اسے پھر غصہ آ گیا تھا۔

"یار عظمیٰ! اتنا غصہ نہ کیا کرو۔ کسی دن دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔"

کاظم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ پاؤں پٹختا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔

"دراصل......" بادل نے سر کھجایا۔

"عظمیٰ سب سے خفا ہے۔ دنیا سے......لوگوں سے......ہم سب سے۔ حتیٰ کہ خدا سے بھ
جس دن اس کی خدا سے صلح ہو گئی نا۔ اس دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بادل نے کہا۔

بادل ہم سب سے چھوٹا تھا اور اسی سال اس نے میڈیکل کالج جوائن کیا تھا لیکن بات بہت سمجھداری سے کرتا تھا۔ معظم جو اتنا غصے میں رہتا تھا تو اس کا اتنا قصور بھی نہیں تھا۔ ایک تو یہ زندگی ایک دم سے تبدیل ہوئی تھی اور اس کا ذہن اس تبدیلی کو قبول نہیں کر سکا تھا۔ دوسرے یہ وہ لاڈلا بھی بہت تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد ایک دم ہی تایا ابا نے بہت ترقی کی تھی۔ کارخا فروخت کر کے مل خرید لی تھی۔ اور وہ معظم کو مبارک سمجھتے تھے۔ پھر ابا نے اسے بیٹا بنا رکھا تھا۔ داد کا بھی وہ لاڈلا تھا۔ بچپن میں ذرا کمزور اور بیمار رہتا تھا۔ اس لیے تائی اماں نے بھی اسے زیادہ تو اور محبت دی تھی۔ اب یہ ساری محبتیں اس سے چھن گئی تھیں اور یہی نہیں زندگی بھی مشکل ہو گئی تھی سو وہ غصے میں رہتا تھا اور ہم سب اس بات کو جانتے تھے، اس لیے اس کی بات کا برا نہ مانتے تھے

اس روز ہم کالج سے آئے تو برآمدہ خالی خالی تھا۔ کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ گڑیا پا چڑھائے برآمدہ دھو رہی تھی اور کاظم پائپ پکڑے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"یہ......یہ کیا ہے۔ وہ ہمارے آثار قدیمہ پلنگ؟"

"فروخت کر دیئے۔"

"ارے کیوں؟ کب؟"

بے بی وہیں دھب سے بیٹھ گئی۔

"اب ہم اپنے کپڑوں کا ڈھیر کہاں رکھیں گے اور تمہاری کتابیں اور فائل اور گڑیا کی سلائ کا سامان۔ میرے ربن اور معظم کیف......"

"کتنے میں فروخت کیے۔"

احسن کچن سے چلاتا ہوا باہر نکلا۔

"سولہ سو روپے کے۔"

"ہرا......" وہ زور سے اچھلا۔

"آج عیش کریں گے کاظم! روپے کہاں ہیں؟"

اس نے پوچھا۔

"بادل کے پاس۔"

"اور بادل کہاں ہے؟"

"پتا نہیں۔"

کاظم کو سسپنس پیدا کرنے کی عادت تھی۔

"بادل جہاں بھی ہے لیکن آج رات زبردست دعوت ہو گی۔"

احسن نے فیصلہ سنا دیا۔

"سن لیا تم نے گڑیا۔"

"جی......" گڑیا اب وائپر لگا رہی تھی۔

اور جب برآمدہ چمک اٹھا اور گڑیا نے سب کو کھانے کے لیے کچن میں بلایا۔ تو بادل آ گیا۔ اس کے ساتھ آٹھ آدمیوں والی ڈائننگ ٹیبل تھی۔

"ارے یہ کیا؟"

ہم سب کھانا چھوڑ کر باہر لپکے اور پھر سب کے مشورے سے اسے ایک کونے میں سیٹ کر دیا گیا۔

"سارے پیسے خرچ کر دیئے۔"

"نہیں ابھی چار سو ہیں۔"

بادل نے بتایا۔

"کرسیاں اور ٹیبل خاصی نئی تھیں بلکہ اچھی تھیں ایسا سیٹ اگر بنالیا جاتا تو تین ہزار سے کم کہاں ملتا لیکن نیلام میں بارہ سو میں ملا تھا۔ سب بہت پر جوش ہو رہے تھے بے بی اور احسن نے اظم کو سراہا کہ اس نے ایک عقلمندی کا کام کیا ہے۔ ورنہ امید تھی کہ مستقبل قریب میں سب کی کمر ں مستقل درد رہنے لگتا۔ یوں بھی راولپنڈی کا موسم بڑا بے اعتبار تھا۔

اس روز پلنگ فروخت ہوئے اور نیا ڈائننگ ٹیبل سیٹ آنے کی خوشی میں سب نے خوب

ہنگامہ کیا۔ بادل اور احسن نے مل کر ڈانس کیا۔ کاظم نے گانا گایا۔ گڑیا نے چائے کے سا
پکوڑے تلے۔ سب خوش تھے لیکن معظم کا موڈ خراب تھا۔

''یہ سب فضول خرچی ہے۔ کھانا زمین پر بیٹھ کر بھی کھایا جا سکتا تھا۔''

''کوئی فضول خرچی نہیں۔''

''یہ رقم کسی مشکل وقت پر کام آسکتی تھی۔''

لیکن کسی نے اس کی باتوں کی پروا نہیں کی کاظم یونہی مشین کے ڈھکن پر ڈھول بجاتا ر
پھر احسن اپنا چینجر اٹھا لایا۔ معظم کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

''عظمیٰ! کبھی تو خوش ہو جایا کرو۔''

میں نے اس کے قریب آتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''زندگی سے اس طرح خفا نہیں ہوتے میرے بھائی! اور یہ سب تو محض بہانے ہیں۔ ا
آپ کو خوش کرنے، جینے کے ورنہ ایک ڈائننگ ٹیبل ہمارے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے دھان منڈی والے گھر کا ڈائننگ روم تھا۔

''تو نہیں جانتی، نودی! تجھے نہیں پتا۔''

''تو نہیں جانتی، نودی! تجھے نہیں پتا۔''

اس نے عجیب بے بسی سے ہاتھ ملے۔

میں سب جانتی ہوں عظمیٰ کہ اتنے سال گزارنے کے بعد بھی تم سمجھوتا نہیں کر پائے ہو
دیکھو سب کے ساتھ مل کر ان کی خوشی شیئر (Share) کرو۔ ہماری خوشیاں ہی کیا ہیں۔''

''بڑی عقلمندی کی باتیں کرنے لگی ہے تُو نودی۔''

اس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں روشنی سی کوندنے لگی اور گندمی چہرے پر اطمینان
جھلکا۔

''اس طرح پُرسکون ہوتے ہو تو بہت اچھے لگتے ہو کبھی آئینے میں دیکھنا۔''

''اچھا......''

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''ارے نودی۔''

بے بی چلائی۔

''تمہیں تو جانا تھا ٹیوشن پڑھانے۔''

''اوہ......''

میں نے گھڑی دیکھی اور بھاگی۔

''سنو......'' معظم نے گیٹ پر مجھے روک لیا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔''

وہ ناراض لگ رہا تھا۔

''دیکھو عظمیٰ! اس میں کوئی حرج نہیں۔ حالات کو بدلنے کے لیے ہم سب کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ پلیز...... یہ قریب ہی تو گھر ہے۔''

''کس کو پڑھاتی ہو؟''

''دو بچے ہیں، ایک لڑکی ایک لڑکا۔ دونوں اٹھویں کلاس میں پڑھتے ہیں اور پانچ سو فیس ملے گی۔ کم از کم اب مجھے مکرم سے اپنا خرچ نہیں لینا پڑے گا۔''

''مگر تمہیں پتا ہے کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں؟''

''لوگوں کے چہروں پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ کیسے ہیں اور پھر ابھی تو مجھے چند دن ہی ہوئے ہیں جاتے ہوئے۔ یہ مدثر صاحب کے گھر کے ساتھ جو نیا گھر بنا ہے۔''

''نو دولیتے لگتے ہیں۔''

معظم نے رائے دی۔

''ہاں......'' میرا بھی یہی خیال تھا۔''

''محتاط رہنا۔''

''اچھا......''

میں بھاگم بھاگ پہنچی لیکن لیٹ تھی۔ مسز جبار مجھے باہر ہی مل گئیں۔

''دیکھو بی بی! یہ نہیں چلے گا۔ وقت پر آنا ہے تو آؤ پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ مفت تو نہیں

پڑھاتی ہو۔''

میری آنکھیں جلنے لگیں اور اندر کچھ پگھلنے لگا۔

''جی میں ایک گھنٹہ پورا پڑھا دوں گی۔''

''اے کیسے پڑھاؤ گی آدھ گھنٹے بعد ٹھیک پانچ بجے تو ان کے حساب کے استاد آ جا
گے۔''

''جی......'' میں نے آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا۔

''میں کل جلدی آ جاؤں گی۔ زیادہ دیر پڑھا دوں گی۔''

''میرے بچوں کا ہر چیز کا وقت مقرر ہے، پونے چار بجے تو یہ آتے ہیں ادھر سے۔ کیا
ہے جوڈو کراٹے والے سنٹر سے۔''

''جی......'' میں نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''جاؤ اندر...... بچے انتظار کر رہے ہیں لیکن آئندہ دھیان رکھنا۔ میں یہ برداشت نہیں
سکتی۔ آخر پانچ سو روپے دیتے ہیں۔''

''اتنی ذلت......''

میں نے سوچا۔

لعنت بھیجوں اور سیدھی چلی جاؤں گھر...... آخر مجھے کیا تکلیف ہے۔ روٹی کپڑا مل رہا ہے
تعلیم کا خرچ پورا ہو رہا ہے لیکن پھر مکرم کا تھکا تھکا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اور اسے سک
دینے کا خیال مجھے تقویت دے گیا۔

رات گڑیا نے سچ مچ اہتمام کر لیا تھا۔

کھیر، کڑاہی گوشت، شامی کباب، نان اور پلاؤ۔

''جیتی رہو گڑیا۔''

کاظم نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھما ڈالا۔

''اس گھر کا کچن گڑیا کے دم سے آباد ہے۔''

''اگر گڑیا کی شادی ہو گئی تو ہم کیا کریں گے۔'' بے بی نے احمقوں جیسی بات کی۔

''گڑیا کی شادی ہی کیوں ہو گی۔''

احسن اس سے کہیں زیادہ بونگا تھا۔

''واہ ہم اپنی گڑیا کی بہت دھوم دھام سے شادی کریں گے۔''

مکرم تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولے۔

''اور شادی کے بعد اسے گھر میں ہی رکھ لیں گے۔'' کاظم نے کہا۔

''ظاہر ہے۔''

مکرم نے معظم کی طرف دیکھا۔ گڑیا کے سانولے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور لانبی گھنی
پلکوں والی آنکھیں جھک گئیں۔

''بے بی اور نو دی! تم دونوں بھی سیکھ لو کچھ کھانا پکانا۔ آخر معظم اور گڑیا ہنی مون منانے بھی
جائیں گے۔''

کاظم نے رائے دی۔ معظم نے کوئی تاثر نہ دیا۔

''تمہاری بیویاں کیا پلنگ توڑیں گی۔''

بے بی نے پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

''پلنگ......''

مکرم نے پہلی بار برآمدے میں نظر دوڑائی اور پھر ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا۔

''یہ سب......''

''اس خدا کی دین ہے بابا۔''

احسن نے ہانک لگائی اور کاظم نے تفصیل بتائی۔

بادل ہولے ہولے مسکراتا رہا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔

اس رات کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ دادی اماں نے تایا ابا، بابا اور تائی اما
سب کو یاد کیا۔ دادا کی باتیں سنائیں اور کھانے کے بعد ہم سب چہل قدمی کے لیے نکل گئے
الونی کی طرف جاتے ہوئے مدثر ہمیں مل گیا۔ بہت گرمجوشی سے ملا اور گھر چلنے کی دعوت دی
لین مکرم نے ٹال دیا تو وہ ناراض ہونے لگا۔ سو واپسی پر ہم سب اس کے گھر گئے۔

''ارے نو دی تم......''

جانے کہاں سے نوشین آ کر میرے گلے لگ گئی۔ نوشین نے میرے ساتھ ہی ایف۔ ایس سی کیا تھا۔ مجھے اسے دوبارہ دیکھ کر بے اندازہ خوشی ہوئی۔

"یہ میری بہن ہے نوشین اور یہ فرحین ہے۔"

مدثر نے تعارف کرایا۔

سب لوگ بہت اچھی طرح ملے، خوبصورت ڈائننگ روم میں بیٹھ کر ہم نے قہوہ پیا۔ شہ نے جو مدثر کا چھوٹا بھائی تھا۔ وی، سی، آر پر فلم لگا دی۔ بے بی کا بہت دل چاہ رہا تھا لیکن مکرم تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم واپس آ گئے۔

"اور لوگ کتنے کمینے ہوتے ہیں۔"

میں نے کوئی دسویں بار سوچا۔

"اور یہ مسز جبار، پتا نہیں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دولت کیوں دیتا ہے۔"

روتے روتے میری آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ مسز جبار نے آج بلاوجہ ہی میری انسلٹ دی تھی۔ بھئی اگر ان کے بچے نے ٹیسٹ میں اچھے نمبر نہیں لیے تھے تو اس میں میرا کیا قصور تھا آخر وہ بے چارے بھی کیا کریں۔ پتا نہیں کیا کچھ تو وہ ان کے دماغوں میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ آپ کی پروگریس ہے۔ یہ پڑھاتی ہیں آپ......"

انہوں نے کاپی میرے منہ پر دے ماری تھی۔

"دیکھیے...... مسز جبار! بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے کسی اور ٹیچر کا بندوبست کر لیں۔"

اور مسز جبار کی بک بک سنے بغیر میں وہاں سے واپس آ گئی تھی۔

"ایسی ذلت سے تو بہتر ہے کہ آدمی بھوکا مر جائے۔ دراصل اتنی دولت نے ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

سفیان نے مجھے بتایا تھا۔

"پتا ہے جب ڈھاکا فال ہوا تھا تو پاپا وہاں سے یہ صندوق بھر بھر کے نوٹ لائے تھے۔"

"تمہیں کیا پتا...... تم تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے ہو گے۔"

"مجھے جمی بھائی نے بتایا تھا۔"

"تمہارے پاپا کیا کرتے تھے وہاں؟"

"کسی بنک میں کلرک تھے۔ پر اب تو پاپا کا اتنا بزنس ہے کتنی تو مارکیٹیں ہیں ہماری۔"

تبھی تو مسز جبار کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ میں ٹیوشن تو غصے میں چھوڑ آئی تھی۔ لیکن اب ملال ہو رہا تھا تین چار ماہ سے کتنی سہولت ہو گئی تھی۔ ورنہ تو بسوں میں لٹک لٹک کر حلیہ خراب ہو گیا تھا اور میں نے پچھلے ماہ گڑیا کے لیے ایف۔ اے کی کتابیں خریدی تھیں اور اسے کہا تھا کہ وہ پرائیویٹ ہی ایف اے کرے اور پھر اگلے سال اسے کالج میں داخل کرا دیں گے، اور اس مسرت کی کوئی قیمت نہیں تھی، جو اس وقت گڑیا کی آنکھوں سے جھلکی تھی۔

"ارے تو کیا مسز جبار کے علاوہ دنیا میں کوئی اور نہیں ہے جہاں ٹیوشن پڑھائی جا سکے۔ اخبار میں روز ہی تو اشتہار آتے ہیں۔"

بے بی نے مجھے تسلی دی۔

"کل سے ذرا اخبار میں سے "ضرورت ہے" کے اشتہار دھیان سے دیکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

مجھے کچھ تسلی ہوئی اور میں نے منہ ہاتھ دھو کر چائے بنائی (گڑیا شاید پڑھ رہی تھی) اور وہیں کچن میں کھڑے کھڑے پینے لگی۔ تب ہی معظم بھی آ گیا۔

"چائے پی رہی ہو۔"

"ہاں......"

"اگر ہو تو ایک کپ مجھے بھی دے دو۔"

میں نے قہوہ گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"یونہی سر میں درد ہو رہا تھا۔"

"نہیں...... تم روئی ہو۔"

اس کی آنکھوں بلا کی تیز تھیں۔

"بھائی ٹیوشن ختم ہو گئی۔"

"اچھا ہوا۔ ویسے بھی وہ لوگ مجھے کچھ پسند نہ تھے۔"

"ویسے خود چھوڑا ہے یار......"

"خود چھوڑا ہے، مسز جبار کا رویہ بہت ہتک آمیز ہوتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے خیر تمہیں اگر کبھی پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لیا کرو۔"

"کیوں......تم کہیں کے بادشاہ ہو؟"

"مجھے ایک پرائیویٹ کمپنی میں بڑی اچھی جاب مل گئی ہے۔"

"کیا؟"

میرے ہاتھوں سے چمچ گر پڑا۔

"کیا تم نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔"

"نہیں......"

"کبھی کبھی کلاسز اٹینڈ کر لیا کروں گا۔"

"لیکن......لیکن عظمیٰ! اکرم کو پتا چلا تو وہ دکھی ہوں گے۔"

"ان کو کون بتائے گا۔"

اس نے لاپرواہی سے کہا اور چائے کا کپ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"لیکن عظمیٰ! اب تو چند ماہ ہی رہ گئے تھے پھر تم فارغ ہو جاتے۔"

"اور فارغ ہوتے ہی لوگ جابز (Jabs) طشتریوں میں سجا کر میرے پاس لے آتے۔ نودی بیگم! جو میں چاہتا ہوں وہ یہ ڈگری مجھے نہیں دے سکتی۔ بہت ہوا نا تو مجھے کسی کالج میں لیکچرر شپ مل جائے گی اور بس......"

"تو کیا ہوا معظم! یہ بھی ایک معزز پیشہ ہے اور پھر تم خود ہی تو کسی پروفیشنل میں نہیں گئے۔ جب تم نے ایف۔ ایس۔ سی کیا تھا۔ تب اکرم نے تم سے کہا تھا۔ کہ تم انجینئرنگ کے کسی شعبے میں چلے جاؤ لیکن تم نے خود ہی۔"

"ہاں میں نے خود ہی۔"

اس نے زیر لب کہا۔

"اس وقت میں آئیڈیلسٹ تھا۔ استاد بننا چاہتا تھا۔ معاشرے میں علم پھیلانا چاہتا تھا لیکن

اب......ساری بات یہ ہے۔"

اس نے خالی پیالی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کم سنی میں آدمی بڑے بڑے دعوے کرتا ہے۔ بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے لیکن وقت جب ان خوابوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے تو سارے دعوے اور سارے ارادے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ بچپن میں اس نے اپنے آپ سے کیا وعدہ کیا تھا۔"

"دراصل......"

اس نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔

"ایک بچے کا ذہن بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ سچا کھرا اور صاف ذہن۔ وہ دنیا کو اپنی معصوم نظر سے دیکھتا ہے اور خوبصورت باتیں سوچتا ہے۔ لیکن پھر یہ لوگ، یہ دنیا، یہ ماحول اور حالات سب مل کر اس کی اس خوبصورت سوچ کو زہر آلود کر دیتے ہیں۔ اس کے ذہن کی خوبصورت دنیا کو تاراج کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے خوابوں کے ملبے پر کھڑا ہو کر دنیا سے محبت کرنے کی باتیں نہیں سوچتا بلکہ اپنے سے محبت کرنے لگتا ہے، اپنے سے سوچتا ہے۔ میں بھی بچپن میں سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو کر اس ملک اور اس وطن کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔ مجھے دولت سے محبت نہیں تھی۔ ایک بچے کو کبھی دولت سے محبت نہیں ہوتی۔ وہ حسن سے، خوبصورتی سے سچائی سے محبت کرتا ہے۔ سنو نودی کل رات میں نے ایک نظم لکھی تھی۔"

"نظم......" بے بی اچھل کر کچن میں آ گئی۔

"ہائے عظمیٰ! تم شاعر ہو گئے ہو۔ دیکھوں تمہاری کوئی شکل تو نہیں بدلی۔" اس نے نیچے سے اوپر تک معظم کا جائزہ لیا۔

"اللہ......تم تو بالکل ویسے ہی ہو۔ عام سے بندے سچی میں سوچتی تھی یہ شاعر لوگ ہم سے کچھ مختلف ہوتے ہوں گے۔"

"ہاں......شاید ان کے سر پر سینگ ہوتے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"رئیلی......نودی۔"

بے بی نے آنکھیں چمکائیں۔

"عظمیٰ نے تو بھی اسٹارٹ کیا ہے نا لکھنا۔ سینگ تو بڑے شاعروں کے ہوتے ہوں گے۔"

میں نے معصومیت سے کہا اور پھر معظم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں...... تو معظم سناؤ سناؤ۔ کیا لکھا تھا تم نے؟"

"ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ ابھی مکمل نہیں ہوئی۔"

"اچھا جتنی لکھی ہے، اتنی ہی سنا دو۔"

"پھر سہی، مکمل ہو جائے تو......"

معظم نے انکار کیا۔

"پلیز...... مجھے بہت اشتیاق ہو رہا تھا۔

کبھی کم سنی میں

وطن کی محبت سے سرشار ہو کر

یہ دعویٰ کیا تھا

کہ زندہ رہا تو

میں خاکِ وطن کا ہر اک ذرہ چمکا کے روشن کروں گا

میں مانگ وطن میں اجالے بھروں گا

"واہ......" بے بی نے بے اختیار داد دی۔

کبھی زندگی میں یہ دعویٰ کیا تھا

کہ جب بھی وطن کو ضرورت پڑے گی

میں اپنے لہو کے چراغوں سے اندھیروں کو گھائل کروں گا۔

میں اپنی وفا کے گلابوں کو اس طور مہکاؤں گا

کہ پھر مشک و عنبر بھی اس مہک کو آ کے سجدے کرے گی

کبھی زندگی میں......"

"واہ......واہ...... یہاں تو محفل مشاعرہ جمی ہے۔"

کاظم نہ جانے کب کچن کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ میں معظم کی آواز کے سحر میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔

"ارے...... چائے کی خوشبو بھی ہے۔"

کاظم کی ناک بہت تیز تھی۔

"میں نے صرف اپنے لیے چائے بنائی تھی۔"

"ہاں...... یہ انتہائی خود غرض لڑکی ہے۔"

بے بی نے کہا۔

"لیکن ابھی چائے کا وقت نہیں تھا۔ ہاں تم لوگ پینا چاہو تو بنا لیتی ہوں۔"

"بنا ہی لو۔" بے بی نے کہا۔

"احسن بھی غالباً جاگ گیا ہے اور بادل بھی بہت دیر سے پڑھ رہا ہے۔ تھک گیا ہو گا۔"

"اچھا...... تم لوگ چلو میں چائے لاتی ہوں۔ معظم تم اور چائے پیو گے۔"

"ہاں......"

معظم اور کاظم باہر چلے گئے۔

"معظم اچھا شاعر بن سکتا ہے۔"

چائے بناتے ہوئے میں نے بے بسی سے کہا۔

"نظم اچھی ہے نا......"

"ہاں...... لیکن کاظم کے آ جانے سے پوری نہ سن سکے۔ لیکن نو دی میں نے سنا ہے یہ جو شاعر لوگ ہوتے ہیں یہ تو کسی کام کے نہیں ہوتے نکمے ہوتے ہیں۔"

"وہ پرانے زمانے کے شاعر ہوتے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ معظم نکما نہیں ہے۔"

"نہیں......" میں ہنس دی۔

بے بی کبھی کبھی بالکل بچوں جیسی باتیں کرتی تھی۔

اور جب میں چائے بنا کر باہر نکلی تو نہ صرف وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے بلکہ مدثر بھی تھا۔

"بے بی ذرا نمکو اور بسکٹ بھی لے آنا۔"

میں نے مڑ کر بے بی سے کہا اور خود چائے والی ٹرے اٹھائے ان کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے

دیکھتے ہی احسن نے زور سے میز پر مکہ مارا۔

''مدثر بھائی آخر آپ مان کیوں نہیں لیتے کہ خواتین مردوں سے زیادہ جھوٹ بولتی ہیں۔''

''ہاں......مدثر بھائی خواتین بڑی صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں۔ آنکھیں مٹکا کر، ہاتھ ہلا کر اتنی معصومیت سے جھوٹ بولیں گی کہ آپ لاکھ آنکھیں مل مل کر چشمہ لگا لگا کر دیکھیں لیکن وہاں ایسی معصومیت اور سچائی نظر آئے گی آپ کو کہ یقین کرنا ہی پڑے گا۔''

''مرد بھی کچھ کم جھوٹ نہیں بولتے۔''

''میں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''مرد عموماً ضرورتاً جھوٹ بولتے ہیں اور خواتین بلاضرورت بھی جھوٹ بولتی ہیں۔ کپڑے خریدنے جائیں گی تو کہیں گی جی...... یہ ابھی دو دن پہلے تو ہم نے پچھلی دکان سے دس روپے خریدا تھا آپ......''

''لیکن مسئلہ کیا ہے۔ میرے بھائی یہ خواتین کے خلاف محاذ کیوں بنایا جا رہا ہے۔''

بے بی نے نمکو اور بسکٹ میز پر رکھے۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔''

احسن نے بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''دراصل ہم ذرا جھوٹ کی اوسط معلوم کر رہے تھے کہ دن بھر میں اوسطاً کتنا جھوٹ بولا جاتا ہے اور اس میں کتنے فیصد مرد جھوٹ بولتے ہیں اور کتنے فیصد خواتین۔''

''مرد کے جھوٹ کی پیمائش کرنی ہے تو اسے کسی خاتون کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سننا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔''

بے بی نے پتے کی بات کہی۔

''البتہ احسن نذر عرف ٹیپو سلطان یہ بحث غالباً آپ نے ہی شروع کی ہوگی۔''

''ظاہر ہے۔''

اس نے اکڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے پہلے ہی امید تھی کہ اتنی فضول بے کار اور بور بحث کا آغاز تمہارے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔''

احسن کا منہ لٹک گیا۔ مدثر ہولے ہولے مسکرا رہا تھا لیکن معظم یوں بیٹھا تھا جیسے وہ اپنے ارد گرد ہونے والی گفتگو سے بالکل بے خبر ہو۔ کچھ سوچتا ہوا گم سا کھویا ہوا۔

چائے کی پیالی مدثر کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مدثر مسلسل مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور کم گو تھا۔ جتنی بار بھی وہ ہمارے ہاں آیا تھا۔

اس نے بہت کم باتیں کی تھیں۔ زیادہ تر سب کی گفتگو سنتا رہتا اور کبھی کبھی مسکرا دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک حزن تھا۔ ایک تھکن سی تھی اور جب وہ مجھے دیکھتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔ پوچھ رہی ہیں کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ کیا ستا لوں؟ اس کی آنکھیں باتیں کرتی تھیں۔ مگر لب خاموش رہتے تھے۔ میرے دل میں اس کے لیے ایک گداز گوشہ تھا۔ کہ محض اپنی ماں بہنوں اور بھائیوں کو اچھی زندگی دینے کی خواہش میں وطن سے اپنوں سے اتنی دور تنہائی کا عذاب سہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں زیادہ دیر اس کی ان سوال کرتی آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔

''بے بی! تم باقی کو چائے بنا کر دو میں دادی اماں اور گڑیا کو چائے دے آؤں۔''

اور سب کو وہاں ہی بیٹھا چھوڑ کر میں پھر کچن میں چلی گئی۔

● ○ ●

میں نے پھر ٹیوشن کر لی تھی۔ ٹیوشن پرکشش تھی۔ ایک ہزار روپے ماہوار اور صرف ایک بچے کو دو گھنٹے پڑھانا تھا بچہ چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا لیکن اس میں ایک مسئلہ تھا کہ گھر سے بہت دور تھا لیکن کالج سے نزدیک تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کالج سے سیدھی بچے کو ٹیوشن پڑھانے چلی جایا کروں گی۔ میں نے اور بے بی نے مسلسل دو ہفتے تک فری پریڈ میں لائبریری میں بیٹھ کر وہاں موجود تمام اخباروں میں ''ضرورت ہے'' کے اشتہار دیکھے تھے۔ تب کہیں جا کر یہ قابل قبول ٹیوشن نظر آئی تھی اور اسے محض اتنی سی بات پر رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شروع میں دو تین دن تو بے بی بھی میرے ساتھ گئی لیکن پھر اس نے صاف انکار کر دیا۔ دراصل اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ پانچ بجے تک بھوکی نہیں رہ سکتی تھی۔ بچہ بہت پیارا اور سلجھا ہوا تھا اور مسز نعیم بھی بہت خوش اخلاق اور اچھے مزاج کی تھیں۔ پہلے دن ہی انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے دے

دیئے تھے اور اگلے ہی دن میں نے اور بے بی نے گڑیا، دادی اماں، بے بی اور اپنے لیے لان کے دو دو سوٹ خرید لیے تھے۔

یہ زبردست عیاشی تھی اور بے بی کا خیال تھا کہ فی الحال صرف ایک ایک سوٹ خریدا جائے گا اور اگلے ماہ ایک خرید لیا جائے لیکن میں اس وقت بادشاہ بنی ہوئی تھی۔ ورنہ صرف ٹیوشن والے ہزار روپے بلکہ پرس میں پہلے سے پڑے ہوئے اسی روپے بھی خرچ ہو گئے تھے۔ مجھے ٹیوشن پڑھاتے ہوئے تقریباً پندرہ دن ہو گئے تھے۔

اس روز آخری پیریڈ خالی تھا سو میں وقت سے کچھ پہلے ہی نکل آئی تھی۔ سوچا تھا چلو کچھ دیر پہلے فارغ ہو جاؤں گی۔ یوں بھی مسز نعیم بہت مہربان تھیں۔ بڑے سے گیٹ سے جب میں اندر داخل ہوئی تو سناٹے کا احساس ہوا مگر میں نے کچھ محسوس نہیں کیا یوں بھی مسز نعیم کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اور گھر میں عموماً سناٹا ہی ہوتا تھا۔

میں سیدھی اندر بڑھتی گئی۔ کوریڈور میں ایک لمحے کے لیے رک کر میں نے سانس درست کی، تب ہی مسز نعیم کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور نعیم صاحب باہر آتے نظر آئے۔ اس سے قبل ایک دو بار میں نے انہیں دیکھا تھا۔ سو انہیں سلام کرتے ہوئے میں نے عرفی کا پوچھا۔

''آپ چلیں پلیز عرفی بھی اندر ہی ہے۔''

انہوں نے اپنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔

''جی...... مگر آپ انہیں ادھر ہی بھیج دیں۔''

''عموماً ہم اسٹڈی میں پڑھا کرتے تھے۔''

''آج گرمی بہت ہے اور ادھر اے سی نہیں ہے۔''

''اچھا......''

میں نے بے دھیانی میں قدم آگے بڑھایا۔ نعیم صاحب میرے پیچھے تھے۔

''اوہ بے بی صاحب آپ کب آیا؟''

پٹھان چوکیدار غیبی مدد بن کر آیا۔

''مجھے خبر ہی نہیں ہوئی میں ذرا دیر کے لیے ادھر اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ بیگم صاحب نے بولا تھا۔ آپ کو بتا دوں کہ ایک ہفتہ آپ عرفی بابا کو پڑھانے نہ آئیں۔ وہ اور عرفی بابا لاہور چلے

گئے ہیں۔ ان کے بھائی آئے ہیں امریکہ سے دس سال بعد۔''

''پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے سنا ہی نہیں میرا ذہن تو سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ عرفی یہاں نہیں تھا پھر...... پھر میں نے مڑ کر نعیم صاحب کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی جیسے شکار ہاتھوں سے آ کر نکل جائے۔

''شکریہ...... خان بابا۔''

میں تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

جانے میری کون سی نیکی کام آ گئی تھی اور معظم نے کہا تھا چہروں پر نہیں لکھا ہوتا کہ کون کیسا ہے اور بس سٹاپ پر جنگلے سے ٹیک لگائے ہوئے میں نے سوچا۔

کیسے اجلے چہروں کے پیچھے من کے کالے لوگ ہوتے ہیں اور جب میں بس میں لٹک کر گھر پہنچی تو میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں یا اللہ میری ان مخلصانہ کوششوں کی راہ میں بار بار پتھر کیوں آ کھڑے تھے۔ کمرے میں آتے ہی میں دھپ سے بستر پر گر پڑی۔

''کیا ہوا؟ چھٹی ہو گئی؟''

بے بی نے جو آنکھوں پر ہاتھ دھرے بظاہر سو رہی تھی۔ یونہی آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

میں چپ رہی، میرا دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

''کھانا لاؤں نو دی!''

گڑیا نے جو کتابیں بکھیرے پڑھ رہی تھی پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''کیا ہوا؟ بکو نا؟''

بے بی اٹھ بیٹھی اور میرے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

''ہشت!'' بے بی اچھل کر میرے بستر پر آ گئی۔

''ذرا آہستہ دادی اماں جاگ جائیں گی۔''

''بے بی...... بے بی یہ دنیا بڑی کمینی ہے۔''

میں اور زور سے رونے لگی۔ گڑیا بھی اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی۔ بڑی دیر بعد جب میرے

آنسو تھمے اور میں نے ساری بات بے بی کو بتائی تو اس نے دس ہزار بار نعیم صاحب پر لعنت بھیجی اور فیصلہ یہ ہوا کہ مسز نعیم کے آنے پر فون پر ان سے معذرت کر لی جائے اور آدھے مہینے کی ٹیوشن مبلغ پانچ سو روپے انہیں بذریعہ ڈاک بھیج دیئے جائیں۔

''لیکن یہ مبلغ پانچ سو روپے کہاں سے آئیں گے بی بی؟''

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو ہم نے سوٹ لے لیے تھے۔''

''سوٹ فروخت کر دیتے ہیں۔''

بے بی نے رائے دی۔

''لیکن وہ سوٹ تو سل گئے تھے۔''

مگر تین سوٹ تو ابھی نہیں سلے تھے۔

''وہ...... میں نے کاٹ لیے تھے۔ سوچا تھا چھٹی والے دن تم لوگ کچن سنبھالنا۔ میں سی دوں گی۔''

گڑیا ہم تینوں کے کپڑے خود ہی سی لیا کرتی تھی۔

''پھر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے بے بی کی طرف دیکھا۔

''دادی جان کے بیس تولے کے کڑے۔''

بے بی کی نظر ہمیشہ دادی جان کے کڑوں پر رہتی تھی۔ جنہیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ دراصل یہ کڑے انہوں نے ہماری شادیوں کے لیے سنبھال رکھے تھے۔

''میرے پاس ہوں گے۔ مکرم گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے دیتے ہیں نا اس میں سے کچھ بچت کی تھی۔''

گڑیا ہر مشکل وقت میں کام آتی تھی۔

''تھینک یو گڑیا! میں بہت جلد تمہیں یہ رقم لوٹا دوں گی۔''

''بھئی...... تم ٹیوشن کے پیسوں سے سوٹ نہ لاتیں تب بھی گرمیوں کے کپڑے تو آنے تھے نا۔''

''پھر بھی میں کوئی نوکری یا کوئی ٹیوشن ملتے ہی......''

''بس......'' بے بی نے میری بات کاٹ دی۔

''یعنی ابھی تمہیں سبق حاصل نہیں ہوا۔''

''اب کچھ اور سوچیں گے کوئی اور طریقہ۔''

''بے بی!'' معظم نے دروازے سے جھانکا۔

''اگر ممکن ہو تو ایک کپ چائے بنا دو سر میں درد ہو رہا ہے۔''

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا عظمی؟''

میں اپنی پریشانی بھول گئی۔

''اور تم آج جلدی آ گئے ہو، کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا......''

''میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔''

وہ میرے بیڈ پر ہی آ کر بیٹھ گیا۔ گڑیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم بیٹھو بے بی! میں چائے بنا لاتی ہوں۔''

''جاب چھوڑ دی۔ چلو اچھا ہوا۔ کم از کم پڑھائی کی طرف پوری توجہ دے سکو گے لیکن بھائی چھوڑی کیوں؟''

''نو دی!'' وہ ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

''یہ دنیا بڑی کمینی ہے۔''

''اور ابھی کچھ دیر پہلے یہی بات نو دی کہہ رہی تھی۔''

بے بی نے میرے پرس میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نو دی صحیح کہتی ہے۔''

معظم نے آہستگی سے کہا۔

''یہ دنیا واقعی بڑی کمینی ہے، وہ لوگ فراڈ تھے۔ دھوکہ باز تھے۔ جعلی مال تیار کرتے تھے۔ گھٹیا میٹریل استعمال کرتے تھے اور اس پر دوسری کمپنیوں کے نام لکھ دیتے تھے ایک تو عوام کو دھوکا دوسرا ان کمپنیوں کو دھوکا۔ میں ایسے فراڈ لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا تھا۔ سو میں نے جاب چھوڑ دی اور جب میں نے اس ناٹے قد والے منیجر کو جاب چھوڑنے کی وجہ بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ یوں جیسے

میرا دماغ خراب ہو یا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ نودی!"

معظم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کہ آج سے دس سال بعد بھی اگر تمہاری سوچ یہی ہوئی تو میں تمہیں خراج تحسین پیش کروں گا اور میں نے اسی وقت عہد کر لیا تھا کہ دس سال بعد اگر زندہ رہا تو اس دفتر میں ضرور جاؤں گا اور اپنی بات دہراؤں گا۔"

"چھوڑو اسے عظمی۔"

میں نے اسے دلاسا دیا۔

"یہ جو دنیا ہے نا یہاں ہر طرح کے لوگ ہیں اچھے اور برے دھوکے باز اور ایماندار، نیک اور بد۔ اس لیے اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر یہاں برے لوگ ہیں تو اچھے بھی ضرور ہوں گے۔ اور تمہیں اچھے لوگ بھی ملیں گے تم نے اچھا کیا۔ وہ جاب چھوڑ دی۔ شاید کل کو تمہیں اس سے بھی اچھی جاب مل جائے۔" میں جو ابھی کچھ دیر پہلے خود بہت مایوس اور ڈیپریس ہو رہی تھی۔ سب کچھ بھول کر اب اسے تسلی دے رہی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

گڑیا چائے بنا کر لے آئی۔

"مدثر تو نہیں آیا تھا؟"

چائے لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آئے تھے۔"

گڑیا نے آہستگی سے کہا۔

"اور تم نے وہ لفافہ دے دیا تھا۔ میرے کاغذات والا۔"

"جی......"

بے بی جو میرے پرس میں سے ایک چیونگم تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب مسلسل جگالی کر رہی تھی۔ ایک دم اس کے ہلتے جبڑے رک گئے۔

"کیا تم سچ مچ باہر چلے جاؤ گے عظمی؟"

"ہاں...... اگر ممکن ہوا تو مدثر نے وعدہ تو کیا ہے۔"

"لیکن پھر ہم سب کا کیا ہوگا؟"

اس نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"تم سب عیش کرنا۔ خوبصورت سا گھر بنوانا۔ گاڑی رکھنا۔"

"مگر ہمیں تو ان سب کی ضرورت نہیں ہے عظمی! اور ہم تو اس گھر میں بھی بڑے ٹھیک ٹھاک ہیں اور پھر کیا پتا تم وہاں باہر جا کر گرین کارڈ کے چکر میں شادی رچا لو اور گڑیا! اس کا کیا ہوگا۔"

"گڑیا!" اس نے نگاہیں اٹھا کر گڑیا کو دیکھا۔ جس کے سانولے رخساروں پر شفق دوڑنے لگی تھی اور لانبی گھنی سیاہ پلکیں جھک گئی تھیں۔ وہ خالی پیالیاں باہر رکھنے کے بہانے چلی گئی تو معظم نے سوالیہ نظروں سے بے بی کو دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابا میاں! یہ خواہ مخواہ کا بوجھ ہمارے کندھوں پر کیوں ڈال گئے۔ کیا ان کو وہاں ہی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ پتا نہیں ان کا اس زمین سے کوئی ناتا ہے بھی یا نہیں۔"

"بھائی!" بے بی نے آنکھیں پھیلائیں۔

"گڑیا اور بادل بچپن سے اسی گھر کے فرد رہے ہیں اور ہم نے انہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔"

"مگر میں نے گڑیا کے لیے کبھی نہیں سوچا۔"

اس نے کندھے اچکائے۔

"مگر دادی اماں کہتی ہیں تم اور گڑیا......"

بے بی نے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میں نے پہلی بار تشویش سے سوچا کہ معظم نے اگر سچ مچ گڑیا سے بیاہ نہ کیا تو......

اور بے بی نے جیسے میری سوچ پڑھ لی۔

"کاظم اور احسن بھی تو ہیں نا۔ بہر حال گڑیا ہماری ہے۔"

اور میں نے شکر کیا کہ گڑیا چلی گئی تھی ورنہ وہ پاگل تو رو رو کر برا حال کر لیتی۔

ہم دونوں میں اور معظم اپنی اپنی کوششوں میں ناکام رہے تھے۔ معظم کا تو مجھے علم نہیں تھا۔ لیکن میں ایک بار پھر "ضرورت ہے" کے کالم دیکھنے لگی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی قابل قبول ٹیوشن نظر نہیں آئی تھی۔ ایک دو پرائیویٹ سکولوں کے یا ٹیوشن سینٹرز کے اشتہار نظر آئے تھے لیکن ہم نے انہیں رد کر دیا تھا۔

آخر تنگ آ کر ایک روز میں نے ایک پرائیویٹ سکول میں درخواست بھیج دی۔ اس سکول میں دو شفٹیں تھیں میں نے دوسری کے لیے درخواست بھیجی تھی جو دو بجے سے پانچ بجے تک تھی۔ ہم دو بجے کالج سے فارغ ہو جاتے تھے کبھی کبھار جب پریکٹیکل ہوتا تو دیر ہو جاتی تھی بہر حال جاب مل گئی تو اسے مس کیا جا سکتا تھا۔

درخواست بھیجنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ میں نے آخری پیریڈ چھوڑ دیا تھا اور اسی روز بے بی کو فلو ہو رہا تھا اور وہ کالج نہیں آئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے میں نے سوچا چھوڑو اکیلی نہ جاؤں لیکن پھر ہمت کر لی۔ اور سوچا وہاں اور لڑکیاں بھی تو ہوں گی۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی یہ دیکھ کر تقویت ہوئی کہ شام کی کلاسز میں پڑھنے والے بچے وہاں موجود تھے اور اِدھر اُدھر گراؤنڈ میں گھوم رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی نے مجھے اندر بلا لیا۔ بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا منحنی سا شخص بڑا عجیب لگ رہا تھا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی باریک تھی کہ اگر میری جگہ بے بی ہوتی تو قہقہہ لگا کر ہنس دیتی۔ مگر میں نے اپنی ہنسی روک لی۔

''آپ کو نویں دسویں کے بچوں کو پڑھانا ہو گا۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو۔ لڑکوں کو پڑھا لیں گی آپ، دراصل ہمارے پاس سائنس ٹیچر نہیں ہے اس وقت جب بندوبست ہو گیا تو صرف لڑکیوں کو پڑھایئے گا مگر فی الحال......''

''پڑھا لوں گی۔''

''کوئی چھٹی نہیں ملے گی۔ اگر چھٹی کی تو تنخواہ کٹ جائے گی۔''

''مگر تنخواہ ہو گی کتنی؟''

''چار سو روپے۔''

''جی......'' میں اچھل پڑی۔

''صرف چار سو۔''

''وہ بھی اس لیے کہ آپ سائنس ٹیچر ہیں ورنہ ہم تو تین سو دیتے ہیں۔''

''سوری......''

میں کھڑی ہو گئی اور سوچا۔

''اتنا تو میرا مہینہ بھر کا کرایہ لگ جائے گا گھر سے یہاں آنے تک۔''

''سوچ لیں آپ کے پاس کوئی ٹریننگ نہیں ہے خود ابھی آپ پڑھ رہی ہیں۔''

''جی سوچ لوں گی۔''

میں اندر ہی اندر غصے میں کھولتی ہوئی باہر چلی آئی۔

توبہ یہاں لوگ لوگوں کا کس قدر استحصال کرتے ہیں۔ اور یہ کتنا ظلم ہے۔

ایک تو مایوسی غصہ اس پر تیز دھوپ میں سٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار بہت مشکل تھا۔ مگر پھر بھی میں انتہائی ضبط سے پورے ایک گھنٹے سے کھڑی تھی۔ میرے روٹ کی صرف دو بسیں آئی تھیں اور ان میں لوگ لٹکے ہوئے تھے کھڑے کھڑے میرے پاؤں دکھنے لگے تھے لیکن بس کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ جانے ابھی کتنی دیر اور کھڑا رہنا تھا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ بس سٹاپ پر میرے علاوہ دو بوڑھے تین خواتین اور کچھ بچے تھے۔ ابھی میں ان کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ایک سیاہ گاڑی قریب آ کر رکی اور مدثر نے کھڑکی میں سے جھانکا۔

''خوشنود......''

''جی......''

میں نے چونک کر دیکھا۔

''آپ کب سے کھڑی ہیں؟''

''بہت دیر سے۔''

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

''چلیں۔''

''مگر......''

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''تکلف نہ کریں خوشنود! میں گھر ہی جا رہا ہوں۔''

وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

''پلیز......''

اس نے اشارہ کیا۔

اور میں کچھ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔

شاید میں عام حالات میں اس کی یہ پیشکش قبول نہ بھی کرتی لیکن اس وقت گرمی غصے اور تھکن سے برا حال ہو رہا تھا اور یوں بھی میں نے سوچا مدثر مکرم کا دوست ہے پڑوسی ہے، نوشین کا بھائی ہے، ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

''آپ آج اکیلی۔ بے بی کہاں ہے؟''

''اسے فلو تھا۔''

''آپ کا کالج یہاں سے قریب ہے۔''

''نہیں...... میں یہاں انٹرویو دینے آئی تھی۔''

اے سی کی ٹھنڈک میں سکون کا سانس لیتے ہوئے میں نے تفصیل بتا دی۔

''ہمارے ہاں تعلیم بھی تجارت بن گئی ہے۔ ہم نے علم کو بھی کاروبار بنا لیا ہے۔''

مدثر کی آواز میں دکھ سا تھا۔

''ہم جو ہر چیز کو سود و زیاں کے پیمانے میں تولتے ہیں کاش تعلیم کو تجارت نہ بناتے اور اس طرح لوگوں کی مجبوریوں کا سودا نہ کرتے تین سو روپے ماہوار پانے والے استاد بچوں کو کیا علم دیتے ہوں گے۔ ان کی مجبوریاں۔''

مدثر نے طویل بات کی مگر میرا دھیان اچانک ہی معظم کی طرف چلا گیا تھا۔

''آپ شاید بور ہو رہی ہیں۔''

''نہیں تو۔'' میں شرمندہ ہو گئی۔

''آپ کچھ سوچ رہی تھیں۔''

''ہاں میں معظم کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ وہاں جا کر اسے وہاں بلانے کے لیے کوشش کریں گے۔''

''ہاں......''

''تو کیا آپ اسے بلا سکتے ہیں۔''

''کوشش کروں گا۔''

''پلیز...... آپ کوشش نہ کیجیے گا۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''پتا نہیں...... میں نہیں چاہتی کہ عظمی جائے۔ مگر پتا نہیں کیوں اس کے سر میں یہ سودا سما گیا ہے۔''

''وہ تم سب کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔''

''لیکن ہم سب تو بہت مطمئن ہیں اور ہمیں مزید کی ہوس بھی نہیں ہے۔ پھر پتا نہیں، وہ ایسا کیوں سوچتا ہے۔ جبکہ مجھے ڈر لگتا ہے، جیسے وہ چلا گیا تو ہماری مالا کے موتی بکھر جائیں گے۔ پلیز آپ اسے سمجھائیں کہ وہ یہاں ہی پاکستان میں رہ کر کچھ کر لے۔''

''اچھا......''

مدثر نے کہا اور باقی وقت خاموشی میں گزرا مدثر ڈرائیو کرتا رہا اور میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اور جب مدثر نے گاڑی گیٹ کے سامنے روکی تو عین اسی وقت مکرم باہر نکلے۔

مکرم کی نگاہیں مجھ سے ملیں۔ ان کی آنکھوں میں کیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتی لیکن مجھے یک دم ادراک ہوا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے، مجھے مدثر کے ساتھ اس طرح اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ خواہ کھڑے کھڑے رات ہی کیوں نہ ہو جاتی۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اتری اور میرے ساتھ ہی مدثر بھی۔ میں وہاں رک کر مکرم کو بتانا چاہتی تھی کہ میں مدثر کے ساتھ کیوں ہوں اور یہ کہ کبھی کبھی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، وہ سب سچ نہیں ہوتا۔ مگر مکرم مدثر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے میں ایک لمحہ رک کر اندر چلی آئی۔ میری آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ میں اندر آتے ہی بستر پر گر پڑی۔ میں رونا چاہتی تھی لیکن روئی نہیں۔

کمرے میں گڑیا، دادی ماں اور بے بی تینوں ہی تھے۔ میں نے تکیہ آنکھوں پر رکھتے ہوئے سوچا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی مکرم نے کیا سوچا ہو گا۔ اگرچہ مکرم سے کبھی کوئی اس طرح کی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن خود بخود ہی میرے دل کو ادراک ہو گیا تھا کہ مکرم میرے ہیں اور شاید مکرم کو بھی یہ آگہی تھی کبھی کبھی میری طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھتے تھے۔ اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آجاتی تھی۔ کئی بار میں نے چپکے چپکے انہیں اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔

دادی اماں اٹھ کر باہر گئیں تو میں نے تکیہ آنکھوں سے ہٹا کر بے بی کو آواز دی۔ جو چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سوں سوں کی آواز آرہی تھی۔

"کیا ہے؟"

بے بی نے چادر میں منہ گھسیڑے کہا۔

"مجھے تیری آمد کے انداز سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ نوکری نہیں ملی۔"

"نوکری تو مل گئی تھی لیکن تنخواہ صرف تین سو روپے تھی۔"

"لعنت بھیجو۔"

"وہ تو میں نے اسی وقت بھیج دی تھی لیکن ایک اور بات ہے۔"

میرے دل پر بہت بوجھ تھا اور میں یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

"اوہ بھئی کیا ہے۔"

بے بی اٹھ کر میرے بستر پر آ گئی اور میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

"تو کیا ہوا؟ اب دھوپ میں سڑتی رہتیں وہاں۔"

بے بی زیادہ گہرائی میں نہیں جاتی تھی۔

"اور مکرم! برا نہیں مانیں گے۔ الٹا انہوں نے مدثر کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔"

لیکن بے بی کے تسلی دینے کے باوجود میرا دل بجھا بجھا سا رہا اور میں آنکھیں موندے بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی رہی۔ حتیٰ کہ مغرب ہو گئی اور گڑیا نے آ کر کہا۔

"دادی اماں کہہ رہی ہیں اٹھ جاؤ۔"

دادی جان کو مغرب کے وقت لیٹنا سخت ناپسند تھا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟"

میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں۔ میں چائے لا رہی ہوں۔ تم بھی اُدھر ہی آ جاؤ۔"

"اچھا......"

میں منہ ہاتھ دھو کر اندر آئی۔ حسب معمول سب دری پر بیٹھے تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ دادی جان پاکستان بننے سے پہلے کی کہانی سنا رہی تھیں۔ وہی کئی بار کی سنی ہوئی باتیں۔ اشتیاق سے سن رہے تھے۔

"ہجرت کے دکھ وہی جانتا ہے۔ جس نے ہجرت کی ہو اور ہمیں تو دو بار ہجرت کرنا پڑی

پہلی ہجرت میں گھر بار لٹا۔ بہن بھائی جدا ہوئے، جہاں پیدا ہوئے تھے، جہاں جنم لیا تھا۔ وہ زمین چھوٹ گئی اور دوسری ہجرت نے گھر بار ہی نہیں جگر کے ٹکڑے بھی چھین لیے۔"

دادی جان افسردہ ہو گئی تھیں۔ شاید انہیں بابا اور تایا یاد آ رہے تھے۔

"دراصل آدم کے وجود میں آتے ہی ہجرت کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ پہلی ہجرت حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ آسمان سے زمین کی طرف۔

کاظم نے چائے پرچ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ ہمیشہ چائے پرچ میں ڈال کر پیتا تھا۔ جیسے اسے کہیں جانے کی جلدی ہو۔

"دراصل ہجرت بنی نوع انسان کا پہلا Nostalgialt ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک طرح کی Home Sickness یوں سمجھ لو اس زمین نے حضرت آدم علیہ السلام کو بلوایا تھا پکارا تھا۔ اپنی زمین کی کشش۔"

پتا نہیں مدثر کیا کیا کہہ رہے تھے لیکن میں شاید کچھ سن نہیں رہی تھی اور اگر سن رہی تھی تو سمجھ نہیں رہی تھی۔ میری نگاہیں بار بار مکرم کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ لیکن وہ بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے اور ان کی آنکھوں سے کسی قسم کا کوئی تاثر ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

پتا نہیں مکرم نے کیا سوچا ہوگا۔

پتا نہیں ان کے دل میں کیا خیال آیا ہوگا۔

کاش! میں جان سکتی۔

کاش مجھے علم ہوتا۔

لیکن دلوں کا حال چہروں پر رقم نہیں ہوتا۔ مکرم کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ایک دو بار میری نظریں مکرم سے ملیں لیکن ان نظروں نے مجھے کوئی پیام نہ دیا۔ نہ ناراضگی نہ غصہ کچھ بھی نہیں۔

یا اللہ...... یا اللہ میں کیا کروں۔ کس طرح اس شخص کے دل میں اتر کر دیکھوں۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور چونکہ میں قدرے پیچھے اور اندھیرے میں تھی، اس لیے کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ مجھے خبر تک نہ ہوئی کہ کب مدثر اٹھ کر چلا گیا تھا اور کب گڑیا اور چائے بنا کر لائی تھی۔

"یہ مدثر بڑا ذہین آدمی ہے۔"

کاظم نے تبصرہ کیا۔

"مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ یہ اتنا پڑھا لکھا اتنا عالم شخص ہو گا۔ اس نے انگلش میں لٹریچر میں ایم اے کیا ہے۔ لاء بھی کیا ہے اور......"

"مگر بھائی!"

بے بی نے جو حسب معمول مکرم کے پاس بیٹھی تھی۔ ان کا ہاتھ ہلایا۔

"یہ اتنے انٹلیکچوئل ہیں تو وہاں امریکہ میں ٹیکسی کیوں چلاتے ہیں۔"

"ٹیکسی کیوں چلاتے ہیں؟"

احسن نے اس کا منہ چڑایا۔

"ہمیشہ احمقوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ بھئی دانشوری پیسہ نہیں دیتی۔ ٹیکسی ڈالر دیتی ہے مائی سسٹر! زندگی کی چکی میں انٹلیکچوئل اور غیر انٹلیکچوئل کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ بے بی! زندگی سب سے ایک جیسا سلوک کرتی ہے۔"

مکرم نے نرمی سے کہا۔

"خیر سب سے تو ایک جیسا نہیں کسی کو ٹھوکروں پر رکھ لیتی ہے اور کسی کو سر پر اٹھا لیتی ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے کھڑکی کے پاس معظم کھڑا باہر اندھیرے میں جھانک ر تھا۔

"یہ شخص مدثر بڑا آئیڈیالسٹک ہوتا تھا۔"

مکرم نے معظم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"شروع شروع میں جب مجھے ملا تھا تو بڑی خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ دنیا کو بدل د کی، وطن کے لیے، اہل وطن کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اس کے اندر بہت تھا۔ اس کے اندر ٹیلنٹ تھا مگر یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اپنے ٹیلنٹڈ لوگوں کو غیروں کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہ المیہ ہے۔ اس کے پاس بڑے بڑے منصوبے تھے بڑے پلان تھے۔ مگر ان پر عمل کرنا ایک خواب تھا۔"

"ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ آئیڈیالسٹک ہوتا ہے۔ مدثر کی طرح اور میری طرح" مع نے کھڑکی کا پردہ آگے کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

"ہاں......" مکرم کے بجھے لہجے میں افسردگی گھل گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو اور تم اپنی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ عظمی! تمہارے اندر بہت ٹیلنٹ ہے میری جان! اب بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنے آپ کو کھوج لو یہ تمہاری منزل نہیں ہے میں جانتا ہوں۔ تم نے بغیر سوچے سمجھے اس مضمون میں ایڈمیشن لے لیا ہے، جبکہ تم......"

"جبکہ میں......"

معظم نے مکرم کی بات کاٹ دی۔

"میں بھی مدثر کی طرح آئیڈیالسٹک تھا اور وطن اور اہل وطن کے لیے کچھ کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ مگر اب جان گیا ہوں کہ......

زندگی میں کوئی دعویٰ بھی حرف آخر نہیں ہے
لطافت خیالوں کی بس ایک تخیل
ادھورا سا سپنا
ذرا آنکھ کھولو تو یوں ٹوٹ جائے
کہ جیسے کوئی کانچ کا آبگینہ۔"

معظم ہولے ہولے ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا اور سب ساکت سن رہے تھے۔

میرا آبگینہ بھی اک ٹھیس سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو
تخیل کی ہر رو
کسی اور ہی سمت بہنے لگی
تبھی میں نے سوچا
میں مانگ وطن میں اجالے بھروں گا تو کیسے بھروں گا
میرے ہاتھ ہیں
آبلے تو ہیں پر کوئی تارا نہیں
میرے تاریک کمرے کی دیواروں پر
اک کرن بھی نہیں۔

کوئی کھڑکی نہیں۔ کوئی روزن نہیں
اور بھگوئی ہوئی خشک روٹی کے ٹکڑے
حلق میں کہیں جا کے پھنسنے لگے
میں وطن میں گویا بے وطن ہو گیا۔"

"ارے......" بے بی کو ایک دم یاد آیا۔

"عظمی! یہ تمہاری وہی نظم نہیں جو اس دن تم سنا رہے تھے۔"

معظم نے سر ہلا دیا۔

مکرم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سچی بھائی! عظمی شاعر بن گیا ہے یہ نظم اس نے خود لکھی ہے۔ اس روز ہمیں سنائی تھی۔ نے شروع سے تھوڑی سی۔"

"اچھا......" مکرم کو حیرت ہوئی۔

"اگر واقعی یہ تمہاری نظم ہے تو میں تم میں شاعری کے جراثیم دیکھ رہا ہوں۔"

"ویسے نظم خوبصورت ہے۔"

کاظم نے بھی رائے دی۔

"ایسا کرو عظمی! یہ میگزین کے لیے مجھے دے دو میں خاور کو دے دوں گا۔"

"یہ ابھی مکمل نہیں ہوئی، دوسری کوئی لے لینا۔"

"اچھا اور بھی لکھی ہیں یار! دکھانا کسی دن اپنی بیاض!"

مکرم نے بے تکلفی سے کہا اور پھر اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

"ارے نودی! تم وہاں پیچھے چھپی بیٹھی ہو۔ ادھر سامنے آؤ نا۔ سناؤ پڑھائی کیسی جا ہے۔"

"بس ٹھیک ٹھاک۔"

میں نے سر ہلایا پتا نہیں کیوں مکرم کے اس طرح پوچھنے پر میرا دل بھر آیا تھا اور دل چاہا کہ خوب زور سے رونے لگوں۔

"بہت دنوں سے تم کوئی انعام وغیرہ جیت کر نہیں لائیں۔ کیا مقابلوں میں حصہ لینا چھ

ہے۔"

"یونہی بس دل نہیں چاہتا۔"

"دل کو کہا کرو کہ ہر سرگرمی میں حصہ لے۔ اس طرح آدمی بددل ہو جائے تو جلدی تھک جاتا ہے نا۔"

میں نے سر ہلا دیا تو وہ دادی جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"دادی جان! آپ تیار ہو جائیں۔ میں ٹیکسی لاتا ہوں۔"

دراصل مکرم نے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا تھا اور دادی جان کی آنکھیں ٹیسٹ کروانی تھیں۔ مکرم باہر چلے گئے اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

● ○ ●

پھر کئی دن گزر گئے، کوئی خاص بات نہ ہوئی مدثر امریکہ واپس چلا گیا تھا۔ مگر میرے ذہن سے بہت دنوں تک وہ بات نہ نکل سکی اور بہت دنوں تک میں سوچتی رہی کہ کاش میں مکرم کے تاثرات جان سکتی۔

کالجوں میں موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ محلے کے چند بچے گھر آ کر پڑھنے لگے تھے، چار بچے تھے اور چار سو روپے، یہ بھی غنیمت تھا۔ گڑیا کے امتحان نزدیک تھے اس لیے ہم نے اسے بالکل ریسٹ دے دیا تھا۔ کچن کا سارا کام میں اور بے بی ہی کرتے تھے، ہمارے امتحان چھٹیوں کے بعد تھے اور میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ بی۔ ایس۔ سی کے بعد کسی سکول میں کسی دفتر میں جہاں کہیں بھی جگہ ملی جاب کر لوں گی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لوں گی۔ کاظم کا بھی فائنل ایئر تھا وہ قائداعظم یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کر رہا تھا۔ امید تھی کہ اسے اچھی جاب مل جائے گی۔ اس شعبے میں بڑا اسکوپ تھا احسن بھی Construction management میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہا تھا۔ ابھی وہ پہلے سال میں تھا۔ بادل میڈیکل میں تھا۔

بہت سا سفر طے ہو گیا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ باقی تھا۔ سب کی آنکھیں خوابوں و امیدوں کی روشنی سے جگمگاتی رہتی تھیں۔ ایک معظم تھا جس کی آنکھوں میں دھول اڑتی رہتی تھی۔ جس کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ وہ ہر وقت الجھا الجھا رہتا تھا۔

"عظمی! تم اتنے الجھے ہوئے کیوں رہتے ہو؟"

ایک روز میں نے پوچھا۔

وہ اسی وقت باہر سے آیا تھا اور برآمدے میں ہی پڑی ہوئی کرسی پر نڈھال سا ہو کر گر پڑا تھا۔

"مجھے مدثر کے ؟؟؟؟ کا انتظار ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم امریکہ جا سکو گے، سنا ہے، لوگ لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں پھر بھی نہیں جا پاتے۔"

"مدثر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پوری کوشش کرے گا۔"

"پتا نہیں اس میں کتنا وقت لگے، تم اس انتظار میں اپنا وقت تو ضائع نہ کرو۔ امتحان دو گے نا۔"

"شاید......"

"نہیں عظمی! تم امتحان ضرور دینا۔ مکرم کو دکھ ہوگا۔"

"اچھا......لیکن کیا فائدہ ہوگا!"

"نقصان بھی تو کوئی نہیں ہے۔ تم لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کر دینا۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

"ہر جگہ سفارش چلتی ہے اپنی سفارش کون کرے گا۔"

"خدا......"

میں مسکرائی تب ہی بے بی کھل کھل کرتی ہوئی باہر آئی تھی۔

"کیا ہوا؟ اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے؟"

"کاظم نے ایک بڑے مزے کی بات بتائی ہے۔"

"کیا؟"

"وہ جو مسز جبار ہیں نا جن کے ہاں تم نے ٹیوشن کی تھی۔"

"ہاں کیا ہوا؟"

"وہ ملی تھی۔ کاظم کو مدثر کے ہاں کاظم شبر سے ملنے گیا تھا۔ تو وہاں بڑے فخر سے بتا رہی تھیں۔"

"کیا بتا رہی تھیں یار! ایک تو تم بور بہت کرتی ہو۔"

میں نے چڑ کر کہا۔

"وہ بتا رہی تھیں کہ لوگ بڑے کمینے اور لالچی ہیں کنجوس اور تھڑ دلے۔"

"اچھا...... یہ ان کا خیال تھا۔"

میں نے طنز سے کہا۔

"اور خود اپنے متعلق وہ کیا کہتی تھیں؟"

"اپنے متعلق۔"

بے بی پھر ہنسنے لگی۔

"جناب وہ بڑی سخی داتا ہیں ان کی زبانی سنو انہوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ وہ ایک بار گوشت لینے گئیں تو وہاں ایک عورت قصائی کی منت کر رہی تھی کہ خدا کے لیے اسے آدھا پاؤ گوشت دے دے لیکن قصائی کہتا تھا کہ اس کے پاس ایک روپیہ کم ہے اور وہ گوشت نہیں دے سکتا۔ جبکہ عورت کا عذر تھا کہ ان کی بیٹی بہت بیمار ہے اور انہیں یخنی بنانا ہے تو اسے گوشت دے دے۔ پھر کبھی وہ ایک روپیہ دے جائے گی۔"

"تو کیا مسز جبار نے ایک روپیہ دے دیا۔"

میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں وہ آپ کی توقع سے زیادہ سخی تھیں۔"

"کیا انہوں نے مہینے بھر کے لیے گوشت خرید دیا۔"

"ارے نہیں سنو تو۔"

بے بی مزا لے رہی تھی۔

"انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ میں نے جناب پھر قصائی کی وہ بے عزتی کی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ میں نے اس سے کہا۔ تم خود غرض لالچی، کنجوس شخص ہو ایک بے چاری غریب عورت کی التجا نہیں سنتے ہو اور میں نے اسے اتنا شرمندہ کیا کہ اس نے مجبوراً اس عورت کو آدھا پاؤ گوشت دے دیا۔"

"واہ......"

معظم نے بے اختیار داد دی۔

"یہ مسز جبار واقعی بہت سخی ہیں ان کی سخاوت کا یہ قصہ تو اخبار میں چھپنا چاہیے۔"

میں نے رائے دی۔

"یہ تو دو لیتے۔"

معظم نے تلخی سے کہا۔

"ہمارے ہاں دولت کی تقسیم بہت غلط ہے۔"

"اگر تم خود دولت مند ہوتے تو شاید ایسا نہ کہتے۔"

"پتا نہیں...... میں کیا کہتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ...... دولت کی اس غیر منصفانہ نے......"

"یار عظمی!" کاظم نہ جانے کب باہر آ گیا تھا۔

"تم آج کل کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے ہو۔"

"کیوں کیا وہ لوگ صحیح نہیں ہیں؟"

"ہاں میرا ایسا ہی خیال ہے وہ لوگ جو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی باتیں کرتے ہیں جیسے سادہ دل اور معصوم لوگوں کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔ تم نے کبھی سوچا کہ ان کے پاس دولت کے کتنے ڈھیر ہیں۔ وہ جو کیا نام اس کا تیمور خان جو بہت بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا ہے اس کا گھر دیکھنا جا کر۔ کئی کنال پر پھیلے ہوئے اس کے بنگلے کے باتھ روم بھی ہمارے بیڈرو سے بڑے ہیں اور یہ ایک اکلوتا بنگلہ ہی نہیں لاہور اور کراچی میں بھی اس کی کوٹھیاں ہیں۔

لبرٹی میں سب سے بڑے پلازہ کا مالک کون ہے، اس سے پوچھنا اور یہ بھی پوچھنا ساری دولت اس نے کہاں سے حاصل کی ہے، میرے بھائی اس کے جال میں پھنسنے سے نکل آؤ۔ وہ پچھلے کئی سال سے لوگوں کو غلط کاموں کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ وہ ہر ایک اس کی خواہش اور طلب کے مطابق بات کرتا ہے۔ تمہارے سامنے کمیونسٹ بن کر دولت مند کو برا بھلا کہتا ہے۔ کسی اور گروہ کے سامنے وہ مولوی بنا ہو گا۔"

"لیکن تمہیں یہ ساری معلومات کہاں سے ملیں۔"

"سر ریاض نے بتایا تھا اور جب میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو مجھے افسوس ہوا۔

معظم سوچ میں پڑ گیا۔ تب ہی گڑیا کچن سے باہر آئی۔ شاید وہ اپنے لیے چائے بنا

تھی۔

"یہ گڑیا اتنی زرد اور کمزور کیوں ہو رہی ہے۔"

معظم نے شاید بہت دنوں بعد اسے غور سے دیکھا تھا۔

"دراصل وہ محنت بہت کر رہی ہے نا۔ امتحان ہے اس کا کچھ دنوں تک۔"

"امتحان۔" معظم کو حیرت ہوئی۔

"ہاں...... ایف۔اے کا پرائیویٹ ایڈمیشن بھیجا تھا۔"

"لیکن کیا ضرورت تھی؟ کون سا اس نے اسمبلی میں جانا تھا۔"

"پڑھائی اچھی چیز ہوتی ہے عظمی! اور پھر اسے بہت شوق تھا۔ پڑھنے کا لیکن اس نے جان بوجھ کر داخلہ نہیں لیا تھا کہ اس طرح اس کی پڑھائی کا خرچ بچ جائے گا۔"

"عقلمند ہے اور جانتی ہے کہ اس کا ہمارے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کرم کا احساس ہے ورنہ......"

"عظمی!" میں نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

"مجھے تمہاری بات سے دکھ ہوا۔"

"سوری...... لیکن یہ حقیقت ہے نودی!"

میں اٹھ کھڑی ہوئی کاظم بھی اسے سرزنش کر رہا تھا۔

"ویسے نودی!" معظم نے مجھے آواز دی۔

"اسے کوئی ٹانک وغیرہ یا طاقت کے کیپسول لا دو۔ کہیں مر مرا نہ جائے۔"

میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں جانتی تھی کہ معظم کو اس کا خیال رہتا ہے لیکن یونہی اوپر اوپر سے باتیں کرتا ہے۔

لانبے سیاہ بالوں۔ گھنی سیاہ پلکوں اور سیاہ ہرنی جیسی آنکھوں والی دبلی پتلی سانولی سی گڑیا کے چہرے میں بلا کی کشش تھی۔

بادل بھی سانولا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں۔ سیاہ آنکھیں، ہم سب خوب گورے چٹے تھے ایسے میں یہ سانولے بہن بھائی مجھے بہت اٹریکٹ کرتے تھے۔ عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ مجھے ان میں۔

گڑیا اندر آ کر بیٹھ گئی تھی اس کی پلکیں نم تھیں شاید اس نے عظمی کی بات سن لی تھی۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر دلاسہ دیا۔

"پاگل ہو تم...... عظمی تو یونہی بکواس کرتا ہے۔ تمہیں تنگ کرنے کے لیے۔ اس کی باتوں کو محسوس نہ کیا کرو اور پتا ہے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ گڑیا کو کوئی اچھا سا ٹانک لا دو اور اس کی صحت کا خیال رکھا کرو۔"

"اچھا......" وہ خوش ہو گئی۔ "ایسا کہا تھا عظمی نے۔"

"ہاں......"

"اور دیکھو تم زیادہ محنت نہ کرو اور رات کو سونے سے پہلے دودھ ضرور پی لیا کرو۔ میں کل دودھ والے سے کہہ دوں گی، وہ زیادہ دے جایا کرے گا۔"

میں نے اسے تاکید کی۔

"اچھا......" اس نے سر ہلاتے ہوئے کتاب کھول لی۔

● ○ ●

گڑیا واقعی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ آخری پیپر دے کر آئی تو گر پڑی۔

"کیا ہوا گڑیا!"

میں نے بھاگ کر اسے اٹھایا۔

"اتنی محنت کیوں کی تم نے؟"

لیکن گڑیا بے حال ہو رہی تھی اور بہت مشکل سے سانس لے رہی تھی۔

"بہت دنوں سے۔ بہت دنوں سے مجھے تکلیف ہے نودی! ابھی میں نے پڑھائی شروع بھی نہیں کی تھی تب سے، تب سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ رونے لگی۔

"پاگل! بے وقوف، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

میں نے بے بی کی مدد سے سہارا دے کر اسے پلنگ پر لٹایا۔

"بس یونہی میں نے سوچا۔ ڈاکٹر اتنی فیس لے لیتے ہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" وہی اس کی قربانیاں دینے کی عادت۔

"احمق ہو تم۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔

"اب بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اب......"

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ "اب یہ نا قابل برداشت ہو گیا ہے نودی! میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔ پلیز مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

وہ رونے لگی۔

اس کا سانس رک رہا تھا اور رنگ خطرناک حد تک پیلا ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر کہ کاظم اور احسن گھر پر ہی تھے۔ چنانچہ فوری طور پر ہم اسے ایمرجنسی میں لے گئے۔ اسے وہیں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ ایک ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ اس کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہو گیا ہے۔

ایک ڈاکٹر نے آ کر کہا کہ غالباً گردوں میں خرابی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے لگتا عام وارڈ کے ایک بیڈ پر پڑی ہوئی گڑیا چپکے سے ایک دن آنکھیں بند کر کے بیڈ خالی کر دے گی۔ یوں بھی اسے قربانیاں دینے کی عادت تھی۔ وہ ایک خرچ کم کر جائے گی۔ ہم سب صبح سے شام تک ہاسپٹل میں ہی رہتے۔ کوئی اندر کوئی باہر رات کو بھی بے بی اور میں وہیں ہوتے کاظم احسن اور مکرم بھی چکر لگاتے رہتے، بادل نے تو مستقل باہر پارک میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ اس روز گڑیا کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا بے بی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تو احسن اسے پکڑ کر باہر لے گیا۔ کاظم ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔ مگر کوئی ڈاکٹر نہیں ملتا۔ اسٹاف سے کہتے کہ مریض کی حالت خراب ہے تو جواب ملتا ابھی ڈاکٹر راؤنڈ پر آئیں گے تو دیکھ لیں گے۔ ڈاکٹر کی طرف جاتے تو جواب ملتا۔

"اچھا وہ وارڈ، وہاں تو فلاں ڈاکٹر کی ڈیوٹی ہے۔"

اور فلاں ڈاکٹر کے پاس جاتے تو جواب ملتا ابھی آ رہے ہیں۔

اور پھر کسی ماہر ڈاکٹر کے بجائے ہاؤس جابیوں کا جمگھٹا اکٹھا ہو جاتا۔

کوئی خون نکال لے جاتا۔
کوئی یونہی اپنی معلومات ہم تک پہنچاتا۔
”میرا خیال ہے پھیپھڑے بہت خراب حالت میں ہیں۔“
”گردے تو بالکل جواب دے گئے ہیں۔“
”ڈائی سیس مشین پر لگانا پڑے گا۔“
”یہ تو مہنگا علاج ہے، کہاں بے چارے افورڈ کر سکیں گے۔“
گڑیا نیلی ہو رہی تھی اور ڈاکٹرز نہ جانے کہاں تھے، مکرم آئے تو میں رو پڑی۔
”میں...... ہم گڑیا کو اس طرح لاوارثوں کی طرح نہیں مرنے دیں گے۔ اس عام وار میں۔ ہم سب مزدوری کر لیں گے۔ کچھ بھی کر لیں گے لیکن مکرم خدا کے لیے اسے پرائیویٹ کمرے میں منتقل کرو۔ ورنہ یہ سب مل جل کر اسے مار دیں گے۔“
ہم سب اس وقت کوریڈور میں کھڑے تھے۔
مکرم نے میرے کندھے تھپتھپا کر مجھے تسلی دی۔
”گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
”کیسے؟“
میں ابھی تک رو رہی تھی۔
”وہ مونچھوں والا کہہ رہا تھا۔ بہت مہنگا علاج ہے۔ جو بھی علاج ہوا کتنا بھی مہنگا، ہم کروائیں گے۔ ہم گڑیا کو نہیں مرنے دیں گے۔“
”ہاں......دادی جان کے وہ بیس تولے کے کڑے کس دن کام آئیں گے۔“
بے بی نے کہا۔
”گڑیا مر جائے گی تو پھر کس لیے، کس کی شادی پر خرچ کریں گے۔“
”ہمیں گھر بیچنا پڑا تو وہ بھی فروخت کر دیں گے لیکن گڑیا۔ مکرم پلیز......“
اور مکرم وہیں سے پلٹ گئے اور اسی شام گڑیا کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا اور مکرم نے...... اس کا اسپیشلسٹ سے اس کا چیک اپ کروایا۔
ڈاکٹروں کی رائے بھی یہی تھی کہ اس کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہے اور گردوں میں بھی

معمولی سی خرابی ہے تاہم خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ تندرست ہونے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔
گڑیا کی طبیعت ذرا سی سنبھلی تو مکرم کے ساتھ گھر آئی بے بی نے مجھے زبردستی بھیجا تھا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔ معظم باہر صحن میں بچھی چارپائی پر اوندھا لیٹا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ دادی کچن میں تھیں۔
”عظمی! تم ہاسپٹل نہیں آئے گڑیا کو دیکھنے۔“
مکرم نے پوچھا۔
”ہاں......“ عظمی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
”اتنے سارے ہمدردوں کی موجودگی میں میری کیا ضرورت تھی۔“
”عظمی!“ مکرم نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے یار!“
”مجھے کچھ نہیں ہوا۔“
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”بلکہ آپ لوگوں کو کچھ ہو گیا ہے۔ گڑیا کا ہم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ابا جان نے از راہ مدردی ان دونوں کو رکھ لیا تھا تو اس وقت وہ ایسے دس بچوں کو بھی رکھ سکتے تھے۔ لیکن اب میری مجھ میں نہیں آتا کہ...... ہم نے یہ مصیبت اپنے گلے میں کیوں ڈال رکھی ہے۔ کیوں نہیں ہم ان ے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ اب ان محترمہ کے لیے پرائیویٹ روم لیا گیا ہے۔“
میں نے مڑ کر مکرم کی طرف دیکھا۔ ان کا رنگ سرخ ہو رہا تھا وہ ہونٹ بھینچے کھڑے تھے۔
”کیا عام وارڈ میں علاج نہیں ہو سکتا۔ کیا وہاں مریض نہیں ہوتے، محترمہ کسی جگہ کی شہزادی ا کیا؟“
”عظمی...... عظمی!“
میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔
”وہ بیمار ہے کیا پتا......“
”ہاں جانتا ہوں۔ اب ڈائی سیسز مشین پر لگایا جائے گا کہاں سے آئے گا پیسہ پھر ڈاکٹر کہیں

گے۔ایک گردہ خرید لو۔"

"عظمی!" مکرم کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔

ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھا تھا۔معظم حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا تمہارا دل اتنا چھوٹا اور تنگ ہے۔" مکرم کی آواز میں شکستگی تھی۔

"آپ نے...... آپ نے مجھے مارا۔اس کے لیے جس کا ہم سے کوئی ناتا نہیں کوئی رشتہ نہیں۔جو اس زمین کی، ہماری بی بی کی مجرم ہے، جس کا اس زمین سے بھی کوئی ناتا نہیں کسی غدار بنگالی کی اولاد جس نے ہمیں بے گھر کیا۔ہمارا وطن دولخت کیا۔"

میری نگاہ اچانک ہی پیچھے گئی تھی۔بادل سر جھکائے واپس جا رہا تھا۔میرا دل کانپ گیا۔کیا اس نے سب سن لیا تھا۔

"اوہ نہیں۔" ندامت سے میں پانی پانی ہو گئی۔

"عظمی!" مکرم نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دو۔"

انہوں نے اس کے رخساروں پر اپنے ہاتھ پھیرے۔

"میں اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔لیکن یار تو نے اتنی چھوٹی بات کیوں کی۔عظمی تُو تو بڑے باپ کا بیٹا ہے جن کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا رہتا تھا۔پگلے اس کا ہم سے کوئی رشتہ نہ بھی ہوتا بھی وہ میری ذمہ داری تھی۔ابا جان نے انہیں میرے حوالے کیا تھا۔ہم نے بچپن سے ایک ہی دستر خوان پر کھایا ہے۔ایک ہی جگہ پلے بڑھے ہیں اور وہ تو کوئی غیر نہیں ہے۔وہ کسی بنگالی کی اولاد نہیں ہیں۔بے وقوف ہمارے اپنے ہیں، ہمارا اپنا خون ہے، چاچا نے جب آخری بار فون کیا تھا اور ابا جان کی وفات کا بتایا تھا تو اس وقت یہ بھی بتایا تھا کہ بادل اور گڑیا ان کی اولاد ہیں۔"

"نہیں......" عظمی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"نہیں...... میں جھوٹ نہیں بول رہا۔شاید میں یہ بات کبھی کسی کو نہ بتاتا کہ چاچا کا بھرم قائم رہے لیکن آج تم نے آج بہت چھوٹی بات کر کے مجھے ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔عظمی! چچی جان کی وفات کے بعد انہوں نے وہیں شادی کر لی تھی۔انہوں نے اس شادی کو خفیہ کیوں رکھا تھا

مجھے نہیں معلوم، لیکن جہاں تک میرا اپنا خیال ہے۔وہ کوئی غریب بنگالن رہی ہوگی۔مگر وہ عورت صرف تین سال بعد بادل اور گڑیا کو جنم دے کر مر گئی تب چاچا دونوں کو گھر لے آئے مگر پتا نہیں کیوں انہوں نے ابا جان کو بھی حقیقت نہ بتائی اور آخری بار فون پر شاید ایسے ہی کسی خوف نے کہ کہیں ہم لوگ انہیں بے یار و مددگار نہ چھوڑ دیں۔یہ راز بتانے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔"

مکرم ہولے ہولے بتا رہے تھے۔معظم خاموش تھا اور میں حیرانی اور خوشی کے عالم میں کھڑی تھی۔

"ارے تو وہ گڑیا! سانولی سلونی سی میری بہن تھی۔میرا اپنا خون۔"

اور وہ کم گو سنجیدہ سا بادل مستقبل کا ڈاکٹر میرا اپنا بھائی تھا۔

میرا دل چاہا کہ میں ابھی دوڑتی ہوئی ہاسپٹل جاؤں اور بے بی کو اس راز میں شریک کروں بلکہ سب کو، گڑیا کو جو کبھی کبھی معظم کی کسی بات پر نادم ہو جاتی تھی اور بادل کو جو ابھی سر جھکائے باہر چلا گیا تھا۔اس سے کہوں۔

"سر مت جھکاؤ، تمہارا اس زمین سے بڑا گہرا رشتہ ہے، تمہاری اصل تو یہیں ہے میرے بھائی......"

مگر ہوا یوں کہ جب ہم ہاسپٹل گئے تو گڑیا کی حالت بہت خراب تھی اور ڈاکٹر بھاگ دوڑ کر رہے تھے سو میں کسی کو کچھ نہ بتا سکی۔

پھر کئی دن یونہی پریشانی میں گزر گئے۔ہولے ہولے گڑیا سنبھلنے لگی تو مجھے احساس ہوا کہ بادل نہیں ہے۔

"بادل کہاں ہے؟"

ہم سب نے ایک دوسرے سے پوچھا لیکن کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

مکرم نے تمام ہاسپٹل چھان مارے کہ کہیں کوئی...... ایکسیڈنٹ وغیرہ نہ ہو گیا ہو۔

"دراصل اس نے اس روز معظم کی باتیں سن لی تھیں۔"

میں نے مکرم کو بتایا۔

"شاید اس لیے وہ کہیں چلا گیا ہے۔"

اس روز گڑیا کی طبیعت کافی ٹھیک تھی۔ہم سب اس کے کمرے میں تھے کہ ایک وارڈ بوائے

نے ایک لفافہ لا کر دیا کہ کوئی باہر دے گیا ہے۔ وہ بادل کا رقعہ تھا اور اس کے ساتھ ہی کچھ نوٹ بھی لفافے میں تھے۔

"یہ کچھ روپے گڑیا کے لیے ہیں۔ انشاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ گڑیا کے علاج پر خرچ ہونے والی ایک ایک پائی ادا کرسکوں۔ ہاں ان محبتوں کا قرض میں کبھی نہیں چکا سکوں گا۔ جو آپ سب نے ہمیں دیں۔"

"پاگل احمق۔"

مکرم خط اور پیسے وہیں پھینک کر باہر کی طرف بھاگے۔

لیکن بادل باہر کہیں نہیں تھا۔ پھر کتنے ہی دن گزر گئے، گڑیا ٹھیک ہو کر گھر بھی آ گئی لیکن بادل نہیں آیا۔ سب نے اسے بہت تلاشا۔ بہت ڈھونڈا۔ اخبار میں اشتہار دیئے۔ کالج جا کر کیا تو وہاں بھی نہیں جا رہا تھا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہم سب بہت پریشان تھے، ہماری مالا ایک موتی کھو گیا تھا۔ معظم بہت خاموش اور بہت چپ چپ رہنے لگا تھا اور بے بی کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ بے بی جو بہت خوش رہتی تھی اور ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ اب سارا دن کمرے میں گھس رہتی۔

معظم گڑیا سے کترانے لگا تھا۔ گڑیا نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ کوئی گلہ نہ شکوہ البتہ وہ سہ کی ممنون نظر آتی تھی۔ کئی بار دادی جان کی خالی کلائیاں دیکھ کر وہ رو پڑتی۔

"ارے بچی!" دادی جان نے اسے گلے لگا کر تسلی دی۔

"وہ کڑے تیری زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھے۔"

سب نے باری باری اسے تسلی دی تھی۔ سوائے معظم کے۔

"تو فکر نہ کر گڑیا بادل آ جائے گا ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ میں نے اس کے سارے دوستوں سے کہہ رکھا ہے۔"

مکرم اسے بہلاتے۔

"دراصل وہ ناراض ہو گیا ہے گلہ۔"

"بھلا بھائیوں سے دوستوں سے بھی کوئی ناراض ہوا ہے۔ بادل یہیں کہیں تھا۔ اسی شہر کیونکہ کئی بار اس نے کسی کے ہاتھ روپے بھجوائے تھے۔ کبھی کوئی بچہ دروازہ کھٹکھٹا کر دے جا

کبھی ڈاک میں آ جاتے۔ معظم صبح کا نکلا شام کو گھر آتا تھا۔ شاید بادل کو ہی کھوجتا پھرتا تھا۔ سب اپنی اپنی پڑھائی میں مگن تھے لیکن وہ جو ایک تازگی کا احساس تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ عجیب سی تھکن روح میں اتر آئی تھی۔ اب نہ دادی جان بارش آنے پر چیزیں سمیٹتیں اور نہ ہی وہ چاروں دادی جان کی پکار سے بے خبر فرینک سناترا کی گولڈن ڈسک میں مست ہوتے۔ یوں لگتا تھا۔ دنیا میں سوائے پڑھائی اور کتابوں کے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

اس روز پھر بادل جھوم جھوم کر آئے تھے۔ کئی دنوں کی شدید گرمی کے بعد شام کو ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔

"بے بی....."

میں نے چادر میں دبکی بے بی کو زبردستی اٹھایا۔

"بے بی آؤ۔ ذرا کالونی تک ہو آئیں۔"

"تم چلی جاؤ نودی! میرا دل نہیں چاہتا۔ گڑیا کو لے جاؤ۔"

"گڑیا ابھی کمزور ہے کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔"

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بے بی بھی اٹھ کر میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

"تمہیں بادل یاد آتا ہے نودی!"

"ہاں......" میں نے دل کے درد کو چھپا کر کہا۔

"مجھے بھی...... بہت...... بہت یاد آتا ہے حالانکہ اس کا ہم سے کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن ہم ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔ کیا ہم اسے یاد نہیں آتے ہوں گے اور ہمیں تو چھوڑو کیا اسے گڑیا یاد نہیں آتی ہو گی وہ اسے ہاسپٹل میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ آخر اسے ایسی کیا آفت آئی تھی۔ وہ کیوں چلا گیا نودی؟"

بے بی کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

وہ کیوں چلا گیا تھا یہ کسی کو نہیں معلوم تھا سوائے میرے معظم اور مکرم کے اور ہم نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

"بے بی! وہ لوٹ آئے گا مجھے یقین ہے۔"

"پتا نہیں......" بے بی بہت مایوس تھی۔
"جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔"
"ہماری محبتیں اسے ضرور واپس لائیں گی بے بی۔"
"ہماری محبتوں میں اتنی طاقت ہوتی تو وہ جاتا ہی کیوں نودی! محبتوں کے بندھن تو موم کے دھاگوں سے بھی زیادہ کچے ہوتے ہیں۔"
وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ لمحہ بھر میں یونہی اسے دیکھتی رہی۔ پھر جیسے اچانک مجھ پر کوئی ادراک ہوا۔ آگہی کے بہت سے در مجھ پر وا ہوئے۔ حیرت سے میرے ہونٹ کھلے اور بند ہو گئے۔
"بے بی...... بے بی تُو......تُو اور بادل......"
بے بی بدستور روتی رہی اور میں سوچتی رہی تو بے بی بادل سے......اور کتنی پاگل ہوں، مجھے کبھی خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہرن کو اس کی اپنی ہی خوشبو مست کیے رکھتی ہے۔ مجھے بھی اپنی ہی خوشبو مست کیے رکھتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ محبت صرف میرے ہی دل کو منور کیے ہوئے ہے۔ یہ صرف میں ہوں، جس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں مکرم کی محبت کا راز چھپا رکھا ہے۔
"بے بی......" میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔
"وہ لوٹ آئے گا۔ بھلا اتنی پیاری ہستی......"
"نودی......" بے بی نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔
"میں تو......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"کیا تمہیں یاد نہیں آتا۔"
"مجھے کیوں نہ یاد آئے گا۔ میرا بھائی! بے بی آ تجھے آج ایک راز میں شریک کر لوں۔ مکرم نے کہا تھا کہ جب تک بادل آ نہیں جاتا۔ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے۔ لیکن آج......"
اور پھر میں نے بے بی کو سب کچھ بتا دیا۔ بے بی حیرت سے منہ کھولے سنتی رہی۔
"مگر چاچا نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔ بھلا بابا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور بابا تو نرم دل تھے کہ انہوں نے بغیر کسی ناتے کے گڑیا اور بادل کو اپنا جانا۔ اگر انہیں غم ہوتا تو......"

"معلوم نہیں جانے کیا مصلحت تھی۔"
میں نے آہستگی سے کہا۔
اور پھر یکایک جانے میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر بے بی کی انگلی میں ڈال دی۔
"بے بی! اگر میرے بابا یا ماں زندہ ہوتیں تو تم جیسی بہو پا کر بہت خوش ہوتیں۔ میں بادل کی بڑی بہن ہوں۔ اس ناطے یہ انگوٹھی......"
"مگر نودی......"
بے بی نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کی۔
"تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ بادل جانے کہاں ہے آئے گا بھی یا نہیں پھر تم......"
"میں تمہیں اس بندھن میں باندھنا چاہتی ہوں۔ وعدہ کرو کہ جب تک بادل نہیں آئے گا تم اس بندھن کا احترام کرو گی اور مایوسی کے آخری لمحے تک اس کا انتظار کرو گی۔"
"پتا نہیں نودی! پتا نہیں نودی کبھی کبھی تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔"
وہ ہولے سے بڑبڑا کر چپ ہو گئی لیکن اس نے انگوٹھی اتاری نہیں۔ ہاں پتا نہیں مجھے کبھی کبھی کیا ہو جاتا تھا۔ میں بھی تو اپنے باپ کی طرح ہی تھی۔ فوری فیصلے کرنے والی جذباتی لڑکی۔ بس مجھے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ بادل اور بے بی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت بہت دنوں سے ان کے دلوں میں موجود ہے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں فلم کے سین کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ میں نے بے بی کو انگوٹھی پہنا کر اس کے دل میں امید کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ وہ جو بادل کے جانے کے بعد سے بہت بجھی بجھی دل گرفتہ اور شکستہ نظر آتی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ لمحوں میں اس کی تاریک آنکھوں میں امید کی ایک لَو سی جل اٹھی تھی۔

● ○ ●

میرے اور بے بی کے پیپرز شروع ہو گئے تھے جون کی تپتی دوپہروں میں ہم پیپر دے کر آتے تو گڑیا ہمیں ٹھنڈا شربت پلاتی اور پھر ہم اپنے کمرے میں گھس جاتے، کھانا، ناشتہ سب کمرے میں ہوتا، کپڑے استری کیے ہوئے مل جاتے۔ ہمیں ارد گرد کی کچھ خبر نہ تھی۔ مکرم کب آتے، معظم کیا کر رہا تھا، احسن اور کاظم کی چھٹیاں کن مشاغل میں گزر رہی تھیں اور بادل کا کچھ پتا

چلا تھا یا نہیں۔ ہم تو بس کتابوں میں بقول بے بی سر تا پیر ڈوبے ہوئے تھے۔ خدا خدا کر کے پیپر دے کر آئے تو پتا چلا معظم لاہور گیا ہوا ہے۔

"ارے کب؟ کیوں؟"

میں نے پنکھا آن کرتے ہوئے گڑیا سے پوچھا۔

"چھ سات دن ہو گئے۔"

گڑیا نے آہستگی سے کہا۔

"کسی دوست کے ساتھ جاب کی تلاش میں گیا ہے۔ یونیورسٹی تو بند ہے نا۔"

"اس گھر میں کیسے کیسے انقلاب آ رہے ہیں۔"

بے بی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"بادل کھو گیا۔ معظم چلا گیا اور دیکھو مل کر بھی نہیں گیا۔"

"آیا تو تھا لیکن تم لوگ سو رہی تھیں۔"

گڑیا نے اس کی طرفداری کی۔

"بھئی زندگی بہت بور ہے۔"

احسن اور کاظم نے ایک ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی زندگی بہت بور ہے۔"

میں نے اس کی تائید کی۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"پہلے یہ بتاؤ۔ تم لوگوں کے پیپرز ختم ہوئے۔"

"ہاں......بس پریکٹیکل رہتے ہیں۔"

میں نے بتایا۔

"تو پھر کچھ ہنگامہ کیا جائے کوئی پکنک پروگرام، چلو کنڈ چلتے ہیں۔"

"مگر بادل اور عظمی کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگے گا۔"

بے بی نے آہستگی سے کہا۔

"یہ عظمی!"

میں نے کاظم سے پوچھا۔

"کس قسم کی جاب کے لیے گیا ہے۔"

"پتا نہیں کوئی پرائیویٹ کمپنی ہی ہے۔"

"لیکن لاہور میں......لاہور میں اگر اس نے جاب کی تو پڑھائی کیسے جاری رکھ سکے گا۔"

"عظمی اپنے معاملے خود بہتر سمجھتا ہے نو دی! ایسا لگتا ہے جیسے اس کے اور ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہوں۔ جیسے وہ ہم سے الگ ہو رہا ہو، بچھڑ رہا ہو۔"

کاظم نے اداسی سے کہا۔

"تم اسے روک نہیں سکتے کاظم؟"

"شاید نہیں......طوفانوں کے سامنے بند نہیں باندھا جا سکتا نو دی!"

"چلو ٹی وی ہی لگا دو۔"

بے بی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ محترم ٹی وی صاحب کئی دنوں سے داغ مفارقت دے چکے ہیں۔"

"تو ٹھیک کروا لیا ہوتا۔"

"1972ء سے ساتھ دے رہا ہے بیچارا آخر کب تک ساتھ دیتا۔" احسن نے کہا۔

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔ احسن اٹھ کر دیکھنے چلا گیا۔ مگر جلد ہی وہ گھبرایا ہوا سا واپس آیا۔

"کاظم! بات سنو۔"

"کیا ہے؟ کیا ہے احسن؟"

میں اس کے پیچھے بھاگی۔

"مکرم تو خیریت سے ہیں نا۔ عظمی تو ٹھیک ہے نا......"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔"

اس نے مڑ کر مجھے تسلی دی۔

"وہ ایک دوست آیا ہے، ہم ذرا اس کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

پھر وہ دونوں چلے گئے لیکن میرا دل رہ رہ کر ڈوبتا رہا۔ پھر شام گہری ہوگئی۔ لیکن وہ لوٹ نہ آئے۔ نہ ہی مکرم آئے تھے۔

"یا اللہ خیر۔"

دادی جان کے دل میں بھی ہول اٹھ رہے تھے۔

وہ اتنی دیر تک باہر نہیں رہتے تھے اور پھر اب تک تو مکرم بھی آجاتے تھے۔ پھر......نو۔

پھر دس بجے تینوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"دادی جان! میں ذرا مدثر کے گھر سے کسی کو بھیجتی ہوں۔"

"کہاں بھیجو گی؟"

بے بی نے پوچھا۔

"ہمیں تو کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں۔"

تب ہی دروازہ کھلا اور کاظم آیا۔

"او خدا! تم کہاں چلے گئے تھے؟"

اسے دیکھتے ہی میں اس کی طرف لپکی۔

"مکرم کہاں ہیں؟ اور یہ احسن کہاں رہ گیا ہے؟"

"مکرم اور احسن دونوں خیریت سے ہیں۔"

"پھر خدا کے لیے کاظم جو کچھ بھی ہے بتادو۔"

"بادل مل گیا ہے۔" ہم تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"مگر وہ کہاں ہے؟ تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

"وہ ہاسپٹل میں ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مکرم اور احسن وہیں ہیں۔"

"کیا بہت بیمار ہے وہ؟"

"اب ٹھیک ہے۔ فکر والی کوئی بات نہیں صبح تم اسے جا کر دیکھ لینا۔"

"اوہ......" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

"میں......میں اس سے بہت لڑوں گی۔"

بے بی نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہاں......ہاں ضرور لڑنا۔"

کاظم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بہت سارا لڑنا......اور تم بھی گڑیا خوب لڑنا۔"

میں نے دیکھا کاظم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس نے چھپا لیا تھا۔

"کاظم! کیا تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

میں نے کاظم کے ساتھ ساتھ کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"دراصل......"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بے بی گڑیا اور دادی جان کمرے میں ہی تھیں۔

"تم ذرا جلدی سے ٹفن میں کھانا رکھ دو اور ایک تھرموس میں چائے بھی بنا دو۔"

"وہ تو میں رکھنے لگی ہوں لیکن کاظم تم کچھ بتانے جا رہے تھے۔"

"ہاں......بادل نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔" کاظم نے آہستگی سے کہا۔

"کئی دنوں سے وہ ہوسٹل میں تھا اپنے دوست کے پاس اس کا دوست بتا رہا تھا کہ وہ بہت مایوسی کی باتیں کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس کے پاس کچھ پیسہ اکٹھا ہو جائے تو وہ بنگلہ دیش چلا جائے۔ آج صبح اس کا دوست اپنے گاؤں جانے کے لیے ہوسٹل سے نکلا اس کا خیال تھا کہ وہ ایک دن بعد لوٹ آئے گا لیکن پھر راستے میں اس کا پروگرام رہ گیا اور وہ بس سٹاپ سے واپس آگیا اور یوں فوراً ہی بادل کو ابتدائی طبی امداد مل گئی۔ سینئر لڑکوں نے کافی مدد کی۔ پروفیسرز نے بھی مدد کی۔ ورنہ خودکشی کا کیس بن جاتا۔"

"اب وہ کیسا ہے؟"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر تو اطمینان دلا رہے ہیں۔ تم دعا کرنا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

میں نے ٹفن بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں مکرم نے منع کیا تھا۔"

"اچھا......"

کاظم چلا گیا اور وہ رات تقریباً ہم تینوں نے جاگتے ہوئے ہی گزاری۔

فجر کی نماز کے بعد تو ہم لیٹے ہی نہیں تھے۔ سات بجے کے قریب کاظم آ گیا۔

"بادل کیسا ہے؟"

"بہت بہتر......"

اس نے تسلی دی گڑیا نے پھرتی سے ناشتہ تیار کیا اور ہم تینوں کاظم کے ساتھ جاتے کے۔ تیار ہو گئے۔

وہاں اس کے تین چار کلاس فیلوز موجود تھے ہمیں دیکھتے ہی دور ہٹ گئے۔ مکرم اس کے قریب اس کے ہاتھ تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہت کمزور اور زرد رنگ ہو رہا تھا۔

"بادل! دیکھو کون آیا ہے؟"

انہوں نے نرمی سے کہا۔

بادل نے آنکھیں کھولیں اور پھر اس کی آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا اور ہم تینوں کی آنکھیں بھی بہنے لگیں۔ بے آواز آنسو رخساروں پر پھیلتے رہے۔

"تم نے یہ کیا کیا بادل؟"

اس کے بیڈ کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"It is too hard to live in this nodi"

(اس دنیا میں زندہ رہنا بہت مشکل ہے نودی)

"زندگی کو تو تم نے خود اپنے لیے مشکل بنایا میرے بھائی ورنہ زندگی اتنی مشکل نہیں ہے۔"

"ہاں نودی صحیح کہتی ہے بادل!"

مکرم نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

"گڑیا، نودی، بے بی اور ہم سب کے ہوتے ہوئے بھی تمہیں یہ زندگی مشکل لگتی تھی۔"

"میں اکیلا تھا۔"

"تم اکیلے کب ہو بادل! ہم سب تمہارے ہیں۔"

"تم نے اس طرح ہمیں چھوڑ کر ہم سب کو بہت دکھ دیا۔ بہت تکلیف دی۔"

گڑیا نے شکوہ کیا۔

دادی جان، بے بی، نودی اور کاظم سب کے سب دکھی تھے۔

پھر مکرم اور احسن گھر چلے گئے اور ہم تینوں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔

دو تین بعد وہ ڈسچارج ہو گیا اور اسی شام معظم بھی لوٹ آیا وہ بہت خوش تھا۔ اس نے آتے ہی بادل سے معافی مانگ لی تھی اور یوں زندگی ایک بار پھر پہلے کی طرح ہو گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ معظم بہت خوش رہنے لگا تھا۔ اسے بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ اسلام آباد میں اور مزے کی بات یہ تھی کہ یونیورسٹی کھلنے کے بعد اس کی ڈیوٹی دو بجے سے پانچ بجے تک ہوتی تھی۔ آج کل وہ آٹھ بجے چلا جاتا تھا۔

"یار! یہ نوکری کیا ہے بھئی۔"

ایک روز مکرم نے پوچھا۔

"کام کیا کرتے ہو؟"

"فی الحال تو کوئی خاص کام نہیں۔ پرانا ریکارڈ ہے کوئی اسے ہی ترتیب دے رہا ہوں۔ بوسیدہ رجسٹر اور کاغذات۔"

"اتنے سے کام کے لیے اتنی تنخواہ یار کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہی نہ ہو۔"

"نہیں گڑبڑ نہیں، یہ جاب تو مجھے تیمور خان نے دلوائی ہے اور پھر آپ کو پتا ہے میں غلط کام تو برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ بھوکا مر جاؤں۔"

معظم کو تنخواہ ملی تو وہ قسطوں پر ٹی وی لے آیا۔ اس روز سب نے خوب جشن منایا۔ دادی جان بھی مسکراتی رہیں اور ہمیں یونہی ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں دیں لیکن شاید کچھ دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں۔ جس کمپنی کے لیے معظم کام کر رہا تھا۔ اس پر چھاپہ پڑا تھا اور لوگوں کے ساتھ معظم بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ اگرچہ چند دنوں بعد سب ہی رہا ہو گئے تھے۔ کوئی ثبوت وغیرہ نہیں ملا تھا لیکن یہ چند دن جو معظم نے جیل میں گزارے تھے ہمارے لیے ایک عذاب سے کم نہ تھے۔

اگرچہ تیمور خان نے اسے جاب جاری رکھنے پر اصرار کیا تھا لیکن معظم نے جاب چھوڑ دی تھی۔

"کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے نودی!"

معظم نے مجھ سے کہا۔

وہ بہت ٹوٹا ہوا اور دل گرفتہ لگ رہا تھا۔

"یہ لوگ فیئر نہیں ہیں۔ در پردہ کوئی غلط کام ہو رہا ہے۔"

"تمہیں کیا عظمی! شکر ہے تمہیں بروقت پتا چل گیا ممکن ہے وہ تم سے کوئی غلط کرواتے۔"

"ہاں...... شاید کاظم صحیح کہتا ہے۔ یہ تیمور خان وطن دشمن ہے۔ لیکن نودی! یہاں اس میں اتنا دھوکا۔ اتنا فریب کیوں ہے۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے اور اسے نے بہت مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ ہم اسی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں اور ہمیں احساس نہیں ہم اپنے قاتل خود ہیں نودی۔"

"مگر ہم لوگ چند لوگ کیا کر لیں گے۔ کیا کر سکتے ہیں۔"

وہ بہت مایوس ہو گیا تھا۔

"اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے عظمی!"

"ہاں...... نودی سے سبق سیکھو۔"

بے بی نہ جانے کب ہمارے پاس آ گئی۔

"اس نے بے شمار سکولوں سے مایوس ہونے کے بعد پھر ایک نئے سکول میں جاب لیے اپلائی کر دیا ہے۔"

میں اب فارغ تھی اور یوں بھی میں نے سوچا تھا کہ بی۔ ایس۔ سی کے بعد اب یونیو میں ایڈمیشن لینے کے بجائے کسی سکول میں جاب کر لوں گی اور گڑیا کو کالج میں ایڈمیشن دلوا دو گے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک پبلک سکول میں ایک ہزار روپے ماہوار پر سروس مل گئی تھی اور سکو بھی گھر سے نزدیک ہی تھا۔ جس روز مجھے پہلی تنخواہ ملی اس روز گڑیا کا رزلٹ آیا۔ اس نے فر ڈویژن لی تھی بے بی نے چائے پر اہتمام کر لیا تھا۔ گڑیا کے سانولے رخساروں پر سرخی تھی اور ا کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔

"گڑیا! اب تجھے کالج میں داخل کروا دوں گا۔"

"مگر نودی!"

"بس اگر مگر کچھ نہیں۔"

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

سب نے ہی گڑیا کو کچھ نہ کچھ گفٹ دیا تھا۔ سوائے معظم کے۔

"عظمی! تم گڑیا کے لیے کیا لائے ہو؟"

"میں میرے پاس بھلا کیا ہے۔"

وہ بہت مضطرب اور بے چین لگ رہا تھا۔

"اور کچھ تو یار! اپنا دل ہی نذر کر دو۔"

کاظم نے اس کے کان میں سرگوشی کی، جسے میں نے سن لیا اور مسکرا دی۔ لیکن معظم یونہی بے چینی سے انگلیاں مروڑتا رہا۔ پتا نہیں وہ مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا۔ اب تو یونیورسٹی کھل گئی تھی وہ باقاعدگی سے جا رہا تھا۔ ایک دو ماہ تک اس کے امتحانات بھی ہونے والے تھے۔ پھر بھی وہ مضطرب رہتا تھا۔

"تمہارا رزلٹ کب تک آ رہا ہے؟"

کاظم نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔"

"کیا پروگرام ہے؟"

"فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

میں نے آہستگی سے کہا اور چائے بنانے لگی۔

"تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے نودی۔"

بادل نے پوچھا۔

"جاب...... بس......"

"میں بتاؤں۔"

بے بی نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"اس کا بس چلے تو سارے سکول کا انتظامی ڈھانچہ ہی بدل دے۔ اسے سکول کی ساری پالیسیوں سے اختلاف ہے۔"

"اچھا......" مکرم مسکرائے۔ "کیوں نودی؟"

"ہاں......" میں نے برا سا منہ بنایا۔

"عجیب ماحول ہے ہر ٹیچر دوسری ٹیچر کے خلاف ہیڈ مسٹریس کے کان بھرتی رہتی ہے ا کوئی ایک دوسرے کو دھکا دینے کی فکر میں مبتلا ہے اور ہیڈ مسٹریس صحیح بات بھی سننے کے لے نہیں۔ وہی سو سال پرانے اصول اور ان کی دست راست ان سے بھی دو ہاتھ آگے، لکیر کی فـ مجال کہ کوئی ان سے اختلاف کر جائے۔ سامنے تو بڑی با اخلاق اور پیچھے ery mean politics۔"

مکرم زور سے ہنس دیئے۔

"یہ پالیٹکس تو سب اداروں میں ہوتی ہے۔ تم ابھی سے گھبرا گئیں۔"

"لیکن کم از کم تعلیمی ادارے تو اس سے پاک ہونے چاہئیں۔ بچوں پر اثر پڑتا ہے۔"

"اور شاید تمہیں علم نہیں ہے۔ خوشنو فضل کہ اس گھٹیا سیاست کا سب سے زیادہ شکار محکمہ ہے۔"

معظم نے تلخی سے کہا۔

"تعلیمی پالیسی غلط، نصاب غلط، سب کچھ غلط۔"

"ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے۔"

کاظم نے آواز لگائی۔

بڑے خوشگوار موڈ میں چائے پی گئی۔ مکرم تھکے ہوئے تھے، اس لیے آرام کرنے کے چلے گئے اور ہم دیر تک بیٹھے گپیں لگاتے رہے۔ معظم کا موڈ بھی کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا، س کے اصرار پر اس نے اپنی ایک دو نظمیں سنائیں اور پھر رات کے کھانے کے بعد ہم چہل قدمی لیے نکل گئے۔

• ○ •

کاظم اور معظم امتحان دے کر فارغ ہو گئے تھے، کاظم کو یہاں کالونی میں ہی سیلز کلرک جاب مل گئی تھی۔ وہ اپنے مستقبل سے بہت پُر امید تھا۔ اسے یقین تھا کہ رزلٹ کے بعد اسے بھی ادارے میں اچھی جاب مل جائے گی۔

"اس میں بہت اسکوپ ہے نودی! دیکھنا سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مکرم نے

سب کے لیے بہت محنت کی ہے۔ بہت دکھ جھیلے ہیں۔ میں جاب ملتے ہی مکرم سے کہوں گا کہ وہ اب آرام کرلے۔ بہت تھکا ہے وہ ہمارے لیے۔"

مکرم کی بات کرتے ہوئے ہم سب ہی جذباتی ہو جاتے تھے لیکن عظمی کی تو آنکھیں سلگنے لگتیں۔ ہونٹ کپکپانے لگتے وہ تو بہت پہلے مکرم کے لیے، سب کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، وہ جس در پر دستک دیتا تھا۔ وہی در اسے بند ملتا تھا۔ جہاں ٹھہرتا وہاں اتنی غلاظت اور گندگی ہوتی، اتنا تعفن ہوتا کہ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس مختصر سے عرصہ میں اس نے دو تین جگہ جاب کی اور پھر چھوڑ دی۔ ایک رسالے میں ایک مصالوں کی فیکٹری میں، ایک غیر ملکی کمپنی میں لیکن کہیں بھی وہ مطمئن نہ ہو سکا۔

"پتا نہیں یہ ساری دنیا ہی فریبی ہے یا مجھے ہی ایسے لوگ ملتے ہیں۔"

اس روز وہ بہت تھکا تھکا اور نڈھال لگ رہا تھا۔

میں، بے بی، وہ اور گڑیا ہم چاروں صحن میں بچھے تخت پر بیٹھے تھے۔

"کبھی کبھی آدمی پر ایک ساتھ بہت سی آزمائشیں آجاتی ہیں۔ عظمی! لیکن میرا ایمان ہے کہ سارے مشکل اور کٹھن وقت گزر جاتے ہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور حوصلہ۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"مگر نودی! تم نہیں جانتیں میں......"

"جانتی ہوں عظمی! سب جانتی ہوں۔ ساری بات یہ ہے کہ تم بہت جلد ایک دم بہت کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن یہ ایک دم بہت کچھ سیدھے راستوں پر چل کر حاصل نہیں ہوتا۔ میرے بھائی اور تمہارے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ تم ٹیڑھے راستوں پر چل نہیں سکتے۔ تمہارے لہو میں ایمان و یقین کی ان کہانیوں کے لفظ دوڑتے ہیں جو دادی جان نے ہمیں سنائی ہیں۔ تم نے ہجرت کے ان عذابوں کا ذائقہ چکھا ہے جن کے بعد وطن کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تم نے ہجرت کی یہ دردناک کہانی سنی ہے جس کے لیے تمہارے باپ دادا نے قربانیاں دیں۔ تم اس زمین کے ساتھ دغا نہیں کر سکتے عظمی! تم اپنا ایمان فروخت کر کے اپنے لیے مادی خوشیاں نہیں خرید سکتے۔"

"ہاں.....شاید تم صحیح کہتی ہو نودی! تمہاری باتیں کبھی کبھی اپیل کرتی ہیں۔"

"تو میرے بھائی پھر اپنی زندگی پر قانع ہو جاؤ۔ وقت خود تمہاری جھولی کو مسرتوں سے بھ

دے گا۔"

"وقت......" وہ طنز سے ہنسا۔

"مجھے تمہاری اس بات سے اختلاف ہے۔"

"بغیر کوشش کیے مجھے کیسے کچھ مل جائے گا۔"

"تم میری بات نہیں سمجھے ہو عظمی! میں کوشش سے منع نہیں کر رہی۔ میں تو مایوسی کو تمہارے دل سے ختم کرنا چاہتی ہوں۔ کوشش ضرور کرو لیکن مایوسی کو دل میں جگہ نہ دو۔ ایک در بند ہوتا ہے ہزار در کھل جاتے ہیں۔"

"ہاں......"

"کچھ کہتے کہتے رک گیا اور سامنے سے آتی نوشین کو دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہے بھئی؟"

بے بی نے اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ڈبہ دیکھ کر پوچھا۔

"چاکلیٹ ہیں۔ مدثر بھائی لائے ہیں۔"

"ارے مدثر آ گیا اتنی جلدی۔"

عظمی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں رات اچانک ہی آ گئے۔ کہہ رہے تھے اس بار دل نہیں لگا۔ اماں نے بھی کہا ہے بہت پردیس کے دھکے کھا لیے۔ اب یہیں...... رک جاؤ۔ کہہ رہے ہیں سوچوں گا۔ حالات دیکھوں گا۔"

نوشین نے تفصیل بتاتے ہوئے ڈبہ بے بی کی طرف بڑھا دیا اور معظم اٹھ کر مدثر سے ملنے چلا گیا۔

رات مکرم کے آنے پر مدثر آیا تو وہ میرے، بے بی اور گڑیا کے لیے گفٹ لایا تھا۔

"یہ آپ کے لیے نو دی۔"

اس نے پارکر پین میری طرف بڑھایا۔

"لیکن......" میں نے گھبرا کر مکرم کی طرف دیکھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"پلیز...... یہ میری چھوٹی سی خوشی ہے۔"

"لے لو نو دی!"

مکرم نے نرمی سے کہا۔

اور پھر اس نے گڑیا اور بے بی کو ان کے گفٹ دیئے۔ نقلی جیولری تھی۔

بے بی ایک دم بہت خوش ہو گئی تھی۔

"تھینک یو۔"

لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"ہمیں یہ نہیں لینے چاہیے تھے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"وہ اتنی خوشی سے لایا تھا۔"

مکرم نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں...... اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

معظم نے بھی اس کی تائید کی۔

"کوئی اتنا قیمتی گفٹ نہیں ہے کہ اس کا بوجھ اتارا نہ جا سکے۔ میں جب باہر سے آؤں گا تو ان سب بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہ کچھ لے آؤں گا۔"

"تو تم باہر جانے کا پختہ ارادہ کر چکے ہو۔"

مکرم نے پوچھا۔

"ہاں...... اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟"

"ہمارے ہاں جاب...... اپنے مطلب کی جاب ملنا آسمان سے تارے توڑ لانے کے مترادف ہے۔ بغیر سفارش بغیر رشوت کے۔"

"بھئی کہیں تو ان دو سکوں کے بغیر بھی کام چلتا ہو گا نا۔ کہیں تو صلاحیتوں کو جانچا اور پرکھا جاتا ہو گا۔ کبھی تو اپنے مطلب کی جاب مل ہی جائے گی۔"

کاظم نے کہا۔

"اور اس کبھی تک چاہے آدمی گھل کر ختم ہو جائے۔"

”دراصل تم دل میں یہ طے کر چکے ہو کہ تمہیں جانا ہے لہٰذا تمہیں جانے سے کوئی بھی رو
نہیں سکتا۔“

کاظم نے پھر کہا۔

”ہاں مجھے جانا ہی ہے اس لیے......“

یہاں کیا رکھا ہے
بھگوئی ہوئی خشک روٹی کے ٹکڑے، فقط چند ٹکڑے۔
میرے باغی تخیل نے مجھ سے کہا۔
اور......
میں وطن میں گویا بے وطن ہو گیا۔“

اس نے اپنی ادھوری نظم کا بند پڑھا۔

”یار تم اچھے شاعر بن سکتے تھے۔ شاعری کرو نام کماؤ اور پھر دیکھو۔“

”پھر کیا روپوں کی بارش ہو گی۔“

”نہیں روپوں کی نہیں لڑکیوں کی۔“

کاظم کبھی مکرم کی موجودگی میں بھی شوخ ہو جاتا تھا۔

”کیا بات ہے بھئی کسی مشاعرے میں نظم پڑھو۔ خوبصورت غزل آنکھوں والی لڑکیاں اپنی آٹو گراف بکس اٹھائے آپ کے گرد اکٹھی ہوں اور سریلی آوازوں میں درخواست کر رہی ہوں گی۔

”پلیز......آٹو گراف دے دیجیے۔“

”ہائے آپ کتنے خوبصورت شعر کہتے ہیں۔“

کاظم نے باریک آواز میں کہا تو سب ہنس پڑے۔ یوں وقتی طور پر کمرے کی فضا کا بو
پن ختم ہو گیا۔

کاظم مکرم سے اپنی جاب کے موضوع پر بات کرنے لگا اور میں اٹھ کر چائے بنانے چل
اور جب میں چائے بنا کر لائی تو فضا میں پھر وہی بوجھل پن تھا۔ گڑیا گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے زمین کو دیکھ رہی تھی اور اس کی لانبی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ شاید معظم نے کوئی تکلیف دہ بات

دی تھی۔ کبھی کبھی معظم یونہی کوئی اذیت ناک بات کر جاتا تھا۔ گڑیا کے احساسات سے بے خبر۔

”لیکن عظمی! کیا تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔ کیا ملک سے باہر جائے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔“

بادل نے اپنی میڈیکل کی کوئی بھاری کتاب گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بات یہ ہے جان عظمی! کہ زندگی گزارنا اپنی مرضی کی زندگی بہت مشکل کام ہے اور اس روز تم نے صحیح کہا تھا کہ......

"It is too hard to live in this world"

(اس دنیا میں جینا بہت مشکل ہے)

”کوئی بھی نہیں۔“ بے بی نے ہاتھ ہلایا۔

”سارے لوگ اس مزے سے جیتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں، وہ لوگ بھی جن کے پاس کوئی گھر نہیں ہوتا۔ کوئی اپنا نہیں ہوتا۔“

”وہ زندگی گزارتے نہیں۔ زندگی ان کو گزارتی ہے۔“ معظم نے کہا۔

”پتا نہیں تم اتنے ناشکرے کیوں ہو عظمی! انہ ہم سب کو ہم سب کے ہوتے ہوئے بھی تم......
ہم سب کو چھوڑ کر تم چلے جاؤ گے۔“

بے بی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے مکرم سے کہا۔

”آپ اس کو روکتے کیوں نہیں۔ منع کیوں نہیں کرتے۔“

”ہر ایک کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق ہوتا ہے بے بی۔“

”میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جاؤں گا بے بی۔“

معظم نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر لیے۔

”میں تمہارے لیے، نو دی کے لیے، بادل کے لیے، سب کے لیے جا رہا ہوں۔ میں تمہیں سہولتیں دینا چاہتا ہوں۔ وہی زندگی جو تم نے گزاری تھی۔“

”میں تو اپنی زندگی سے بھی بہت مطمئن ہوں عظمی! پلیز مت جاؤ۔“

”ہم سب مل جل کر یہاں ہی اپنے لیے اچھی زندگی تلاش کریں گے۔ خدا تمہیں وہ زندگی ضرور دے گا عظمی! جس کی تمہیں چاہ ہے، لیکن خدا کے لیے ہمیں اکیلا مت کرو۔“

"بے بی پلیز! مجھے مت روکو۔ مجھے وہ سب کرنے دو جو میں کرنا چاہتا ہوں۔"

اور اسے کوئی بھی نہ روک سکا۔

وہ چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ ٹکٹ کے پیسوں کے لیے پریشان تھا۔ مکرم جتنا پیسہ فنڈ۔ لے سکتے تھے وہ پہلے ہی نکلوا کر اس کے حوالے کر چکے تھے۔ گڑیا نے اپنی چین اور انگوٹھی اس۔ سامنے رکھ دی۔ اور پھر وہ سارا معمولی سا زیور جو ڈھاکہ سے آتے ہوئے ہمارے ہاتھوں اور۔ میں تھا اور جو اب دادی جان کے لاکر میں تھا۔ سب اس کے سامنے ڈھیر کر دیا گیا۔

وہ ہونٹ بھینچے آنسو چھپائے بہت دیر تک یونہی اپنے سامنے پڑے ننھی ننھی چوڑیو انگوٹھیوں اور لاکٹوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دادی جان کی گود میں سر رکھ کر رو دیا اور دادی جان ہو ہولے اس کا سر سہلاتی رہیں لیکن اسے جانا تو تھا ہی سو وہ چلا گیا اور گھر میں عجیب سی اداسی پھیل گ[ئی]

جانے والے نے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں اس کی کوئی تسلی نہیں پکڑائی تھی اور اُمـ کوئی چراغ روشن نہیں کیا تھا۔

محبت کا کوئی لفظ

پیار کا کوئی بول

کچھ نہیں...... اس کے کاسے میں کچھ بھی نہیں تھا۔

لیکن پھر بھی اس کی بھیگی پلکوں والی آنکھوں میں امید کے چراغ جلتے تھے۔

اس نے دل کے زنداں میں آس کی تتلی کو بند کر رکھا تھا۔

خدایا اس کی یہ آس کبھی نہ توڑنا۔

اور اس کی آنکھوں میں جلتے چراغوں کی لَو کبھی ماند نہ کرنا۔

میں سچے دل سے دعا مانگتی۔

گڑیا پہلے بھی مجھے بہت عزیز تھی۔

میں سچے دل سے دعا مانگتی۔

اور اب تو اور بھی پیاری ہو گئی تھی۔

• O •

ہمارے رزلٹ آ گئے تھے۔ ہم دونوں نے ہی فرسٹ ڈویژن میں بی۔ ایس۔ سی کر لیا

ابھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع نہیں ہوئے تھے اس لیے بے بی فارغ تھی۔ میں بدستور جاب کر رہی تھی۔ اگرچہ تین چار ماہ میں ہی اس جاب نے مجھے تھکا دیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ پڑھانا ایک مشکل کام تھا۔ بلکہ اس لیے کہ غلط کو صحیح کہنا ایک مشکل کام تھا اور مجبوری یہ تھی مجھے غلط کو صحیح کہنا پڑتا تھا۔ اس سکول کا سارا نظام ہی غلط تھا۔ میں بی ایس سی تھی لیکن میں کے جی کی کلاسز کو پڑھاتی تھی جبکہ مسٹر ربانی ہائی کلاسز کو نہ صرف یہ کہ فزکس اور کیمسٹری پڑھاتے تھے بلکہ حساب بھی پڑھاتے تھے جبکہ وہ صرف ہسٹری میں ایم اے تھے۔

"سر! بچے شکایت کر رہے ہیں کہ آپ انہیں نمریکل؟؟؟؟ سمجھاتے ہی نہیں ہیں۔"

ایک روز نوشین کی بہن کی شکایت پر جو اسی سکول میں پڑھتی تھی میں نے ان سے کہا۔

"بی بی۔"

انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر قمیص کے دامن سے صاف کیا۔

"میں وہ چیز ان کو کیسے پڑھا سکتا ہوں۔ جو میں نے خود نہ پڑھی ہو۔ بی بی! میں تو سیدھا سادا ہسٹری میں ایم اے ہوں فزکس اور کیمسٹری کی ابجد بھی نہیں جانتا۔ حساب میں نے میٹرک تک پڑھا ہے وہ بھی جنرل۔"

مجھے حیرت ہوئی۔

اور میں نے اس روز آفس میں جا کر بڑے خلوص سے پرنسپل کو پیش کش کی۔

"سر! اگر آپ کہیں تو میں سائنس سبجیکٹ پڑھا دیا کروں بچے ڈسٹرب ہیں۔ وہ ربانی صاحب تو......"

"پرنسپل آپ ہیں یا میں؟"

"جی......" میں شرمندہ ہو گئی۔

اور اس روز مجھے احساس ہوا کہ کاظم صحیح کہتا ہے۔

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے
انجام گلستاں کیا ہو گا

یا اللہ اس قوم کو عقل دے۔

اور محکمہ تعلیم باشعور لوگوں کے ہاتھوں میں دے کہ یہ ننھے ننھے بچے جنہوں نے بڑے ہو کر

ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ یہ جو ہمارا مستقبل ہیں، ہمارے خواب اور ہماری امید ہیں، ا
مستقبل محفوظ ہو جائے۔

یا اللہ ان پودوں کو ان ہاتھوں میں دے جو ان کی صحیح حفاظت کر سکیں۔

اس روز میں بہت دلگرفتہ تھی۔ پرنسپل نے سب ٹیچرز کو باری باری بلا کر میری پیش کش
متعلق بتایا تھا اور مذاق اڑایا تھا۔

"یہ کل کی لڑکی مجھے مشورہ دینے آئی تھی۔ اس سے کہو میری کرسی حاضر ہے۔ یہاں ب
جائے۔"

"لگتا ہے اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھتی ہے۔"

مسز منور جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگیں۔

"سر! اس دن مجھ سے کہنے لگی۔ اتنے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو نہ ماریں۔ پڑھا
سے نفرت ہو جائے گی انہیں بچوں میں پڑھائی سے محبت پیدا کرنی چاہیے۔ بڑی آئی ما
نفسیات۔"

سب کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھیں اور پرنسپل راجا اندر بنے سب کو شہ دے رہے تھے۔

"حسن پر غرور ہے۔"

"نخرہ بہت کرتی ہے۔"

"سنا ہے بنگلہ دیش میں اس کے باپ بڑے کارخانہ دار تھے۔"

"تبھی ہزار روپے کے لیے خوار ہو رہی ہے۔"

ایک قہقہہ۔

میں سر جھکائے آفس کے پاس سے ہٹ کر اسٹاف روم میں آ گئی۔

"یا اللہ! کیا ایک مخلصانہ مشورہ دینا غلطی ہے۔"

اور میں نے تو کبھی دھیان سے آئینہ دیکھا ہی نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی سے
کہ میرا باپ کارخانہ دار تھا۔ میں تو موجودہ کے مسائل سے لڑ رہی تھی۔

میرے سامنے حال تھا اور مستقبل کے خواب۔

ماضی کی طرف مڑ کر تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

میں کیا چھوڑ کے آئی تھی۔

کیا کھویا تھا۔

اس کا تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

پھر یہ سب...... یہ سب......

دل پر بہت بوجھ لیے میں سکول سے نکلی تو گھر جانے کے بجائے نوشین کی طرف چلی گئی۔
میں نے سوچا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔ مگر نوشین گھر پر نہیں تھی۔ شبر نے
مجھے بتایا کہ وہ اور امی تو شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔

فرحین نے اندر چلنے کی ضد کی۔

"مس دو منٹ کے لیے تو آئیں۔ پانی تو پی لیں۔"

اور میں اس کی ضد سے مجبور ہو کر اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ فرحین بیگ رکھ کر فوراً ہی
میرے لیے کوک لے آئی۔

کوک پی کر باہر نکلی تو کوریڈور میں مدثر نظر آ گئے۔

"آپ......" مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

"وہ میں فرحین کے ساتھ ہی سکول سے آ گئی تھی۔ سوچا نوشین سے مل لوں گی۔"

"وہ تو آج شاپنگ کے لیے گئی ہے۔"

مدثر میرے قریب آ گیا تھا اور مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ میں نے تیزی سے ایک قدم
آگے بڑھایا۔ مدثر میرے ساتھ ہی چلنے لگا۔

"سکول کیسا جا رہا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے۔"

"ایم ایس سی کرنے کا پروگرام ہے؟"

"فی الحال نہیں۔"

"خوشنود! بہت دنوں سے بہت سارے دنوں سے میں آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہا
"

"جی......" میں ٹھٹک گئی۔ لیکن چلتی رہی چلتے چلتے ہم گیٹ تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے

گیٹ کھولا۔

”پلیز خوشنود! میری بات سن لیں۔“

میں نے ایک ہاتھ گیٹ پر رکھے مڑ کر اسے دیکھا۔

”آپ کہیں۔“

”خوشنود!“ انہیں شاید کہنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔

”آپ خفا مت ہوئیے گا۔“ انہوں نے قدرے رک کر کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کس طرح اپنی بات کا اظہار کروں۔ مجھے آپ جانتی ہ کہ میں اس بار بہت جلد وطن لوٹ آیا ہوں۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا وہاں دل کیوں نہ لگ رہا۔ شاید میں تھک گیا ہوں۔ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ کسی ایسے ساتھی کی جو میر تھکن بانٹ لے۔ جس کے پاس بیٹھ کر میں گزری ہوئی ساری صعوبتیں بھول جاؤں۔ جو میر ہاتھوں کے چھالوں اور میرے پاؤں کے زخموں پر اپنی نرم باتوں سے مرہم رکھ دے جو میرے میں چھپے سارے کانٹے نکال دے اور جب میں نے سوچا کہ ایسا ساتھی کون ہو سکتا ہے تو میری آپ پر پڑی۔ آپ مائنڈ نہ کیجیے گا خوشنود! میرے دل نے یہ تمنا کی ہے لیکن آپ کی مرضی آپ کی خواہش بہرحال اہمیت رکھتی ہے۔“

اس نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا لیکن میں نے سنا نہیں میں تو حیرت سے اسے دیکھ ر میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھ سے کبھی کوئی اس طرح بات کرے گا۔ میں تو اپنے آپ کو امانت سمجھتی تھی اور شاید یہ میرا پاگل پن ہی تھا کہ میں سمجھتی تھی کہ ہر مرد جانتا ہو گا کہ میں امانت ہوں۔

”ہیلو مدثر! تم کہیں جا رہے تھے۔ میں تمہاری طرف ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ معظم کی بہت فکر ہے مجھے۔ کوئی فون نمبر ایسا ہو جہاں اسے ٹریس کیا جا سکے۔“

”یہ آواز...... یہ آواز......“

میں تڑپ کر مڑی مکرم سے میری نظریں ملیں اور مکرم کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا یا مجھے گمان ہوا تھا۔

یہ دوسری بار تھی۔

میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مکرم کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا کہتے ہوں گے۔ میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ لیکن میں نے بڑی ہمت سے خود کو سنبھالے رکھا۔

”نودی! تم آج سکول نہیں گئیں۔“

مکرم جب بولے تو ان کی آواز میں بڑا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ کوئی بے چینی یا اضطراب نہیں۔

”نہیں سکول سے سیدھی ادھر آئی تھی فرحین کے ساتھ۔ نوشین سے ملنا تھا لیکن وہ گھر پر نہیں ہے اس لیے واپس جا رہی ہوں۔“

میں نے بمشکل خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور گیٹ ہاتھ سے ہٹایا۔

”نوشین آئی تو میں بتا دوں گا۔“

مدثر نے شاید میری گھبراہٹ محسوس کر لی تھی پھر وہ مکرم کی طرف مڑ گیا۔

”آؤ مکرم......“

”لیکن تم شاید کہیں جا رہے تھے۔“

”نہیں میں تو یونہی گیٹ تک آیا تھا۔ خوشنود کے ساتھ باتیں کرتا ہوا۔“

مدثر نے سادگی سے کہا اور میں لرزتی ٹانگوں سے ڈولتی ہوئی واپس مڑی۔

بے بی نے میری اڑی اڑی رنگت دیکھی۔

”کیا ہوا؟“

اور میں نے اسے تفصیل بتا دی۔

”مدثر نے تمہیں پرپوز کیا؟“

”ہاں......“ میں نے مری مری آواز میں کہا۔

”پتا نہیں اسے مجھ میں کیا نظر آیا ہو۔“

”ارے نودی! تجھے نہیں پتا تو کیا ہے۔ اتنی ڈھیروں خوبصورتیوں کے ساتھ تجھے مدثر کے سامنے جانا ہی نہیں تھا۔ تُو سچ مچ بہت خوبصورت ہے نودی! بہت حسین اور تجھے پتا ہی نہیں۔“

”مگر میں تو......“ میں بے چینی سے انگلیاں مسلتی رہی۔

”مجھے پتا ہے کہ تم......“

بے بی ہنسنے لگی۔

”اور تُو فکر کیوں کرتی ہے بھئی۔ مدثر کو انگوٹھا دکھا دیا جائے گا کہ یہ محترمہ ریز رو ہیں۔ آ
سے نہیں پیدا ہوتے ہی ان کو اسیر کر لیا گیا تھا۔“

”لیکن بے بی! وہ مکرم...... مکرم کیا سوچیں گے۔“

”جب کچھ سوچیں گے تب دیکھا جائے گا۔“

بے بی نے لاپروائی سے کہا۔

”ہاں...... تب دیکھا جائے گا۔“

میں نے خود کو تسلی دی۔

”کیا بات ہے آخر...... میں یونہی پریشان ہو جاتی ہوں۔ آخر مدثر مجھ سے بات ہی تو کر
تھا۔ اور میں کوئی اس سے ملنے تو گئی نہیں تھی۔ نوشین سے ملنے گئی تھی اور مدثر نے کچھ کہا بھی تھا، تو
اس کی اپنی سوچ تھی اور بھلا میں نے تو اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ میرے لیے ایسا سوچے اور یو
بظاہر میں نے خود کو مطمئن کر لیا تھا لیکن اندر سے کبھی کبھی بے چین ہو جاتی تھی۔

● ○ ●

اس روز کے بعد سے میرا مدثر سے کبھی سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ ایک دوبارہ وہ گھر آیا بھی تو
جان بوجھ کر کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بے بی نے بھی تو کہا تھا نا کہ اس بے چارے کا کیا قصور، تو
ڈھیر ساری خوبصورتیوں کے ساتھ اس کے سامنے جائے گی تو بے چارے کا ایمان متزلزل ہو
نہیں۔ سو میں کبھی اس کی موجودگی میں کمرے سے باہر نہ نکلی۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا ک
نے میری خاموشی سے خود ہی کوئی مطلب اخذ کر لیا ہوگا۔

اس روز میں بہت مطمئن بہت خوش ہولے ہولے گنگناتی ہوئی کچن سے باہر آ رہی تھ
مکرم نے کمرے سے باہر نکل کر مجھے آواز دی۔

”نودی! ذرا فارغ ہو کر میری بات سننا۔“

آج چھٹی تھی۔ مکرم گھر پر تھے۔ احسن اور بادل اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ کاظم
باہر گیا تھا۔ بے بی اور گڑیا کچن میں مصروف تھیں۔ میں تو فارغ ہی تھی اس لیے فوراً ہی چلی
مکرم کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”بیٹھ جاؤ نودی!“

یکایک میرا دل دھڑکنے لگا۔

مکرم بہت سنجیدہ تھے اور ان کی آنکھیں...... پتا نہیں کیا تھا۔ ان آنکھوں میں...... ملال......
دکھ اور رنج۔

”کہیں...... عظمی!“

میں نے گھبرا کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”عظمی تو ٹھیک ہے نا...... اس کی کوئی خبر ملی؟“

”ٹھیک ہے۔ کل ہی تو اس کا خط آیا تھا۔ پڑھا نہیں تھا تم نے......“

”پڑھا تھا۔“

میں نے آہستگی سے کہا۔

”مگر خیریت ہے نا سب؟“

”ہاں......“ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔

”بات یہ ہے نودی کہ......“

وہ ذرا سا ٹھہرے اور مجھے دیکھنے لگے۔

”مدثر بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت ذہین اور سمجھدار احساس اور نرم دل۔ اس کی فیملی اچھی
ہے۔ وہ خود......“

”یہ سب مکرم مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“ میں نے حیران ہو کر سوچا۔

”نودی! مدثر نے بڑی محنت کی ہے۔ ان بارہ سالوں میں پردیس کی صعوبتیں برداشت
کیں۔ بہت کچھ کمایا۔ اب اس کے پاس وہ سب کچھ ہے، جس کی کوئی تمنا کر سکتا ہے۔ وہ......“

دفعتاً کسی نے مجھے سوئیاں چبھو دیں۔

یہ سب...... یہ سب تمہید......

میں نے گھبرا کر مکرم کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں جھکائے ہوئے ہولے ہولے بول رہے تھے۔

”نودی! مدثر نے تمہیں پروپوز کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں۔ تمہارے لیے وہ بہت مناسب
ہے اور تم بھی اس کے لیے بہت مناسب اور موزوں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم......“

"نہیں......نہیں۔"

میں نے چیخنا چاہا۔مکرم کو روکنا چاہا۔کہ وہ مجھے اس جرم کی یہ اتنی بڑی سزا نہ دیں، جو مَیں نے نہیں کیا تھا۔لیکن میرا جسم پتھر کا ہو گیا تھا اور میں ساکت بیٹھی تھی۔

"اس یقین کے باوجود کہ تم مدثر کے ساتھ خوش رہو گی۔میں نے مدثر کو کوئی جواب نہیں د میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔میں تم پر کسی پر کوئی زبردستی، کوئی جبر نہیں کرنا چاہتا ہوں۔مَیں تمہیں تمہاری من چاہی زندگی دینا چاہتا ہوں۔میں بابا اور چاچا کی روح کے سامنے شرمسار نہ ہونا چاہتا۔مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل سے وہ خوش ہوں گے کہ یہ تمہاری خوشی ہے۔"

"نہیں......نہیں ہے یہ میری خوشی......تم نے غلط جانا یا غلط سمجھا مکرم۔"

میں نے کہا لیکن میری آواز میرے اندر ہی کہیں چکرا کر گم ہو گئی۔مجھے لگا جیسے میرا دل

ہو جائے گا۔

جیسے ابھی لمحوں میں دنیا ختم ہو جائے گی۔

"بے بی......بے بی کہاں ہو تم؟"

میں نے اسے بے آواز پکارا۔

"آؤ اور مکرم کو بتاؤ کہ وہ سب غلط تھا محض دھوکا نظر کا فریب۔ظاہر کی آنکھ سے م دیکھو۔"

"بولو نا نودی! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔جانتا ہوں، پھر بھی تمہاری زبان سے چاہتا ہوں۔"

مجھے لگا جیسے میرے حواس معطل ہو رہے ہوں اور توانائی ختم ہو رہی ہو۔میں نے توانائیاں یکجا کر کے انہیں بتانا چاہا کہ یہ سب جھوٹ ہے، جو تم نے سمجھا مکرم......مگر میرے ح میرا ساتھ چھوڑ گئے اور میرے اردگرد اندھیرا پھیلتا گیا اور پھر نہ جانے کتنی دیر ہو گئی۔مجھے پ نہیں شاید ایک پوری رات گزر گئی تھی یا اس سے بھی زیادہ وقت گزرا تھا۔جب میری آنکھ کھلی سب میرے اردگرد بیٹھے تھے۔دادی جان مجھ پر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔بے بی کے میرے چہرے پر گر رہے تھے۔مکرم، کاظم، احسن اور بادل سب ہی وہاں تھے۔میں مکرم کے تھی۔میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی یہ میرا کمرہ نہیں تھا میں یہاں کیسے۔

"نودی! نودی! لیٹی رہو پلیز۔"

بے بی نے مجھے لٹانا چاہا۔

"کیا ہوا ہے مجھے؟ اور تم سب لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہو۔"

"کچھ نہیں۔"

بے بی نے اپنے آنسو پونچھے۔

"یونہی تمہیں چکر آ گیا تھا۔"

دادی جان نے میری پیشانی چومی اور شکرانے کے نفل ادا کرنے باہر چلی گئیں۔

"چکر آ گیا تھا۔مگر اب تو میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے اور سوچا مکرم کو آرام کرنا ہو گا۔وہ ڈسٹرب ہو رہے ہوں گے۔اتنی محنت کرتے ہیں۔تھکے ہوئے آتے ہیں اور میں مزے سے ان کے بیڈ پر قبضہ جمائے ٹھی ہوں مگر مجھے چکر کیوں آ گیا تھا۔میں یہاں کیوں آئی تھی شاید......ہاں مکرم نے ہی بلایا تھا ر پھر مجھے ساری بات یاد آ گئی۔

"نہیں......"

میں نے پاس بیٹھی بے بی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور میرا رنگ خطرناک حد تک زرد پڑ یا۔میری نگاہیں مکرم کی طرف اٹھیں، وہ سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کے چہرے سے پریشانی لک رہی تھی۔

تو یہ شخص......یہ شخص جسے بچپن سے دل ہی دل میں پوجتی چلی آ رہی ہوں اور جس کے علاوہ ی اور شخص کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا۔اس کے دل میں میرا رتی بھر خیال نہیں اور انے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔کیا میں اس سے کہہ سکوں گی۔بتا سکوں گی کہ ......میں اور میں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی زور زور سے اونچا اونچا۔

"نودی! نودی! حوصلہ کرو بھئی کیا ہوا ہے؟ ارے پاگل لڑکی سب ٹھیک ہے۔"

بے بی نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا لیکن میں روئے چلی گئی۔

بادل نے اشارہ کیا کہ وہ مجھے رونے دے اور میں روتی رہی۔بہت دیر بعد بے بی نے ے کان میں سرگوشی کی۔

"خدا کے لیے نودی! اب بس کرو۔ خوانخواہ روئے جا رہی ہو۔"

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"سب ٹھیک ہے نا۔"

بے بی نے پھر کہا تو میں نے چڑ کر سوچا کہ یونہی سب ٹھیک ہے کی رٹ لگائے جا رہی ہے اسے کیا خبر کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مکرم نے میرے لیے کیا سوچا ہے اور اگر مکرم نے میرے لیے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو کیا میں ان کے فیصلے کو رد کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ مکرم جن کے، پر ڈھیروں احسان ہیں۔

"تمہیں نہیں پتا بے بی! نہیں پتا۔"

آنسو پھر میری پلکوں پر آ کر اکٹھے ہو گئے۔

"سب پتا ہے مجھے......" وہ مسکرائی۔

اور اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے حوصلہ دیا۔

"سب کچھ تیری مرضی سے ہی ہو گا اور بے وقوف بھلا میرے ہوتے ہوئے یہ ممکن۔"

تو......تو بے بی کو سب پتا ہے مگر کیسے۔

میں نے حیران ہو کر سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے......ارے کہاں جا رہی ہو۔"

بادل نے بے اختیار پوچھا۔

"یہیں آرام کرو۔"

"نیم حکیم صاحب! ہم اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔"

بے بی نے شوخی سے کہا۔

"اور اب تم لوگ بھی کچھ آرام کر لو۔ رات بھر جاگتے رہے ہو۔"

"ہاں......" مکرم نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں جھ ہوئے بولے۔

"احسن، کاظم، بادل جاؤ کچھ دیر آرام کر لو۔"

"تو کیا میں رات بھر......"

"ہاں......"

بے بی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔

"پوری رات محترمہ بے ہوش رہیں اور بے ہوشی میں جو انکشافات محترمہ نے کیے۔"

"کیا کہا......کیا کہا میں نے؟"

"بہت کچھ......"

بے بی نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر شرارت سے مجھے دیکھا۔

"بے چارے مکرم بھائی ان انکشافات کی زد میں تھے۔ اگر تمہیں مدثر پسند نہیں تھے تو بھئی صاف صاف کہہ دیا ہوتا مکرم سے، اتنا بے ہوش ہونے اور سب کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اوہ......" میں شرمندہ ہو گئی۔

"کیا کہتے ہوں گے مکرم کہ میں۔"

"اف اللہ۔"

مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ میں اتنی کم حوصلہ کیوں ہوں اور مارے شرمندگی کے میں کئی دن تک مکرم کے سامنے نہ گئی۔ مگر اس روز جب میں سکول جانے کے لیے باہر نکلی تو مکرم بھی آفس جانے کے لیے باہر نکل رہے تھے مجھے دیکھ کر رک گئے۔

"کیسی ہو نودی؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

میری نگاہیں جھک گئیں۔

"نودی!" وہ بالکل میرے قریب کھڑے تھے۔ "سوری"

میری پلکیں لرزنے لگیں۔

"میں......نودی! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم......میرا خیال تھا کہ مدثر......وہ اچھا لڑکا تھا، ایسا......"

"پلیز......" میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"میں نے......بلکہ دادی جان نے اسے منع کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ......"

"تھینک یو نودی......"

شاید مکرم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کریں۔

"اس روز اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔"

وہ ہولے ہولے بولتے ہوئے میرے ساتھ ہی گیٹ سے باہر نکل آئے۔

"شاید تم نہیں جانتیں نودی کہ میرے لیے...... خود میرے لیے بھی یہ کتنا مشکل تھا۔ اس طرح کا کوئی فیصلہ کرنا لیکن تمہارے لیے، تم لوگوں کی خوشیوں کے لیے میں اپنی ہر خوشی کو خود اپنے ہی ہاتھوں قتل کر سکتا ہوں۔"

پہلی بار...... مکرم نے مجھ سے اس طرح سے کوئی بات کی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی ہوں۔ جیسے عمر بھر کی ریاضت کا صلہ مجھے مل گیا ہو۔ کتنے سارے دن میں سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہی۔

میرا وجود ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ سکول میں مجھ پر جو ڈیپریشن طاری رہتا تھا۔ وہ بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ بھئی اگر سکول کا نظام غلط ہے تو مجھے کیا۔ میں کیوں خوامخواہ کڑھتی رہوں۔ اگر بے چارے ربانی صاحب کو ایم اے ہسٹری ہونے کے باوجود میتھ ریاضی پڑھانا پڑتا ہے تو مجھے کیا۔

زندگی ایک دم سے بہت مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے دو تین ٹیوشنز بھی مل گئی تھیں۔ گڑیا کالج جانے لگی تھی۔ بے بی نے بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ جدوجہد کر رہے تھے۔

معظم کبھی کبھار کوئی خط لکھ دیتا تھا۔ وہ کیا کر رہا تھا۔ کس حال میں تھا کچھ خبر نہ تھی۔ خط میں صرف دو لفظ خیریت کے لکھے ہوتے۔ ہم سب اس کے لیے اداس ہوتے تھے اس کے لیے سوچتے تھے، لیکن وہ ہم سب سے دور چلا گیا تھا۔

● ○ ●

کاظم کو اچھی جاب ملی تو دادی جان نے نہ صرف یہ کہ ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کر ڈالی بلکہ اس تقریب میں اعلان کر دیا کہ وہ بہت جلد ہم تینوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں سب نے ہی تائید کی۔ مکرم کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کاظم نے روک دیا۔

"جناب! کچھ ہمارا بھی فرض ہے۔ بہت ذمہ داریاں نبھائیں آپ نے......"

"لیکن میری خواہش تھی کہ بادل ڈاکٹر بن جاتا اور گڑیا کی تعلیم مکمل ہو جاتی تو تب میں

اپنے لیے کچھ سوچتا۔"

لیکن کسی نے مکرم کی بات نہیں سنی اور اس تقریب کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی میں اور مکرم ایک ہو گئے۔ اس لمحے معظم بہت یاد آیا۔ معظم نے میری شادی پر کافی رقم بھجوائی تھی۔ دادی جان نے اسے لکھا تھا کہ وہ جلدی آ جائے تاکہ وہ گڑیا کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔

بے بی کی شادی بادل کے ڈاکٹر بننے کے بعد ٹھہری تھی۔

زندگی میں ایک بہت حسن پیدا ہو گیا تھا۔ مکرم نے پارٹ ٹائم جاب چھوڑ دی تھی۔ احسن کو بھی جاب مل گئی تھی۔

گھر میں خوشحالی آ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں کارپٹ ڈلوا دیا گیا تھا۔ نیا صوفہ خریدا گیا تھا اور صحن میں دو نئے کمرے بنوا لیے گئے تھے جس کی تعمیر کے بعد میں اور مکرم ادھر منتقل ہو گئے تھے۔

مجھے نسبتاً ایک اچھے سکول میں جاب مل گئی تھی۔ تنخواہ بھی زیادہ تھی۔

زندگی میں کہیں کوئی کمی کوئی دکھ محسوس نہیں ہوتا تھا ہاں کبھی کبھی معظم کا خیال کر کے ایک کسک سی ہوتی تھی۔ وہ جانے پردیس میں کہاں دھکے کھا رہا تھا۔ بہت سارے دنوں سے اس کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ زندگی واقعی مشکل تھی یا اس نے خود ہی زندگی کو اپنے لیے مشکل بنا لیا تھا۔

کئی بار میں نے سوچا تھا اگر وہ رک جاتا تو ممکن ہے زندگی ہی اس کے لیے سہل ہو جاتی۔

اب سب ٹھیک تو ہو گیا تھا۔ مشکل وقت گزر گیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ مگر عظمی سب کو یاد آتا تھا بے تحاشا گڑیا کی پلکیں تو ہر وقت بھیگی رہتیں۔ خاموش کم گو سی گڑیا کسی سے اپنا درد نہ کہتی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ کون سا درد اس کے دل کو چبھتا رہتا ہے۔ مگر میرے پاس اس کے درد کا درماں نہ تھا۔

کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتی۔ مگر عظمی جانے کہاں تھا مکرم نے مدثر کو بھی خط لکھا تھا لیکن مدثر نے کہا تھا کہ جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا وہاں اس نے دیکھ لیا۔ زندگی میں بہت کچھ تھا لیکن کہیں کوئی کمی ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی بہت قیمتی متاع کھو گئی ہو۔ ایک عظمی کے چلے جانے سے زندگی کے سارے رنگ ماند پڑ گئے تھے۔ کوئی بھی کسی بھی خوشی کو بھرپور طور پر انجوائے کر سکتا تھا۔

بادل نے ہاؤس جاب مکمل کرلیا تو بے بی اور وہ ایک بندھن میں بندھ گئے۔احسن اور
کی منگنی کردی گئی لیکن گڑیا شادی کے ذکر پر رو پڑتی۔اس کے لیے ایک دو پروپوزل آئے ہو
تھے۔

''کب تک انتظار کرو گی گڑیا؟''

مکرم نے سمجھایا۔

مگر کم گو سی گڑیا شادی کے لیے تیار نہ ہوئی۔

دادی جان بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتے، باتیں کرتے رو پڑتیں۔

''میرا عظمی پتا نہیں کہاں ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟''

''وہ تو اتنا نازک مزاج تھا پتا نہیں۔''

گھر میں عظمی کی پسند کی کوئی چیز پکتی تو دادی جان کھانے کی ٹیبل سے اٹھ جاتیں۔

''پتا نہیں میرے عظمی نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔''

مکرم نے بہت کوشش کی تھی کہ کہیں سے اس کی کوئی خبر ملے۔مگر پتا نہیں وہ اس بھر
میں کہاں کھو گیا تھا اور گڑیا آس کا دیا جلائے اس کی راہ تکتی تھی۔

کبھی کبھی میں سوچتی شاید اس کا انتظار کبھی ختم نہ ہوگا۔

شاید عظمی اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

شاید وہ اجنبی زمینوں کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا تھا۔

اور اب اسے راستہ نہیں مل رہا تھا مگر گڑیا کا یقین پختہ تھا۔

''نودی! مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔وہ آئے یا نہ۔''

اور پھر وہ آ ہی گیا۔کتنے سارے سالوں بعد تھکا ہوا اور نڈھال سا سب کی آنکھیں آنس
سے بھر گئیں اور میں نے چھو کر اسے دیکھا۔

''یہ تم ہی ہو نا عظمی! کہیں میری آنکھیں خواب تو نہیں دیکھ رہیں۔''

''نودی! میں نے تمہیں...... تم سب کو بہت مس کیا۔''

''لیکن تم کہاں کھو گئے تھے عظمی؟''

بے بی اس کے بازو سے لپٹی۔دھواں دھار رو رہی تھی۔

''کھو ہی گیا تھا بے بی! یوں سمجھ لو مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔اس دنیا میں بڑی بھول بھلیاں ہیں بڑے پیچ وخم ہیں اور راستے بڑے ٹیڑھے میڑھے ہیں۔میں بھی الجھ گیا تھا۔لوٹنا تو چاہتا تھا مگر آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔دکھائی نہیں پڑتا تھا۔''

''تم ہمیں بلاتے عظمی! ہمیں پکارتے تو ہم سب تمہیں ان بھول بھلیوں سے نکال لاتے۔''

بے بی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں تو ندامتوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا بے بی تمہیں کیسے پکارتا۔میں نے تو بڑے دعوے کیے تھے مگر......''

''چھوڑو یار! اب تم آ گئے ہو تو سب ٹھیک ہے۔''

کاظم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''دیکھو گھر میں کتنی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ڈرائنگ روم میں تمہاری پسند کا فرنیچر اور قالین ہے، یہ ٹی وی لاؤنج ہے وہ اُدھر دونوں کمرے نودی اور مکرم کے ہیں، دوسری منزل پہ دونوں کمرے بے بی اور بادل کے ہیں۔بادل کو اگرچہ ہاسپٹل کے قریب گھر مل گیا ہے لیکن وہ گیا نہیں۔کاظم نے گاڑی لے لی ہے۔یہی سب چاہتے تھے نا تم تو یہ سب ہے۔بس تم نہیں تھے تو ہر خوشی ادھوری تھی۔اب تم آ گئے ہو تو......''

''مگر میں تو خالی ہاتھ ہی ہوں تہی داماں۔''

''تم ہمیں ہر طرح سے قبول ہو بابا۔''

احسن نے شوخی سے کہا۔

''کیوں گڑیا؟''

گڑیا کے سانولے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔عظمی کی نگاہیں اس پر تھیں۔

''یار اتنے سارے سال تم کیا کرتے رہے ہو؟''

''بہت لمبی کہانی ہے بہت طویل داستان ہے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت کچھ گنوا دیا۔میں نے کہا نا تمہیں یہ کہ مجھے تم تک آنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔میں نے کئی بار تمہیں بے آواز پکارا مگر پتا تھا کہ میری آواز تم تک نہیں پہنچ سکتی۔''

''اے گڑیا چائے بناؤ۔''

مکرم نے گڑیا سے کہا تا کہ موضوع بدل دیا جائے۔

''عظمی! تمہیں گڑیا کی چائے تو یاد آتی ہو گی۔''

''ہاں......'' پہلی بار معظم مسکرایا۔

''بہت......اور مجھے سب سے زیادہ خوف گڑیا کا تھا کہ یہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

''اور جناب! یہ وہ واحد ہستی ہے جو تم سے ناراض ہوئی ہی نہیں اور جسے پورا یقین تھا ضرور آؤ گے۔''

''اور شاید یہی یقین مجھے واپس لے آیا۔ ورنہ کئی بار میرا دل چاہا کہ اپنے آپ کو ہمیشہ لیے گم کر دوں۔''

''جو گزر گیا۔ سو گزر گیا عظمی! یہ بتاؤ تمہاری شاعری کہاں تک پہنچی۔ بہت کچھ تخلیق کیا گا۔''

احسن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں لکھا، زندگی کی مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہ دی۔ ہاں وہ ایک ادھوری ضرور مکمل کی۔ جس روز وہ نظم مکمل ہوئی اس سے اگلے دن میں نے روزی کو، اس ملک کو سب چھوڑ دیا۔''

''پھر تو اس نظم کو فریم کروا کے ڈرائنگ روم میں لگائیں گے۔''

''سنو عظمی! وہ سارے رشتے جو تم توڑ کے آئے ہو اور وہ سارے تعلق جو تم ختم کر آ ان کا ذکر کبھی گڑیا سے نہ کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یقین جس کے سہارے اس نے اتنے سال دیئے ہیں۔ اس میں دراڑیں پڑ جائیں۔''

مکرم نے بہت آہستگی سے معظم سے کہا اور معظم نے سر جھکا لیا۔

''وہ نظم......''

بے بی نے پوچھا۔

معظم نے اپنے سفری بیگ سے سیاہ ڈائری نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

''واہ......''

بے بی نے بلند آواز سے نظم پڑھتے ہوئے کہا۔

میں اور وطن سے بہت دور جا کر بھی بھول کر بھی نہ سوچا کہ میرے وطن کو ضرورت ہے میری۔

مگر آج جب۔
ایک ننھے سے بچے کہ کہنے پر میں
''حب الوطنی'' پہ چند جملے لکھنے لگا ہوں۔
تو جانے کہاں سے کوئی مہک سی آ کے مہکا گئی ہے۔
کوری مٹی کے پیالوں میں بھیگے گلابوں کی خوشبو ہے۔
یا آسمانوں سے آتی ہوئی مہک ہے۔
یہ مہک میری دھرتی کی مانوس سی یہ مہک
اجنبی دیس میں مجھ کو تڑپا گئی
اور میں......
جو اجنبی سرزمینوں میں یوں کھو گیا تھا
کہ کوئی بھی بلاوا، کوئی بھی سندیسہ
مجھے چھو نہ جائے
مجھے ساحلوں کی طرف لے نہ آئے
سوچتا ہوں
بھگوئی ہوئی خشک روٹی کی لذت تو کچھ اور تھی
کٹلس وسینڈوچ اس پہ قربان ہوں
اور منہ میں میرے کٹلس وسینڈوچ بے مزا ہو گئے۔''

''ارے وہ مدثر ملے تھے، آپ کو؟ کیسے ہیں؟''

احسن نے اچانک پوچھ لیا۔ اس کی عادت تھی۔ وہ یونہی بیچ میں ٹوک دیتا تھا۔ بے بی نے ا سامنہ بنایا۔

''نظم تو پوری سنانے دیتے۔''

''سنا لیا نا......ہاں تو عظمی بتاؤ نا۔''

"آتے ہوئے مدثر سے ملا تھا۔"

"کیسے ہیں وہ؟" مکرم نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک اور خوش۔ ان کی بیوی بہت اچھی ہے اور وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہیں ایک دو ماہ تک آئیں گے پاکستان۔"

"اوہ......" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

پتا نہیں کیوں میرے دل پر ایک بوجھ سا رہتا تھا۔ حالانکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا لیکن پھر بھی جب کبھی نوشین ذکر کرتی تھی کہ مدثر شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتے تو میں خود کو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم سمجھنے لگتی تھی اور ابھی چند ماہ پہلے ہی نوشین نے بتایا تھا کہ مدثر نے وہاں پر کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔

"ان کی بیوی مسلمان ہے کیا؟"

میں نے ڈائری بے بی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......مصری ہے۔"

معظم نے بتایا اور اٹھ کر گڑیا کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔

اور میں معظم کی نظم کا آخری بند پڑھتے ہوئے سوچنے لگی کہ معظم نے کتنا صحیح لکھا ہے کہ

اے وطن تو نے جب بھی پکارا مجھے
لوٹ آؤں گا میں
کہ کوئی حرف بھی
حرف آخر نہیں......

● ○ ●

"زہرا......میری اپنی زہرا!"

خدا تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تمہارا دامن تنگ پڑ جائے۔

میں آج بہت دنوں بعد تم سے مخاطب ہو رہی ہوں جب سے تم لاہور گئی ہو میں نے کوئی دو یا تین خط لکھے ہیں اور خط لکھنے کی تو میں ہمیشہ سے چور ہوں تمہیں پتا ہی ہے جن دنوں

لاہور پڑھنے گئی تھیں تو کتنا ناراض ہوتی تھیں مجھ سے کہ میں ہر ہفتے تمہیں خط کیوں نہیں لکھتی لیکن پتا نہیں......مجھے خط لکھنا ہمیشہ ہی بہت مشکل کام کیوں لگتا ہے۔ شاید اور بہت سی باتوں کی طرح مجھے خط لکھنے کا بھی قرینہ نہیں آتا۔ حالانکہ تمہارے لاہور جانے سے میں بہت تنہا ہو گئی تھی۔

میں جو اپنی ہر صبح کا آغاز تم سے فون پر بات کر کے کرتی تھی مجھے لگتا تھا میں تمہارے جانے سے خالی خالی ہو گئی ہوں دن میں دو تین بار تمہیں فون کر کے بات کرنا جیسے میرے معمولات زندگی میں شامل تھا اور تمہارے جانے کے بعد میں کتنے ہی دن بولائی بولائی پھرتی رہی تھی پھر تمہارا خط آ گیا......اور تم نے لکھا کہ جس نئے گھر میں تم ہو وہاں فی الحال فون نہیں ہے اور سفیان بھائی کوشش کر رہے ہیں کہ جلد فون لگ جائے یا پھر موبائل کنکشن لے لیں لیکن زہرا ان چھ ماہ میں نہ تو فون لگا اور نہ ہی سفیان بھائی کو اتنی فرصت ملی کہ وہ موبائل لے لیں۔ تم نے لکھا تھا کہ وہ آفس کے کاموں میں بہت مصروف رہتے ہیں اور اکثر رات کو دیر سے گھر آتے ہیں سچی زہرا میں تو تمہاری آواز سننے کو ترس گئی ہوں اور تمہیں شاید ہنسی آئے گی کہ میں ہر نماز کے بعد بہت باقاعدگی سے دعا مانگتی ہوں کہ تمہارے گھر فون لگ جائے ان چھ ماہ میں صرف ایک بار میں نے تمہاری آواز سنی جب تم نے پی سی او سے مجھے فون کیا تھا۔

تم میرے لیے پریشان ہو رہی تھیں کہ تم نے خواب میں مجھے پریشان دیکھا تھا......اور کبھی کبھی خوابوں کی تعبیریں کتنی سچی ہوتی ہیں زہرا! تب تو میں پریشان نہ تھی لیکن آج کتنی پریشان ہوں تین دن سے میں نے پلک تک نہیں جھپکی اور کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی اور ان تین دنوں میں تمہیں میں نے بہت یاد کیا ہے۔

کاش تم یہاں ہوتیں زہرا! ابھی کچھ دیر پہلے ہی علی تمہارا خط پھینک کر گیا ہے اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں ذرا سا دروازہ کھول کر بیڈ پر خط پھینکا اور چلا گیا ہاں زہرا! علی نے......اس نے مجھے دیکھا تک نہیں بات تک نہیں کی......ہاں زہرا......علی......میرا اپنا بیٹا میرے وجود کا حصہ حالانکہ پہلے جب کبھی تمہارا خط آتا تھا وہ دور سے ہی شور مچاتا ہاتھوں میں خط لہراتا ہوا آتا تھا۔

"ماما......ماما زہرا خالہ کا خط" اور پھر سارا ٹائم میرے کندھے پر سے لٹک کر تمہارا خط پڑھتا تھا......اور جب میں خط بند کر کے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی تو چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے وہ بھی مسکرا دیتا۔

"ماما زہرا آنٹی کب آئیں گی؟ ماما چھٹیوں میں ہم زہرا خالہ کی طرف چلیں گے ہیں نا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں تو خود تم سے ملنے کو بے تاب ہو رہی تھی اور تم نے بھی تو لاہور کر صرف تین چار خط ہی لکھے ہیں۔ تم بھی تو بہت مصروف ہو گئی ہونا...... نئے گھر کی سیٹنگ بچو کے ایڈمیشن ان کی اسٹڈی کے نخرے اور فرمائشیں۔ لیکن آج تو وہ دور سے ہی خط بیڈ پر پھینک چلا گیا کیا میرا وجود اتنا ہی قابل نفرت ہو گیا ہے زہرا!

میں نے تو اس کے ہاتھ میں خط دیکھتے ہی تمہاری تحریر کو پہچان لیا تھا تمہارے علاوہ مجھے لکھتا ہی کون ہے۔ انوار نے بھی کبھی مجھے خط نہیں لکھا۔ بہت شروع میں اس نے ایک دو خط لکھے تھے اور بس پھر فون پر ہی السلام علیکم وعلیکم السلام ہو جاتا ہے اسی لیے تو لفافہ دیکھتے ہی بغیر ا۔ ہاتھ لگائے میں نے جان لیا تھا کہ یہ تمہارا ہی خط ہے اور میری آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل گئی تھیں میں نے کانپتے ہاتھوں سے تمہارا خط کھولا تھا اور سوچا تھا شاید تم نے مجھے حوصلہ دیا ہو تسلی دی ہو اور شاید تمہارے لفظوں سے ان زخموں کو جن سے مسلسل خون رس رہا ہے مرہم مل جا۔

لیکن تم نے ہمیشہ کی طرح آنسو نہیں پونچھے تھے گلے نہیں لگایا تھا بس! ایک سوال کیا تھا پوچھا تھ

"مجھے یقین نہیں آتا لیکن کیا یہ سب سچ ہے صرف ہاں یا نہ کہہ دو پرسوں صبح جب اقدا مجھے فون پر بتایا یہ سب تب سے میں جیسے سکتے میں ہوں میں نے سوچا تمہیں فون کروں لیکن میں تم سے بات نہیں کر سکوں گی منّی صرف...... صرف یہ بتا دو کہ جو کچھ اقدار نے بتایا کیا سچ ہے۔

اور آنسوؤں کی دھند نے میری اور تمہاری تحریر کے درمیان پردہ سا کر دیا۔ میں تمہارے خط کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ مجھے پتا تھا کہ تمہیں سب خبر ہو گئی ہو گی اور میں نے سوچا تھا مجھے آسرا دو گی میرے آنسو پونچھو گی ہاں خالہ جان نے تو اسی وقت اقدار کو فون کر دیا تھا بلکہ ا کو ہی نہیں انوار کو بھی کر دیا ہو گا۔

پرسوں دس بجے کی ہی تو بات ہے نا...... اور پتا نہیں اس وقت امریکا میں کیا وقت ہوا ہ نہیں انوار سو رہا ہو گا یا...... لیکن خالہ جان کو صبر کہاں تھا اور تمہیں بھی خبر ہو گئی اور تم نے فون نہیں ورنہ شاید...... تمہاری آواز سنتے ہی میرا دل پھٹ جاتا...... اور ٹھیک تیسرے دن تمہارا خط مج گیا۔ زہرا تمہارا خط اس وقت بھی میرے سامنے پڑا ہے اور میں نے اسے کوئی بیس بار یا شاید بار پڑھا ہے اور اس میں لکھے گئے چند جملے مجھے ازبر ہو گئے ہیں۔

تم نے لکھا ہے "صرف ہاں یا نہ لکھ دو۔ میں تم سے تفصیل نہیں پوچھ رہی منوں۔ بس ہاں یا نہ" اور یہی کہنا بہت مشکل ہے زہرا! کہنے کو تو یہ ایک لفظ ہے۔ کاش...... تم نے کچھ نہ پوچھا ہوتا اور ہمیشہ کی طرح اپنی مہربان انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے ہوتے کچھ کہے بنا کچھ پوچھے بنا ...... لیکن تم نے تو مجھ سے سوال کیا ہے۔

صرف ہاں یا نہ......

اور اگر میں کہوں "ہاں" تو کیا میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔ تم جو میری سب سے زیادہ اپنی ہو میری دوست میری بہن میرا سب کچھ اور تم جو میری ہر کمزوری اور ہر خوبی سے آگاہ ہو تم جو ساری زندگی میری ڈھال بنی مجھے اپنے پیچھے چھپائے میرے حصے کے بھی زخم کھاتی رہی ہو۔

دنیا کی نظر میں شاید تم میری سوتیلی بہن ہو لوگ یہی کہتے ہیں نا کہ زہرا آمنہ کی سوتیلی بہن ہے...... حالانکہ دیکھا جائے تو میرا تو تمہارے ساتھ یہ رشتہ بھی نہیں بنتا۔ کوئی خونی تعلق نہیں جڑتا تم سے۔ نہ ماں کی طرف سے نہ باپ کی طرف سے۔ تم میری سوتیلی ماں کی بیٹی ہو جب تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو اُس کی بدزبانی کی وجہ سے طلاق دی تھی تو میری ماں مر چکی تھی اور میں چند ماہ کی تھی اور مجھے سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ تب سب کے مشورے سے میرے ابا نے تمہاری اماں سے شادی کر لی تھی۔ یوں تمہاری اماں تو میری اماں بن کر ہمارے گھر آ گئی تھیں اور تمہیں تمہارے ابا لے گئے تھے یہ کہہ کر کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹی سوتیلے باپ کے گھر میں رہے سگے باپ کے ہوتے ہوئے۔ اب پتا نہیں تمہاری اماں نے آسانی سے تمہیں تمہارے ابا کے حوالے کر دیا تھا یا جھگڑا کیا تھا مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں اپنے گھر میں اکیلی تھی اور تم اپنے ابا اور اپنی سوتیلی والدہ کے پاس رہتی تھیں۔

تمہاری اماں کو جب طلاق ہوئی تم چار سال کی تھیں اور جب تم پہلی بار ہمارے گھر آئی تھیں تمہاری عمر دس سال تھی اور میں تب چھ سال کی تھی میرا تم سے کوئی خونی رشتہ نہیں بنتا لیکن پھر بھی میرا اس بھری دنیا میں صرف تم...... تم ہی میری اپنی ہوتی کہ علی اور زارا سے بھی زیادہ میری اپنی۔

علی اور زارا...... جو میرے وجود کا حصہ ہیں...... اور تم...... جو میری کوئی نہیں ہو...... صرف سگی بہن! لیکن تم ساری زندگی میری ڈھال بنی رہیں۔ جب بھی مجھے کوئی چوٹ لگی زخم لگا میں

بھاگ کر تمہارے ہی پاس آئی اور تم نے ہمیشہ ہی مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ مجھ سے پوچھے بنا میرے زخموں پر مرہم رکھا۔

اور پتا ہے زہرا پرسوں جب خالہ جان نے مجھے بالوں سے پکڑ کر پورے صحن میں گھ مجھے تھپڑوں اور لاتوں سے مار رہی تھیں اور علی اور زارا میرے اپنے بچے میرے جسم کے ٹکڑ کھڑے نفرت اور غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ان کی عمریں ہی کتنی ہیں...... بارہ سال۔ میں نے ان کی طرف بالکل بھی نہیں دیکھا تھا بس سوچا تھا شاید تم ابھی کہیں سے آ اور خالہ جان کے ہاتھوں کو غصے سے جھٹک کر مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو گی بالکل ایسے پتا نہیں تمہیں یاد ہے یا نہیں لیکن میرے دل پر تو اُس روز کی یاد یوں کھد گئی ہے کہ زمانے تبدیل نے آج تک اسے مٹایا نہیں حالانکہ تب میری عمر ہی کتنی تھی یہی کوئی چھ سال۔

اُس روز یوں ہوا تھا کہ کاؤنٹر پر سے میں نے پانی پینے کے لیے گلاس اٹھانے کی کو تھی اور میری کہنی لگنے سے کاؤنٹر پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ میں تو ہمیشہ پلاسٹک کے گلاس میں ہی پانی پیتی تھی لیکن اماں نے سمجھا کہ میں ان کے خوبصورت سیٹ گلاس میں پانی پی رہی تھی حالانکہ انہوں نے مجھے منع کر رکھا تھا تب ہی تو وہ مجھے ڈانٹتے ہو مار بھی رہی تھیں چونکہ گلاس مجھ سے ٹوٹا تھا۔ جو میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا تھا پھر بھی میر تو تھی نا اس لیے میں بنا روئے مار کھائے جا رہی تھی اور اماں تو اکثر بغیر غلطی کے بھی دھمو کرتی تھیں۔ اور زہرا تمہارے ابا جو بہت نفیس اور پڑھے لکھے شخص تھے انہوں نے تمہاری ان کی بدزبانی کی وجہ سے طلاق دی تھی لیکن ان کی بدقسمتی کہ ان کی دوسری بیوی تمہاری اما زیادہ بدزبان تھیں گو وہ میٹرک تک تعلیم یافتہ بھی تھیں لیکن بقول تمہارے تعلیم نے ان کا بگاڑا تھا اور جب وہ آستینیں چڑھا کر گالیاں دیتی تھیں تو محلے والے بھی دبک جاتے تھے ایسی فصیح و بلیغ گالیاں کہ شاید ہی کسی نے اس سے پہلے دی ہوں۔

اور یاد ہے نا ایک بار تم نے کہا تھا کہ اگر گالیوں پر بھی ڈگری دی جاتی تو تم اپنی سوتیلی ماسٹر ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی سب ڈگریاں دے دیتیں...... اور تم نے یہ بھی تو بتایا تھ صرف گالیاں دینے میں ہی ایکسپرٹ نہ تھیں بلکہ مار پیٹ اور اذیت کے نئے نئے طری کرنے میں بھی پی ایچ ڈی سے کم نہ تھیں اور تمہارے ابا کی عدم موجودگی میں وہ یہ تمام طر

آزماتی تھیں اور اس صفائی سے تمہیں مارتی تھیں کہ بظاہر کچھ نشان ظاہر نہ ہوتے تھے لیکن کبھی کبھار اندازے کی غلطی سے نیل وغیرہ پڑ جاتے تو ابا کے...... استفسار پر فوراً جھوٹ بول دیتیں کہ گر پڑی تھی...... وغیرہ وغیرہ۔ تم نے گالیوں اور مار پیٹ میں ہی نہیں جھوٹ بولنے میں بھی انہیں ماسٹر کی ڈگری دے رکھی تھی اور تم اپنی سوتیلی اماں کے خوف سے کبھی ابا کو حقیقت نہیں بتا سکی تھیں۔

تمہاری اماں مجھے اس طرح اتنی بے دردی سے تو نہیں مارتی تھیں لیکن وقتاً فوقتاً طبع آزمائی کرتی رہتی تھیں اور پھر میری عمر ہی کتنی تھی چھ سال اور مجھے سگے سوتیلے کا فرق معلوم نہ تھا۔ میں نے تو آنکھ کھولتے ہی تمہاری اماں کو دیکھا تھا اور میرے لیے تو وہ صرف ماں تھیں شاید دوسری ماؤں کے مقابلے میں زیادہ ظالم اور سخت...... پر اس روز شاید اماں کو زیادہ غصہ آ رہا تھا یا وہ گلاس جو میرے ہاتھوں سے لگ کر ٹوٹ گیا تھا شاید زیادہ قیمتی تھا کہ وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر جھونٹا دیتیں اور پھر چٹاخ سے ایک تھپڑ میرے رخسار پر پڑتا یا پھر ربڑ کا بھاری جوتا میری کمر پر نشان ڈال دیتا میں خاموشی سے پٹ رہی تھی لیکن ایک بار جو اماں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تو میری چیخ نکل گئی اور تب ہی تم گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں اور پھر تیر کی طرح میری طرف لپکی تھیں اماں کا ہاتھ جھٹک کر مجھے یک دم اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا میں بھی یہ جانے بغیر کہ تم کون ہو چڑیا کے ننھے سے بچے کی طرح تم سے لپٹ گئی تھی اور اماں نے جو جوتا ہاتھ میں پکڑے حیرت سے تمہیں دیکھ رہی تھیں یکدم جوتا پھینک کر ''زہرا میری بچی'' کہتے ہوئے تمہیں گلے سے لگا لیا تھا۔

دراصل تمہارے ابا نے چھ سال تک تو کسی نہ کسی طرح تمہاری اس سوتیلی اماں کو برداشت کیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ کہیں کہ وہ بیویوں کے ساتھ نباہ ہی نہیں کر سکتے لیکن کب تک ایک روز اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے اور وہاں جانے کے تین ماہ بعد انہوں نے تمہاری سوتیلی اماں کو طلاق دے دی۔ تمہاری سوتیلی اماں کی کوئی اولاد نہ تھی سو وہ تو روتے پیٹتے میکے واپس چلی گئیں اور تمہاری پھوپی تمہیں اماں کے پاس لے آئیں۔

''سعید احمد امریکا سے آ گیا تو بھجوا دینا اے ہم کہاں پرائی اولاد کو سنبھالیں۔''

لیکن اب یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تمہارے ابا کبھی واپس نہیں آئے۔ اور تم ہمیشہ ہمارے ہی ہمارے گھر میں رہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اگر تم نہ ہوتیں۔ زہرا تو میں تو کب کی مر چکی ہوتی۔

میرے ابا کو تمہارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہ تھا گھر میں خوشحالی تھی کسی چیز کی کم
ابا کا ہول سیل کا کاروبار تھا اور وہ اکثر بہت دیر سے گھر آتے تھے۔انہوں نے تمہاری آمد پر
اتنا ہی کہا تھا۔

"آمنہ یہ تمہاری بڑی بہن ہے اب تمہارے کمرے میں ہی رہے گی۔"

اور تمہارے سر پر ہاتھ پھیر دیا تھا "تمہارا اپنا ہی گھر ہے اور یہ چھوٹی سی تمہاری بہن۔
کا خیال رکھنا۔"

اور تمہاری سیاہ گھور آنکھیں ایک دم چمکنے لگی تھیں۔میں نے مضبوطی سے تمہارا ہاتھ
تھا۔ابا میری طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔ابا شاذونادر ہی مسکراتے تھے اور اس روز ابا مجھے
اچھے لگے تھے بلکہ تمہیں بھی......تم نے کہا تھا زہرا۔

"تمہارے ابا بہت اچھے ہیں منوں! میرے ابا سے بھی اچھے......گو میرے ابا تمہا
سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں لیکن وہ تمہارے ابا جتنے اچھے نہیں ہیں......اور انہوں نے کبھی میر
پر ہاتھ نہیں پھیرا۔" تمہاری آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی تھی۔

"ہاں۔" میں نے خوشی سے کہا تھا۔"میرے ابا بہت اچھے ہیں اماں بھی اور تم بھی۔"
مجھے تو اس روز پتا نہیں کیوں کائنات کی ہر چیز اچھی لگ رہی تھی شاید تمہاری آمد کی وج

"حالانکہ اماں تو تمہیں مارتی بھی ہیں۔"

"ہاں تو مائیں کبھی کبھی کسی غلطی پر مار بھی دیتی ہیں مجھ سے گلاس بھی تو ٹوٹ گیا تھ
تمہارے ہونٹوں پر بڑی مدبر سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"تم بھی بہت اچھی ہو منوں!"

تم نے مجھے پہلی بار منوں کہہ کر بلایا تھا حالانکہ ابا اور اماں مجھے منّی کہتے تھے جو مجھے
کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ہاں کبھی کبھی ابا مجھے آمنہ کہہ کر بلاتے تو اچھا لگتا تھا لیکن اماں تو
چّتی کمبخت کہہ کر بلاتی تھیں تمہارا منوں کہنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

"اب تو میرے ابا ہی تمہارے ابا ہیں نا؟" میں نے جیسے تمہیں تسلی دی تھی تاکہ تم
کے اچھا نہ ہونے کا غم بھول جاؤ۔ "جیسے میری اماں تمہاری اماں۔"
تم نے کہا تھا اور تم نے اس بات کو فوراً قبول کرلیا تھا اور اس کے بعد تم نے ہمیشہ میر

ہی ابا کہا۔اور نئے ملنے والوں کو تو کبھی پتا نہ چل سکا کہ تم ابا کی حقیقی اولاد نہیں ہو اور ابا نے بھی تو
ہمیشہ تمہارا بہت خیال رکھا۔ایک جیسے کھلونے ایک جیسے کپڑے۔ہر ضرورت پوری کرنا انہوں نے
اپنا فرض سمجھا تھا۔تم اس پر ابا کی کتنی احسان مند رہتی تھیں اور اماں سے دھڑلے سے کہتی تھیں۔

"اماں ابا جیسا اچھا بندہ آپ کا نصیب ہے اس کے لیے آپ کو ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرنا
چاہیے اور منوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔"

اور اماں تمہاری اس بات پر کتنا چڑتی تھیں۔

"تو کیا اب تمہارے ابا کا بت بنا کر پوجنے لگوں اور تمہاری منی کو گود میں چڑھالوں" اماں
کی زبان کسی تیز دھاری چھری سے بھی زیادہ تیز تھی۔آج بھی جب میں اماں کی وہ باتیں سوچتی
ہوں جو تمہارے اور ان کے مابین میرے اور ابا کے متعلق ہوتی تھیں تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے وہ
اتنی ہی دلچسپ ہوتی تھیں۔

زہرا تمہاری آمد میرے لیے کیا تھی شاید میں کبھی اس کی وضاحت نہ کرسکوں اور تم بھی کبھی
نہ جان سکو۔

اُس روز جس طرح تم نے آکر مجھے اماں سے چھڑایا تھا۔وہ تو میں کبھی نہیں بھولی تھی اور
اب جب پرسوں خالہ جان کے جوتے تابڑ توڑ مجھ پر پڑ رہے تھے۔تو میں نے کتنی ہی بار امید بھری
نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھا تھا جیسے ابھی گیٹ کھلے گا تم بھاگتی ہوئی آؤ گی اور سب کی
ت بھری نظروں سے مجھے بچالو گی مجھے اس نفرت سے دور لے جاؤ گی جو زارا اور علی کی
ھوں سے جھانک رہی تھی۔

زارا سے مجھے کتنا پیار ہے علی سے بھی زیادہ اس لیے کہ میں نے اس کا نام تم سے ملتا جلتا رکھا
۔جب میں اسے پکارتی ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے میرے ہونٹ اسی مٹھاس میں بھیگ گئے ہیں
ایں بلاتے ہوئے میرے اندر اُتر آتی ہے۔پتہ ہے زہرا تم شاید ہنسو گی کیونکہ اس سے پہلے
نے کبھی تمہیں بتایا بھی نہیں کہ ان دنوں جب میں چھوٹی تھی شاید آٹھ یا نو سال کی تو جب تم
ل میں ہوتی تھیں یا میرے پاس نہیں ہوتی تھیں اماں کے پاس ہوتیں تو میں اکیلے کمرے میں
ے اُدھر چکراتے ہوئے بار بار تمہارا نام لیتی تھی۔

زہرا، زہرا......میں جتنی بار تمہارا نام لیتی اتنی ہی میری ہوس بڑھتی۔اور میرا جی چاہتا میں

تمہارا نام لیے جاؤں۔ اس کے بعد بھی جب تم پڑھنے کے لیے لاہور چلی گئی تھیں تب بھی جب تم مجھے بہت یاد آتیں تو میں تمہیں ہولے ہولے پکارتی رہتی اور تمہارے نام کو لکھ لکھ کر کاپی بھر دیتی۔ اس لیے تو جب میری بیٹی پیدا ہوئی تو میں نے اس کا نام زارا رکھا۔ حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کا نام زہرا ہی رکھوں.......... اور میری نند کتنے ہی دن مجھ سے ناراض رہی اس نے ماہم یا ماہین نام سوچ رکھا تھا۔ تب اس کی خفگی دور کرنے کے لیے انوار نے کہا تھا کہ ہم اس کا نام ماہین زارا رکھ دیتے ہیں۔ وہ خوش ہو گئی تھی لیکن میں نے کبھی اسے ماہین نہیں ہمیشہ زارا ہی کہہ کر بلایا جبکہ باقی سب گھر والے اسے ماہین کہتے ہیں۔

پتا ہے زہرا میں آس بھری نظروں سے دروازے کو دیکھتی رہی لیکن تم نہیں آئیں اور جان خود ہی تھک کر زارا اور علی کو ساتھ لے کر کمرے میں چلی گئیں اور میں سر جھکائے ناکام شرمندہ سی اپنے کمرے میں آ گئی اور تب سے تین دن ہو گئے ہیں میں اپنے کمرے سے باہر نکلی اور کسی نے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھا تک نہیں۔ حتیٰ کہ زارا اور علی نے بھی حالانکہ علی تو مجھ سے پیار کروائے بغیر اسکول جاتا ہی نہیں تھا میں کتنی بھی مصروف ہوں وہ میر سامنے آ کھڑا ہوتا زارا چیختی رہتی۔

"علی دیر ہو جائے گی جلدی کرو وین چلی جائے گی" لیکن وہ کھڑا رہتا جب تک میں ا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی نہیں چوم لیتی۔ وہ کھڑا رہتا اور پھر میری ہ جھک کر میری پیشانی پر اپنے لب رکھ دیتا اور خدا حافظ کہہ کر بھاگ جاتا لیکن اب تین دن نے کمرے میں جھانکا تک نہیں یوں ہی مجھ سے پیار کروائے بغیر چلا گیا زارا بھی تو دعا ک نہیں آئی وہ بھی تو ہر روز اسکول جانے سے پہلے کہتی تھی۔

"ماما دعا کیجئے گا۔ آج مجھے کسی ٹیچر سے ڈانٹ نہ پڑے۔ اور مجھے سب لیسن، اچھی یاد ہوں۔"

بس ملازمہ ہے جو خاموشی سے تینوں ٹائم کھانا رکھ جاتی ہے مجھ سے دو تین لقموں سے زیادہ کھایا نہیں گیا بس ان تین دنوں میں صرف چند لقمے اور چائے ہی پی ہے میں نے۔

خالہ جان خالو جان آصفہ عامرہ جو ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں تو آمنہ کے ہاتھوں کے کھانے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اب کسی اور کے ہاتھ کے پکے کھانے پسند ہی نہیں آتے

جو آصفہ کو چائے بنانی پڑ جاتی تو میرے سسر یعنی خالو جان تو صاف صاف کہہ دیتے۔

"بھئی آصفہ تمہارے جوشاندے کو پینے سے بہتر ہے کہ بس چائے پیوں ہی نہ...... چائے تو آمنہ بیٹی بناتی ہے کہ حلق تک سے خوشبو آتی ہے۔"

لیکن اب ان تین دنوں میں ایک بار بھی انہوں نے میرے کمرے میں آ کر یہ نہیں کہا کہ آمنہ اٹھو چائے بنا دو۔ اور نہ ہی آصفہ عامرہ نے کمرے میں آ کر کہا کہ میں کھانا بناؤں حتیٰ کہ اقدار نے بھی کمرے میں نہیں جھانکا حالانکہ اس کی عادت ہے جب بھی لاہور سے آتا ہے تو سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے۔

"بھابی جان! میں آ گیا ہوں اور میرے پاس صرف دو دن ہیں اور ان دو دنوں میں جتنے کھانے بھی میری پسند کے بنا سکتی ہیں بنا دیں تاکہ پھر پورے مہینے وہ بازار کے بدمزہ کھانے کھا سکوں۔" اور پھر ساتھ ساتھ اس کا فرمائشی پروگرام بھی جاری رہتا ہے۔

"آج سبزی بریانی بنالیں۔"

آج کچے قیمے کی ٹکیاں ہو جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اب تو اس نے کمرے میں آ کر جھانکا تک نہیں سلام بھی نہیں کیا۔ اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے پتا ہے کل رات دس بجے جو گیٹ کی بیل ہوئی تھی تو وہی آیا تھا۔ گو میں نے جھانک کر نہیں دیکھا لیکن اس کی آواز ذرا دیر کو برآمدے میں سنائی دی تھی۔

"اماں آخر آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے میں کیا کروں؟ آپ بھائی جان کو فون کریں۔"

اور میں جانتی ہوں زہرا کہ جب خالہ جان نے اقدار کو فون کیا تھا تو ساتھ ہی انوار کو بھی مطلع کر دیا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ انوار نے جو یہاں سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہے مجھے تنہائیوں کا عذاب دے کر خود کسی کی زلفوں میں پناہ لے کر اپنی تنہائی دور کر کے مطمئن سا بیٹھا شاید میرے لیے کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ اور میں جانتی ہوں وہ کیا فیصلہ کرے گا وہی جو ایک غیرت مند مرد کرتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری ساس جانے کس سے کہہ رہی تھیں یا پھر صرف مجھے ہی سنا رہی تھیں۔

"میرا انوار تو بہت غیرت مند ہے؟"

اور کتنی عجیب بات ہے زہرا کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کوئی وضاحت طلب نہیں کی،

میں نے کس طرح باری باری سب کی طرف دیکھا تھا خالہ جان کی طرف اور خالو جان کی طرف آصفہ اور عامرہ کی طرف کہ شاید وہ مجھ سے صفائی طلب کریں اور میں کہوں کہ..........

لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور تم نے پوچھا ہے زہرا حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ کبھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو اور میرے زخموں کا مرہم بن جاؤ۔ چپکے سے ہمیشہ کی طرح وجود میں چھپے سارے کانٹے چن لو۔ مجھے پتا ہے زہرا تمہیں اس سب پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ پتا نہیں تم نے کیسے اور کس طرح یہ سب سنا ہوگا۔ پتا نہیں اقدار نے کیسے اور کس طرح یہ خبر پہنچائی ہوگی؟ پتا نہیں کتنی سچائی ہوگی اور کتنی جھوٹ کی ملاوٹ۔ تمہیں تو پتا ہے نا زہرا لوگ ذرا سی سچائی میں کتنا زیا جھوٹ ملا لیتے ہیں۔ تم اقدار سے سب سن کر مضطرب ہوگئی ہوگی۔ تم نے فوراً کہا ہوگا نہیں میر منوں ایسی نہیں ہو سکتی وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔

شاید تم اقدار سے لڑی بھی ہوگی۔ شاید تم روئی بھی ہوگی لیکن مجھے پتا ہے تمہارے دل نے یقین نہیں کیا ہوگا۔ یقین تو مجھے بھی نہیں ہے زہرا کہ ایسا ہوا تھا اور شاید اس لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے ''کیا یہ سچ ہے آمنہ؟''

تمہارا خیال ہوگا میں کہوں گی نہیں یہ جھوٹ ہے زہرا سراسر جھوٹ۔ میرے سسرال والو کی سازش اور تم مجھے گلے لگا لوگی تمہارے دلکش لبوں پر مسکراہٹ ہوگی۔ وہی نرم نرم مہربا مسکراہٹ۔ ''مجھے یقین تھا میری منوں ایسی نہیں ہے۔''

تمہاری آنکھوں میں یقین کے دیے جل اٹھیں گے جو ہمیشہ ہی تمہاری سیاہ آنکھوں دمک بڑھا دیتے تھے اور ایسے میں پاگلوں کی طرح میں تمہیں تکتی رہ جاتی تھی۔

لیکن زہرا، اگر میں کہوں یہ سچ ہے......سب نہیں لیکن کچھ تو......کیا تم بھی مجھ سے نفر کرنے لگو گی۔ کیا تم بھی مجھ سے قطع تعلق کر لو گی اور مجھے اس مشکل میں چھوڑ دو گی۔ تم جو میر سب سے زیادہ اپنی ہو زہرا میں جانتی ہوں کہ اگر میں تم سے کہہ دوں یہ سب جھوٹ ہے تو آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لو گی اور ان سب سے لڑو گی جو مجھ پر بہتان لگا رہے ہیں اور مرغی کی طرح اپنے پروں تلے دبا کر سب سے محفوظ کر لو گی لیکن زہرا اس بھری دنیا میں صرف تم تو وہ ہستی ہو جس سے میں جھوٹ نہیں بول سکتی جس سے میں کبھی چاہوں بھی تو کچھ نہیں چھپا اور یہ بات شاید تم بھی جانتی ہو اس لیے تو تم نے صرف چند لفظ ہی لکھے ہیں۔

''آمنہ کیا یہ سب سچ ہے؟''

اور زہرا پتھر صرف باہر سے ہی تو نہیں آ رہے میرے اندر سے بھی پتھر اٹھ اٹھ کر مجھے سنگسار کر رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں زہرا چاہے مجھ سے کتنی بڑی غلطی بھی ہو جائے ساری دنیا مجھے ٹھکرا دے تم مجھے نہیں دھتکار سکتیں۔ ہم دونوں کے درمیان تو درد کا رشتہ ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے درد بانٹے ہیں اور کہتے ہیں درد کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ بہت اٹوٹ سارے رشتے ٹوٹ جائیں مگر درد کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اور یہ رشتہ اسی روز بن گیا تھا جس روز میرے گھر میں قدم رکھتے ہی تم نے مجھے اماں کی مار سے بچایا تھا۔ اس رشتے کی بنیاد ہی بہت گہری تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اس رشتے کی بنیادوں میں پہلے درد کی مٹی ڈالی گئی تھی پھر دوستی اور محبت کے رنگوں نے کنکریٹ کا کام کیا تھا اور اس بنیاد پر جو رشتہ استوار ہوا تھا وہ اتنا مضبوط تھا کہ تمہاری اماں کی نفرتیں تمہیں میرے خلاف مسلسل اکسانا اور میرے خلاف سازشیں کرنا بھی اس میں ایک معمولی سی دراڑ تک نہ ڈال سکا تھا۔ تم ہمیشہ روز اول کی طرح مجھے اپنے پیچھے چھپائے میری ڈھال بنی کھڑی رہیں۔

تمہیں یاد ہوگا زہرا جب اماں نے تمہارا بستر اپنے ساتھ والے کمرے میں لگانا چاہا تھا تو تم نے کہا تھا۔

''میں آمنہ کے کمرے میں سوؤں گی اکیلے کمرے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔''

تم بھی کون سی اتنی بڑی تھیں صرف دس سال کی اماں نے کچھ کہنا چاہا تھا تو ابا نے انہیں ٹوک دیا تھا۔

''ٹھیک ہے دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں گی۔''

اور اماں بے چاری چپ کر گئی تھیں۔ تم چھ سالوں کی جدائی کے بعد انہیں ملی تھیں وہ تمہاری کوئی بات کیسے رد کر سکتی تھیں۔ مجھے پتا تھا تمہیں ڈر نہیں لگتا ہوگا۔ تم تو اتنی بہادر سی لگی تھیں مجھے تم نے مجھے اماں کی مار سے بچایا تھا لیکن تمہیں شاید پتا چل گیا تھا کہ مجھے اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے اس لیے تم میرے کمرے میں آ گئی تھیں۔

ایک سال پہلے تک تو میں ابا اماں کے کمرے میں ہی سوتی تھی لیکن ایک سال پہلے اماں نے یہ کہہ کر کہ میں اب بڑی ہوگئی ہوں مجھے الگ کمرے میں سونا چاہیے اس کمرے میں بھیج دیا تھا یہ

کمرا اماں ابا کے کمرے سے دور تھا اور مجھے بہت ڈر لگتا تھا اماں جب لائٹ آف کر کے چلی جاتی تھیں تو میں آنکھیں زور سے بھینچ لیتی تھی اور دانت پر دانت جما کر تکیے کو زور سے اپنے بازوؤں میں پکڑ لیتی تھی۔ میں آنکھیں کھولتی تو دیواروں پر مجھے بھوت ناچتے دکھائی دیتے تھے اس لیے میں اماں کے جانے کے بعد آنکھیں کھولتی ہی نہیں تھی اور پھر اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے سو جاتی تھی۔ دراصل جب پہلے روز میں کمرے میں اکیلی سوئی تھی تو میں نے ساری رات لائٹ آف نہیں کی تھی۔ اس لیے اماں اب خود ہی لائٹ آف کر جاتی تھیں اور ساتھ ہی مجھے تنبیہ کر جاتی تھیں ”خبردار جو لائٹ جلائی پہلے ہی اتنا بل آتا ہے۔“

ہمارا گھر کافی بڑا اور کشادہ تھا گو پرانے طرز کا تھا لیکن اس میں کافی کمرے تھے اور تمہارا اماں چاہتی تھیں کہ تمہارا اپنا الگ کمرا ہو انہوں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا بھی تھا لیکن تم اس پہلے را سے لے کر میری شادی کے دن تک اسی کمرے میں میرے ساتھ ہی رہیں۔ بلکہ میری شادی کے بعد اپنی شادی تک تم وہاں ہی اسی کمرے میں رہیں۔ گو کمرے میں دو سنگل بیڈ تھے لیکن جب اماں تمہیں چھوڑ کر اور دودھ کا گلاس دے کر چلی گئی تھیں۔ تو تم دودھ کا گلاس ہاتھ میں لے میرے ہی بیڈ پر آ گئی تھیں۔ اور پھر تم نے زبردستی آدھا گلاس مجھے پلا دیا تھا اور پھر میرے ہی پر لیٹ گئی تھیں۔

”منوں میرا ہاتھ پکڑ کر سو جاؤ۔“

پتا نہیں تمہیں کیسے میری کیفیات پتا چل گئی تھیں۔ شاید تمہیں بھی ڈر لگتا ہوگا اس روز ہم۔ بڑی باتیں کی تھیں۔ میری نظر اچانک ہی تمہاری آنکھوں کے نیچے پڑے نیل پر پڑی تھی۔

”یہ کیا ہوا زہرا؟“

”کچھ نہیں۔“ تم نے بے پروائی سے کہا تھا۔

”دراصل جس روز ابا کی رجسٹری آئی جس میں طلاق نامہ تھا تو اماں نے مجھے دھنک آخر کہیں تو غصہ نکالنا تھا اور ایسی گالیاں دیں مجھے اور ابا کو جو اس سے پہلے کبھی نہیں دی تھیں اسی وقت ایجاد کی تھیں۔“ تم تھوڑا سا ہنسی تھیں۔

میں نے ہولے سے تمہارے نیل پر انگلی پھیری تھی۔ ”مگر انہوں نے تمہیں کیوں مارا تو تمہارے ابا نے دی ہے“ حالانکہ تب مجھے طلاق کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔ میں نے یہی

کہ ضرور یہ کوئی بہت بُری چیز ہوگی جس پر تمہاری اماں کو غصہ آ گیا ہوگا۔

”بھئی یہ جو سوتیلی مائیں ہوتی ہیں نا انہیں اپنی سوتیلی اولاد کی مار پیٹ سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ ان کا شغل ہوتا ہے مارنا۔ اور پھر میری اماں بھی تو تمہیں مارتی ہیں نا تو اللہ میاں مجھے مار کھلوا کر بدلہ اتار لیتا ہے۔“

تم تو اتنی چھوٹی سی ہی تھیں صرف دس سال کی لیکن تم اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی تھیں جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں پھر بھی میں بہت دھیان سے سنتی تھی۔

تم مجھے بہت خوبصورت لگتی تھیں اور تم کہتی تھیں ”منوں تم بہت پیاری ہو بالکل کسی شہزادی کی طرح۔“

”تم دُبلی پتلی سانولی رنگت کی تھیں لیکن تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت تھیں سیاہ چمکیلی آنکھیں۔“

جب میں اسکول گئی تھی اگلے روز تو میں نے اپنی ٹیچر کو بتایا تھا کہ میری بہن آئی ہے اور وہ بہت اچھی ہے اور بہت خوبصورت باتیں کرتی ہے۔

”اچھا تمہاری بہن باتیں کرتی ہے؟“ ٹیچر پتا نہیں کیا سمجھ کر ہنس دی تھی۔

لیکن میرا تو ہمیشہ یہ طریقہ رہا۔ زہرا میں کالج میں پہنچ گئی تھی تب بھی میں اپنی فرینڈز سے تمہاری ہی تعریفیں اور باتیں کرتی تھی اور کبھی کبھی تو وہ چڑ بھی جاتی تھیں۔

”تمہارے پاس زہرا کے سوا اور کوئی موضوع نہیں ہے۔ مان لیا کہ تمہاری بہن دنیا کی سب سے خوبصورت اور اچھی بہن ہے۔“

اور ایک بار عاصمہ نے تبصرہ کیا تھا۔ ”دراصل آمنہ کا کوئی اور بھائی بہن نہیں ہے اس لیے یہ اپنی بہن سے بہت اٹیچڈ ہے۔“

اور تب میں نے وضاحت کی تھی ”نہیں ایسا تو نہیں مجھ سے چھوٹے دو بہن بھائی ہیں بلال اور ربیعہ۔“

تب سب ہی بہت حیران ہوتے تھے لیکن زہرا کتنی عجیب بات ہے اگرچہ ابا کی طرف سے میرا ان سے اور اماں کی طرف سے تمہارا ان سے خون کا رشتہ تھا لیکن وہ دونوں ہی کبھی ہم دونوں سے قریب نہیں ہوئے تھے بلکہ اماں نے انہیں میرے قریب ہونے ہی نہ دیا اور تم میری حمایت

میں خود ہی ان سے دور ہوگئی تھیں شاید...... جب تم ہمارے گھر آئی تھیں تو اماں کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے لیکن میرا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ ایک بار نہ جانے کس بات پر ابا نے کہا تھا کہ کاش ان کا بیٹا ہوتا جوان کا سہارا بنتا۔ ایک آس ہوتی کہ بڑا ہو کر وہ کاروبار سنبھال لے گا آسرا بنے گا حالانکہ ابا تو بڑے صابر و شاکر سے بندے تھے اور قدرے مسکین سے بھی لیکن اس روز اماں بہت روئی تھیں اور انہوں نے بیٹے کی کمی کو بہت محسوس کیا تھا تب تم نے اماں سے کہا تھا۔

"دراصل اللہ میاں آپ سے ناراض ہیں اس لیے انہوں نے آپ کو بیٹا نہیں دیا۔ آپ منوں سے نفرت کرنا چھوڑ دیں اس سے اتنا ہی پیار کرنے لگیں جتنا مجھ سے کرتی ہیں تو پھر اللہ میاں آپ کی دعا سنے گا ورنہ نہیں۔"

اس وقت تمہیں ہمارے گھر آئے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے اور میری اور تمہاری دوستی بہت گہری ہو چکی تھی اور اماں بھی یہ بات جان گئی تھیں کہ تم میرے لیے میری خاطر انہیں کیسے کیسے بلیک میل کرتی ہو۔

"اللہ میاں اماؤں کو بچوں کا نگہبان بنا کر بھیجتا ہے چاہے وہ سوتیلی ہوں چاہے سگی اور ماؤں کو بھی چاہیے کہ وہ بچوں سے صرف محبت کریں۔ آپ منوں سے محبت کریں گی نا تو اللہ آپ کی دعا سنے گا۔"

"اچھا استانی جی!" اماں نے چڑ کر کہا تھا اور تم ہنس دی تھیں۔

اب پتا نہیں اماں نے مجھ سے نفرت ختم کر کے محبت کرنا شروع کر دی تھی یا اللہ مہربان ہو گیا تھا کہ ٹھیک ایک سال بعد بلال اور اس کے پیچھے ہی ربیعہ بھی چلی آئی تھی۔ بلال مجھ سے پورے سال چھوٹا تھا گو مجھے بہت پیارا لگتا تھا اور تم بھی خوش تھیں اور سارا وقت بلال کو اٹھائے پھرتی ہم دونوں ہی بلال کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے کتنا خوش ہوتے تھے آج یہ ساری باتیں کرنے کا موقع تو نہیں ہے لیکن پتا نہیں کیوں میں آج یہ سب یاد کر رہی ہوں تب سے جب سے خط آیا ہے۔

شاید میں تمہاری مہربانیوں اور محبتوں کو یاد کر کے خود کو تسلی دینا چاہتی ہوں بہلانا چاہتی کہ تم...... تم مجھ سے کبھی نفرت نہیں کر سکتیں کبھی نہیں چاہے میں تمہیں لفظ لفظ سچ بتا دوں ہیں! تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گی نا کبھی بھی نہیں اور تم مجھے غلط بھی نہیں سمجھو گی میرا قصور کوئی اتنا بڑا

نہیں لیکن قصور تو ہے نا۔ میں مانتی ہوں زہرا! مجھ سے غلطی ہوئی میں نے DISHONESTY کی لیکن مجھے تو خود نہیں پتا چلا۔ زہرا کہ کب کیسے اور کیوں ہو گیا یہ سب بات صرف اتنی سی تھی زہرا ...... لیکن نہیں یہ اتنی سی بات تو نہیں تھی شاید...... آج سے چودہ سال پہلے کی طرح یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ لیکن تم نے تو اس وقت بھی مجھ سے نفرت نہیں کی تھی جب مجھے لگا تھا کہ تم بھی...... تم بھی مجھ سے نفرت کرنے لگو گی اور مجھ پر تھوکو گی جیسے اماں نے تھوکا تھا اور مجھ سے منہ پھیر لو گی جیسے ابا نے پھیرا تھا لیکن تم نے تو ایک لمحے کے لیے بھی ایسا نہیں کیا تھا بس میری پیشانی چوم کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہولے سے دبایا تھا۔

"گھبراؤ نہیں منوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

تمہارا لہجہ یقین بن کر میرے اندر اُتر گیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ اب تم آ گئی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کاش اس وقت بھی تم آ جاؤ اور میری پیشانی چوم کر اسی پُر یقین لہجے میں کہو "گھبراؤ نہیں منوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن زہرا، اگر تم کہہ بھی دو تو کیا واقعی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شاید نہیں...... لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں میں سب کچھ تم سے کہنے جا رہی ہوں۔ شاید اندر دل کی انتہائی گہرائیوں میں کہیں کوئی ننھی سی لو جل رہی ہے۔ امید کی آس کی کہ شاید تم سب ٹھیک کر لو زہرا اور سب ایسا ہی ہو جائے پہلے جیسا......

ان دنوں میں ایف ایس سی کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھی اور تم لاہور میں اپنے ایم ایس سی کے فائنل ایئر کے پیپرز دے رہی تھیں۔ نفسیات تمہارا پسندیدہ مضمون تھا اور تم اسی مضمون میں ماسٹر کر رہی تھیں۔ تمہیں گھر آئے تین ماہ ہو گئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ تم اب ایک ہی بار پیپر دے کر گھر آؤ گی کیونکہ تم پڑھائی میں بہت مصروف تھیں اور میں تمہارے لیے بہت اداس ہو رہی تھی دل چاہتا تھا تم اچانک ہی آ جاؤ ایک دم سے اور تم اچانک ہی آ گئی تھیں ایک دم سے۔

دوپہر کو میں نہا کر ڈرائر سے اپنے بال خشک کر رہی تھی کہ باہر صحن سے بلال کی آواز آئی۔

"زہرا آپا آ گئیں؟"

اور پھر تمہاری زندگی سے بھرپور آواز آئی تھی۔

"کیسے ہو میری جان بلو!"

اور میں ڈرائر وہیں پھینک کر باہر بھاگی تھی۔ تم صحن کے بیچوں بیچ ربیعہ اور بلال کے گرد لپیٹے کھڑی تھیں اور تمہارا بیگ تمہارے قدموں کے پاس پڑا تھا میں نے عجلت میں دوپٹا لے ل جو میرے دائیں کندھے پر لٹک رہا تھا اور میرے کھلے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

"زہرا تم آ گئی ہو تمہارے پیپر ختم ہو گئے؟" میں ایک دم تم سے لپٹ گئی تھی۔

"نہیں ابھی دو پیپرز رہتے ہیں لیکن درمیان میں ایک ہفتے کا گیپ ہے میں بہت اداس رہی تھی اس لیے میں دو دن کے لیے ملنے چلی آئی۔" تم نے تفصیل بتائی تھی۔

"اور تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟"

"اے ون" میں نے تم سے الگ ہوتے ہوئے بتایا۔

تمہارا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ تم میرے ہر معاملے میں بہت متردد رہتی تھیں۔ میرے لباس لے کر میری خوراک تک کی فکر رہتی تھی تمہیں۔ یاد ہے نا ایک بار جب تمہیں میرے لیے اماں ک ہوا عید کا ڈریس پسند نہیں آیا تھا تو اماں نے جل کر کہا تھا۔

"لگتا ہے زہرا تم اس کی اماں ہو۔" اور تم مسکرا دی تھیں۔

"اماں میرا اور منوں کا رشتہ مشترکہ درد کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ ماں بیٹی کے رشتے سے ز مضبوط رشتہ ہے اور مجھے منوں میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔"

"اے گریڈ آ جائے گا؟" تم نے پوچھا تھا۔

"اے پلس!"

میں نے یقین سے کہا تب ہی ابا کمرے سے نکلے اور ان کے ساتھ ہی اماں بھی۔ ابا میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے گھر آتے تھے۔ ان کی نظر اچانک ہی مجھ پر پڑی تھی ا جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ اس سے پہلے ابا نے کبھی مجھے اس طرح دھیان سے نہیں دیکھا تھا۔ یوں سے صرف صبح ناشتے پر اور رات کھانے پر ہی سامنا ہوتا تھا اور ابا یونہی سرسری سی نظر ڈال کر چال پوچھ لیا کرتے تھے اور میں ابا کے یوں دیکھنے سے گھبرا سی گئی تھی۔ اماں بے تابانہ تم طرف بڑھی تھیں جبکہ ابا وہیں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی نظروں سے گھبرا کر دم جھک کر تمہارا بیگ اٹھانا چاہا تھا تو کندھے پر جھولتا دوپٹا نیچے گر گیا تھا اور کھلے بال یک دم آ کر زمین کو چھونے لگے تھے اور ابا کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"ارے آمنہ تو بالکل اپنی ماں جیسی لگنے لگی ہے۔ بالکل ویسے ہی لانبے بال ویسا ہی قد اور ...... اور بالکل ویسے ہی...... پتا ہے؟" وہ یکدم ہی اماں کی طرف مڑے تھے۔ "آمنہ کی ماں بالکل آمنہ جیسی ہی تھی بہت خوب صورت............"

اماں کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور ابا کی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے تھے۔ شاید وہ ماضی کے کسی لمحے میں کھو گئے تھے۔ ایک بار خالہ زینب نے بھی کہا تھا کہ میں بالکل اپنی امی جیسی ہوں اور خالہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ امی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں اور ابا بھی اکلوتے تھے۔ انہوں نے ایک بار اماں کو دیکھ لیا تھا اور اماں اتنی خوبصورت تھیں کہ انہوں نے دادی سے کہا کہ وہ اگر شادی کریں گے تو نینا سے ہی۔ اماں کا نام نسرین تھا لیکن سب انہیں نینا کہتے تھے لیکن نانا نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ تب پورے تین سال دادی نانا کے گھر بھاگتی رہی تھیں اور نانا ہر بار کہتے کہ وہ برادری سے باہر شادی نہیں کریں گے اور تب ابا نے دھمکی دی تھی کہ اگر نینا کی شادی مجھ سے نہ ہوئی تو کسی اور سے بھی نہ ہو گی۔ اور پتا نہیں نانا ابا کی دھمکی سے ڈر گئے تھے یا ان کی مستقل مزاجی سے متاثر ہو گئے تھے کہ انہوں نے اماں کا رشتہ دے دیا تھا لیکن اماں کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ تین سال بعد ابا کو چھوڑ گئیں۔

ابا کیا میں بھی بالکل اماں جیسی ہوں! خالہ زینب تو کہتی ہیں اماں بہت خوبصورت تھیں میں یک دم ہی ایک قدم آگے بڑھ کر ابا کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی "کیا میں بھی خوبصورت ہوں ابا"

"تم بالکل اپنی اماں جیسی ہو۔" ابا مسکرائے تھے ان کی آنکھیں یوں دمک رہی تھیں جیسے ان میں دو دیے روشن ہوں۔

"سچ ابا!"

میں ایک دم بچوں کی طرح ان سے لپٹ گئی تھی اور انہوں نے اپنا دایاں بازو بڑھا کر مجھے ساتھ لگا لیا تھا۔ میرا جی چاہا تھا وقت وہیں ٹھہر جائے مگر تب ہی اماں نے جانے کیا کہا تھا کہ انہوں نے چونک کر اپنا بازو ہٹا کر انہیں دیکھا پھر تمہارے سر پر ہاتھ پھیر کر تم سے تمہارے پیپرز کے متعلق پوچھتے رہے تھے۔ اس روز رات کو کھانے کی ٹیبل پر بھی ابا نے کئی بار سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور ہر بار ان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ آنکھوں میں میرے لیے بے تحاشا محبت اور شفقت کے رنگ دمک اٹھتے تھے ابا کا اس طرح محبت سے دیکھنا مجھے بہت اچھا لگا تھا اس رات

جب ہم اپنے کمرے میں آئے تھے تو ہمیشہ کی طرح تم میرے بیڈ پر آ گئی تھیں ہم نے ڈھ
باتیں کی تھیں اور تم نے کہا تھا۔

''منوں مرد کبھی بھی اپنی زندگی میں آنے والی پہلی عورت کو نہیں بھولتا۔ میں نے آج آنکھوں میں تمہاری اماں کی تصویر دیکھی ہے اور پتا ہے......'' تم ہولے سے ہنسی تھیں۔ ''امار دیکھ دیکھ کر جل رہی تھیں حالانکہ تمہاری اماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں پھر بھی۔''

تمہاری نظر کتنی گہری تھی زہرا مجھے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ اماں کو میری اماں کے ذکر سے ہوئی ہے۔ پھر اگلے روز تم چلی گئی تھیں اور یہ تمہارے جانے کے دو روز بعد کی بات تھی ابا دکان سے نہیں آئے تھے اور اماں پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھیں کہ میں نے بلال سے کہا کہ وہ کے گھر سے پڑھنے کے لیے کوئی میگزین لے آئے۔ صفیہ کا گھر ہمارے گھر کے سامنے ہی سڑک کراس کر کے بلال نے کہا۔

''آپا تم یہاں دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھنا مجھے ڈر لگتا ہے۔''

اور میں گیٹ کو تھوڑا سا کھولے وہاں کھڑے ہو کر بلال کو سڑک کراس کر کے سامنے صفو گھر میں داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ بلال نے صفو کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے مڑ طرف دیکھا تھا اور میں نے سر کے اشارے سے اسے تسلی دی تھی کہ میں کھڑی ہوں۔ میرا دھیان صفو کے گھر کے گیٹ کی طرف تھا اور مجھے بالکل بھی پتا نہیں تھا کہ کب کسی نے گلی گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تھا اور...... اس کی نظریں میرے چہرے پر لحہ بھر کو ٹھہری تھیں سارا دھیان بلو کی طرف تھا کہ وہ گیٹ سے نکلے تو مجھے کھڑے ہوئے دیکھ لے اور جونہی بلو گیٹ سے باہر نکلا.......... میں نے اُسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ عین اسی لمحے جانے ک اماں نکل آئی تھیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مجھے اندر لے گئیں۔

میں نے بلال کو سڑک پر دوڑتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اماں کو۔

''اماں وہ بلو......اسے ڈر لگے گا۔''

''لیکن اماں نے تو مجھے بات ہی مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ اور دھمو کے لگانے شر دیے تھے۔''

''بے حیا بے شرم تمہیں باپ کی عزت کا خیال نہیں۔ ایسی کیا آفت پڑ گئی تھی کہ تم

تھا وہ کمبخت جس کو گیٹ پر کھڑی اشارے کر رہی تھیں۔''

''اماں میں تو بلال کو...... آپ پوچھ لیں بلو سے۔''

اور اگرچہ بلال نے اماں کو بتا بھی دیا تھا سب لیکن اماں کی زبان تو انگارے اگل رہی تھی اور ہر انگارہ میرے بدن کو جلاتا جا رہا تھا۔

''ارے میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا اسے اللہ جانے کون تھا۔ یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا اور یہ..........''

مجھے تو ایک دم یوں لگا تھا جیسے میرا وجود سن ہو گیا ہو۔ اماں نے اور کیا کیا کہا میں نے سنا نہیں میں تو جیسے پاؤں گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی تھی میری آنکھیں جل رہی تھیں لیکن دور دور تک کوئی آنسو نہ تھا اور پھر ابا کے آتے ہی اماں نے خوب نمک مرچ لگا کر ساری کہانی انہیں سنائی تھی اور مجھے بلو کے ہاتھ بلوا بھیجا تھا میں پتا نہیں کیسے اپنے کمرے سے باہر آئی تھی اور ابا کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔

''ابا!'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ابا سے کہنا چاہا تھا کہ وہ سب جھوٹ ہے غلط ہے۔ جو اماں نے انہیں بتایا ہے لیکن میری آواز میرے حلق میں ہی پھنس گئی تھی اور ابا نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا وہ اندر تک مجھے کاٹتی چلی گئی تھیں۔ کتنا دکھ تھا ان نظروں میں غم رنج....... اور غصہ تو کہیں نہ تھا لیکن وہ جو تاثر بھی تھا مجھے لگا تھا میرا دل کٹ گیا ہے ان نظروں سے اور پھر ابا کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور بالکل آج کی طرح ہی میں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے اس کائنات کی ہر چیز مجھ پر تھوک رہی ہے ہنس رہی ہے۔ میری عمر ہی کتنی تھی تب سترہ یا اٹھارہ سال اور نہ ہی مجھ میں اتنی عقل اور ہمت تھی کہ میں ابا کے سامنے جا کر انہیں یقین دلا سکوں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے تب تم آ گئی تھیں۔

دو یا تین دن ہی گزرے تھے لیکن مجھے لگا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ پہلی بار تھا کہ تمہاری آواز سن کر میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی حالانکہ تم نے مجھے آواز بھی دی تھی مگر میں تو جیسے پتھر کی ہو چکی تھی پھر شاید تم اماں سے سب سن کر میرے کمرے میں آ گئی تھیں۔

سب ٹھیک ہو جائے گا منوں تم نے میری پیشانی چوم کر اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھے تسلی دی تھی اور اتنے دنوں کے بعد آنسو پگھل کر میری آنکھوں کو جل تھل کر گئے تھے۔

"زہرا یہ سب غلط ہے جھوٹ ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔" تم نے میرے پتھر ہوتے جسم پر جیسے طلسمی پانی چھڑک دیا تھا۔ اور میں ۔
کہا ہے نا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور واقعی تب سب ٹھیک ہو گیا تھا تم نے ابا کے آنے پر ان سے کہا تھا۔

"ابا اماں نے جو کچھ بھی منوں کے متعلق آپ سے کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔"

ابا نے چونک کر تمہیں دیکھا تھا۔ ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور ان تین دنوں میں ہی وہ کچ
کمزور سے ہو گئے تھے۔

"زہرا اس سے پوچھو وہ کون تھا؟"

"وہ کوئی نہیں تھا ابا! میں نے آپ سے کہا نا کہ اماں نے جھوٹ بولا ہے آپ سے۔
تمہاری اماں کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"دراصل اماں جل گئی تھیں منوں سے اس روز آپ نے منوں سے کہا تھا نا کہ وہ اپ
سے بہت مشابہ ہے اور آپ نے بہت محبت سے منوں کو دیکھا تھا تو دراصل اماں کو آپ کی یہ
اچھی نہیں لگی تھی شاید اور انہوں نے منوں کو آپ کی نظروں سے گرانے کے لیے یہ سب کیا
اماں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" تم نے اچانک ہی اماں کو مخاطب کیا تھا۔ ان کا کھلا ہوا منہ ایک د
ہوا تھا اور پھر کھل گیا تھا۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے زہرا کیا بک رہی ہے؟"

"اماں آپ جانتی ہیں میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور بعض اوقا
اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے آپ سے بھی غلطی ہوئی ہے
سے اعتراف کر کے منوں کی پوزیشن کلیئر کر دیں۔ اللہ کو آپ کا یہ عمل پسند آئے گا اماں!"

"تیرا دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے زہرا میں بھلا کیوں......؟"

"اماں! تم نے اماں کی بات کاٹ دی تھی۔"

"اگر آپ نے سب سچ نہ کہا ابا سے بلال کی قسم کھا کر تو میں صبح ہی گھر سے چلی جاؤ
کہیں بھی اور شام تک پورے محلے کو خبر ہو جائے گی کہ زہرا بھاگ گئی ہے۔"

اماں کی آنکھیں جیسے وحشت سے پھٹنے کو تھیں۔ تم نے ایک نظر اماں کو دیکھا تھا

میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے پلٹی تھیں اور مجھے جانے کیا ہوا تھا کہ میں تمہارا ہاتھ چھڑا کر ایک دم ابا سے لپٹ گئی تھی۔

"ابا...... ابا...... میں نے کچھ نہیں کیا...... میں تو بلو......" اور میری ہچکی بندھ گئی تھی اور ابا نے یکدم مجھے گلے لگا کر میرے سر پر پیار کیا تھا اور تم سے کہا تھا۔

"زہرا اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ اور کچھ کھلا پلا دو۔"

اماں کے اعتراف کے بغیر ہی ابا نے جیسے سب جان لیا تھا تم میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی تھیں اور میں اپنی پریشانی بھول کر تمہارے لیے پریشان ہو گئی تھی۔

"اماں تو اب تم سے ناراض ہو جائیں گی؟"

"نہیں ہوں گی۔" تم نے بے پروائی سے کہا تھا۔

"وہ میری اماں ہیں میں جانتی ہوں انہیں۔"

اور واقعی دو تین روز تک ان کا منہ پھولا رہا تھا لیکن پھر وہ خود ہی تم سے باتیں کرنے لگی تھیں اور اس روز کے بعد سے ابا تم سے اور بھی زیادہ محبت کرنے لگے ساتھ ممنونیت بھی ہوتی تھی اور اب تو وہ اکثر رات کو کچھ دیر ہم دونوں سے باتیں کرتے تھے۔ اماں کو ان دنوں تمہاری شادی کی بہت فکر ہو رہی تھی۔ انہوں نے ادھر اُدھر محلے میں سب سے کہہ رکھا تھا۔ پھر ایک دن ان کی کوئی ملنے والی انوار کا رشتہ لائی تھیں خالہ جان اور آصفہ آئی تھیں تمہیں دیکھنے اور انہوں مجھے پسند کر لیا تھا اماں کا غصے سے برا حال تھا لیکن تم بالکل نارمل تھیں۔

"یہ تو نیچرل بات ہے اماں اگر آپ کہیں بلو کے لیے لڑکی پسند کرنے جائیں گی تو آپ کا بھی جی چاہے گا نا کہ لڑکی خوب صورت ہو بالکل ہماری منوں کی طرح تو اگر انہوں نے منوں کو پسند کر لیا تو کیا ہوا؟"

حالانکہ زہرا مجھے تو تم ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت لگتی تھیں۔ دبلی پتلی سی۔ تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں ان میں کتنی کشش تھی تمہاری سانولی رنگت میں اپنا حسن اور کشش تھی لیکن پتا نہیں کیوں انوار کی ماں نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ ابا نے سنا تو صاف منع کر دیا۔

"زہرا بڑی ہے پہلے زہرا کا رشتہ ہوگا پھر ہم آمنہ کے متعلق سوچیں گے" ان کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ "ان کی جرات کیسے ہوئی زہرا کو چھوڑ کر آمنہ کا رشتہ مانگنے کی اور آمنہ تو یوں

بھی پڑھ رہی ہے ابھی۔''

ابا کو اس واقعے کے بعد تم بہت عزیز ہو گئی تھیں حالانکہ پہلے بھی ابا نے مجھ میں اور تم میں کبھی فرق نہیں کیا تھا۔ مگر اب تو ابا ہر بات میں حتیٰ کہ بزنس کے معاملات میں بھی تم سے مشورہ کرنے لگے تھے۔ تمہاری اماں کا موڈ بہت خراب تھا۔ انہیں انوار بہت پسند آیا تھا پڑھا لکھا خوبصورت الیکٹریکل انجینئر تھا۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ پڑھائی سے فارغ ہوا تھا اور چونکہ گھر میں سب سے بڑا تھا اس لیے اس کی ماں کو اس کی شادی کی جلدی تھی تب تم نے ابا سے کہا تھا۔

''ابا اگر انوار بہت اچھا ہے تو پھر آپ انہیں منع مت کریں اور آمنہ کا رشتہ طے کر دیں۔''

ابا حیرت سے تمہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔

''میں چاہتی ہوں ابا کہ آمنہ کی شادی میری شادی سے پہلے ہو جائے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میری شادی پہلے ہو گئی اور میں یہاں سے چلی گئی تو پھر شاید آمنہ کی شادی کبھی نہ ہو سکے۔'' اپنی ماں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

''مگر وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے؟'' ابا کو اعتراض تھا لیکن تم نے پتا نہیں کیسے ابا کو قائل کرا تھا۔ ابا جب انوار سے ملے اور اس کے بارے میں تحقیق کی تو انہیں بھی انوار بہت پسند آیا تھا او انہوں نے ہاں کر دی تھی شادی ایک سال بعد ہونا طے پائی تھی اور اس ایک سال میں اماں نے مجھ سے بالکل بات نہیں کی تھی ان کا منہ ہمیشہ ہی پھولا رہتا تھا وہ اکثر مجھے سنانے کو کہتی تھیں۔

''ارے ہماری تو پیٹ کی اولاد ہی ہماری دشمن ہے۔''

اور تم اماں کے گلے میں بانہیں ڈال ڈال کر انہیں مناتی رہتیں تم جیسا بے وقوف بھی کوئی ہو زہرا اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لی۔ انوار جیسا لڑکا تو کسی نصیبوں والی کا ہی نصیب بنتا ہے۔

''اماں فکر نہ کریں۔'' تمہاری آنکھیں یکدم چمک اٹھی تھیں ''کیا خبر میرے نصیب میں انوار سے بھی اچھا لڑکا ہو؟''

''ہوں'' اماں نے تمہاری باتیں جھٹک دی تھیں اور اس رات تم نے مجھے بتایا تھا۔

''پتا ہے آمنہ مجھے ابا ملے تھے وہاں۔''

''لیکن انہیں کیسے پتا چلا تھا کہ تم وہاں ہو یونیورسٹی میں۔''

''میں نے انہیں خط لکھا تھا پھر وہ ملنے آئے تھے مجھے اور پتا ہے وہ آج کل لاہور میں ہی

ہتے ہیں ڈیفنس میں۔ میں نے تو خط شیخوپورہ کے پتے پر بھیجا تھا اور وہاں سے انہوں نے ابا کو بھیج دیا۔''

''اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟'' میں ناراض ہو گئی۔

''بس یوں ہی نہیں بتایا میں نے سوچا ایک ہی بار بتاؤں گی۔'' تم مسکرا دیں۔

''اور ابا کیسے ہیں تمہارے کیا انہوں نے پھر شادی کی؟''

تمہیں یاد ہے نا زہرا!...... بچپن میں ہم اکثر دعا کرتے تھے کہ اللہ کرے ابا کی اگر اب ادی ہو تو ان کی بیوی بہت اچھی ہو بے چارے ابا! تمہیں ان پر ترس آتا تھا اور پھر ہم دونوں پٹے لپیٹے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ تمہارے ابا کے لیے دعائیں کرتے تھے کہ انہیں اب ے بہت اچھی بیوی ملے۔

''ہاں آمنہ ابا نے شادی کی اور ہماری دعائیں بھی قبول ہو گئیں۔ ابا کی تیسری بیوی بہت ی ہیں اور ابا کے دو بیٹے بھی ہیں پیارے پیارے سے اور میں اکثر ویک اینڈ پر ادھر چلی جایا تی تھی اور پتا ہے میں نے ابا اور اماں کو تمہارے متعلق بتایا تھا اور اپنی دعاؤں کے متعلق بھی جو دونوں کرتے تھے تو ابا بہت ہنسے اور انہیں تم سے ملنے کا بہت شوق ہے۔''

''تو زہرا چلو نا ہم تمہارے ابا سے مل آتے ہیں ابھی جب تمہارا رزلٹ آئے گا تو مجھے بھی ھ لے چلنا۔''

''ابا خود ہی آئیں گے کچھ دنوں میں اور اُن کے ساتھ میری پھپھو اور سفیان بھی ہوں گے۔''

''ہیں یہ سفیان کون ہیں؟''

''پھپھو کے بیٹے!'' تمہاری آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ میں چونک اٹھی۔

''زہرا ادھر دیکھو کیا بات ہے؟'' میں بہت بڑی نہیں تھی زہرا لیکن تمہارے چہرے کے ھ سے چھپے نہ تھے۔

''کوئی بات نہیں آمنہ! ابا نے مجھ سے سفیان کے لیے پوچھا تھا۔ سفیان ڈاکٹر ہے اچھا ہے ں نے سوچا تھا منوں کہ میں ساری زندگی ابا سے دور رہی ہوں اس طرح میں ابا کے قریب ہو ؤں گی لیکن میں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ یہ میری مرضی کی بات نہیں ہے۔ میرے متعلق فیصلہ کا حق صرف منوں کے ابا کو ہے کیونکہ میں نے ان سے ہی باپ کی شفقت ومحبت پائی ہے۔''

''اور ابا بھلا کیوں انکار کریں گے اگر سفیان اتنا اچھا ہے۔''

اور ایسا ہی ہوا تھا زہرا میری شادی سے چند دن پہلے تمہارا رشتہ سفیان سے طے پا گیا تھ شادی چھ ماہ بعد ہونا طے پائی تھی۔ تمہاری اماں کو تو اس رشتے پر سخت اعتراض تھا لیکن ابا نے کردی تھی شاید انہوں نے تمہاری آنکھوں میں جھانک لیا تھا۔

''اماں سے تو ابا میرے زیادہ قریب ہیں'' اس روز تم نے مجھ سے کہا تھا وہ ہمیشہ میرے میں جھانک لیتے ہیں۔

تم بہت خوش تھیں اور میں بھی بہت خوش تھی منگنی کے بعد خود بخود ہی انوار کا خیال ہر و میرے دل میں رہنے لگا تھا اور شادی کے بعد تو انوار نے مجھے اتنی محبتیں دی تھیں کہ میں اپنی خ قسمتی پر نازاں ہوتی۔ سسرال میں سب ہی اچھے تھے اقدار میرا دیور عامرہ اور آصفہ دونوں نند خالہ جان خالو جان سب ہی محبت کرنے والے تھے لیکن میں تمہارے لیے بہت اداس ہو جاتی ہر روز تمہیں فون کرتی ...... تم ہنستی تھیں۔

''اور جو میں لاہور چلی گئی تو......''

اور اس خیال سے ہی میرا دل ڈوب جاتا تھا لیکن پتا ہے زہرا میری خوش قسمتی کہ تمہ شادی سے پہلے ہی سفیان کو یہاں شفا انٹرنیشنل میں جاب مل گئی اور تم شادی کے بعد کچھ سسرال رہ کر یہاں آ گئیں۔ تم ہر قدم پر میرے ساتھ ساتھ رہیں زہرا۔ جب علی پیدا ہوا اور ز زارا ہوئی ہر بار تم نے میری خدمت کی حالانکہ علی کے وقت تو خود تمہارا بیٹا صرف تین ماہ کا تھ جب انوار نے امریکا جانے کا پروگرام بنایا تو یہ تم ہی تھیں جس نے انوار کو بہت روکا تھا۔

''انوار بھائی انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے انشاء اللہ جلد ہی آپ کو اپنے مطلب کی جاب جائے گی۔'' لیکن انوار پر تو امریکا جانے کی دُھن سوار تھی۔

''یہاں کیا ہے وہاں امریکا میں جتنی محنت کروں گا اتنا صلہ تو ملے گا ان تین سالوں میں جگہ میں نے جاب کی ہے اور کیا تنخواہ ہے صرف آٹھ ہزار روپے میں نے اتنی تعلیم صرف اس حاصل کی تھی؟''

''یہ تو ابتدا ہے انوار بھائی ہر کام میں وقت لگتا ہے۔''

لیکن تمہاری ساری کوششیں بیکار گئی تھیں انوار نے دل میں جو ٹھان لی تھی ویسا ہی کیا

تب ایک سال کی تھی صرف اور میری شادی کو تقریباً دو ڈھائی سال ہو گئے تھے انوار مجھے تسلیاں اور بہلاوے دے کر چلا گیا۔ چند سال کی بات ہے زیادہ سے زیادہ تین سال تک میں آ جاؤں گا ایک دفعہ سیٹل ہو گیا تو پھر تمہیں بھی بلا لوں گا وہاں لائف بہت اچھی گزرے گی۔

لیکن مجھے تو تین سال بھی تین صدیوں سے زیادہ لگتے تھے تب اور میں نے اس کے بغیر دس سال گزار دیے۔ صرف تمہارے آسرے پر زہرا۔ علی اس اگست میں دس سال کا ہو جائے گا اور انوار نے تو اسے دیکھا تک نہیں اور کبھی اس کے دل میں شاید اس کو دیکھنے کا خیال بھی نہیں آیا تمہیں یاد ہے نا علی انوار کے جانے کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا تھا اور میں اس روز کتنا روئی تھی اور مجھے انوار کی کمی کتنی محسوس ہوئی تھی اور میرے پاس تم تھیں میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے مجھے تسلی دیتی ہوئی۔

''انوار بھائی بھی تمہاری اور بچوں کی خاطر ہی باہر گئے ہیں تمہیں اور بچوں کو ایک بہتر اور اچھا مستقبل دینے کے لیے۔''

اور علی کا نام بھی تم نے ہی رکھا تھا زہرا۔ اور انوار کو بھی پسند آیا تھا۔

انوار نے علی اور زارا کے لیے بے شمار چیزیں بھیجی تھیں۔ اسے بہت اچھی جاب مل گئی تھی وہ خوش تھا گھر میں بھی سب خوش تھے لیکن پتا نہیں کیوں میں خوش نہیں تھی مجھے انوار کی کمی محسوس ہوتی تھی میں اس کے بنا خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرتی تھی اگر تم بھی نہ ہوتیں زہرا تو میں تو پاگل ہی ہو جاتی۔ جب بھی کوئی مسئلہ ہوتا...... میں تمہاری طرف بھاگتی جب جب علی اور زارا بیمار ہوئے جب انہیں اسکول میں داخل کروایا تھا ہر موقع پر تم ہی تھیں جس کے سہارے میں نے اپنے سال بتا دیے تھے انوار کے بغیر۔ میں دن میں پندرہ بار بھی تمہیں فون کرتی تو تم اسی خوش دلی سے میری بات سنتیں۔ میرا ہر مسئلہ خوش اسلوبی سے حل کرتیں۔

مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہوتا بچوں کے کپڑے خریدنے ہوتے سب جگہ تم ہی میرے ساتھ رہیں میری تو صبح کا آغاز ہی تم سے بات کر کے ہوتا سوچتی ہوں زہرا اگر تم نہ ہوتیں تو میرے لیے تو یہ سارے سال گزارنے بہت مشکل ہو جاتے تم تھیں نا زہرا میری ہر بات شیئر کرنے کے لیے پھر بھی رات کو اپنے کمرے میں اکثر راتیں میں نے ٹہلتے اور تکیے میں منہ چھپا کر راتے گزار دی تھیں۔

اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہ کر مرد کی قربت سے آشنا ہو جانے والی لڑکی کے لیے زندگی کتنی ہارڈ ہوگی اس کے بغیر تم سمجھتی تھیں اس لیے تو تم نے ہمیشہ اپنی باتوں سے مجھے سہارا دیے رکھا تمہیں یاد ہے نا زہرا صفو کے بھائی جب شادی کے فوراً بعد سعودیہ چلے گئے تھے تو صفو کی بھابی اکثر چھت پر یا اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر بے چینی سے ٹہلتی رہتی تھیں اور ہم ان کے اس طرح ٹہلنے پر کس قدر ہنستے تھے صفو پوچھتی تھی۔

''بھابی کیا ہے اس طرح اتنی تیز کیوں چل رہی ہیں؟'' تو وہ کہتی تھیں۔

''کچھ نہیں صفو بس بے چینی لگی ہے۔''

ہم ان کی اس ''بے چینی لگی ہے۔'' کا مذاق اُڑاتے تھے اور ہنستے تھے لیکن اب انوار کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ ''شوہر کے بغیر'' تنہا زندگی کاٹنا کتنا مشکل ہے اور اس بے چینی کا مفہوم بھی سمجھ آیا تھا لیکن پھر بھی میں نے اتنے سارے سال بتا دیے صرف اس ایک آس پر کہ ایک دن انوار لوٹ آئے گا اور وہ بھی تو ہمیشہ یہی کہتا تھا۔

''بس کچھ دن اور آمنہ! میں لوٹ آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں جب گھر آؤں تو میرے پاس اتنا کچھ ہو کہ میں اپنے بچوں کو بہترین گھر اور بہترین مستقبل دے سکوں۔''

لیکن دس سالوں میں اس کی خواہشات بڑھتی ہی گئیں۔ حالانکہ اس نے اسلام آباد میں بہت اچھا گھر لے لیا ہے اور گھر میں ہر سہولت موجود ہے۔ آصفہ اور عامرہ کی شادیاں ہونے والی ہیں۔ ان کی مرضی کا جہیز تیار ہے۔ اقدار سیلف فنانس پر ایم بی اے کر رہا ہے سب کی ضروریات اور خرچ پورے ہو رہے ہیں لیکن میری ضروریات کا انوار نے شاید کبھی نہیں سوچا زہرا کہ مجھے بھی اس کی قربت اور رفاقت کی ضرورت ہو سکتی ہے اور یہ تم تھیں جس کے سہارے اتنے سال گزر گئے۔ تمہارے جانے کے بعد تو میں اور بھی تنہا ہو گئی تھی میں نے تو اپنا خیال رکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس روز علی نے کہا۔

''ماما آپ تو بوڑھی لگنے لگی ہیں۔''

صرف انتیس سال کی عمر میں اس روز میں نے آئینے میں خود کو دیکھا میرا چہرہ کتنا پھیکا اور بے رونق لگ رہا تھا اور بال الجھے ہوئے تھے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں

اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا

بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا اور میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی اور پھر بہت سارے دن مجھے اپنے متعلق کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ آصفہ اور عامرہ کی شادی کی تیاری کرنا تھی اور خالہ جان نے سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں اکثر آصفہ یا عامرہ کو لے کر شاپنگ کے لیے نکل جاتی تھی۔ یہ بھی تمہاری وجہ سے تھا زہرا کہ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔

''گھر میں گاڑی ہے منوں تو ڈرائیونگ سیکھ لو کبھی کوئی ایمرجنسی ہو جاتی ہے۔''

''تم جو ہو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تھا۔

''میں ہر لمحہ ہر وقت تو نہیں ہوتی نا تمہارے ساتھ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے انوار بھی یہاں ہیں ہے کبھی ہاسپٹل بھی لے جانا پڑ جاتا ہے۔'' تم نے مجھے قائل کر لیا تھا۔

سو اب یہی ڈرائیونگ کام آ رہی تھی اس روز میں اکیلی ہی ٹیلر کے پاس سے کپڑے لینے لی گئی تھی۔ یوں بھی اب خالہ جان نے آصفہ عامرہ کو منع کر دیا تھا۔

''بازاروں میں گھوم گھوم کر رنگ کالے سیاہ ہو گئے ہیں اب گھر بیٹھو مہینہ بھر۔''

شاپنگ تو تقریباً مکمل تھی چھوٹے موٹے کام رہ گئے تھے وہ میں خود ہی کر لیتی تھی ٹیلر سے ے لے کر میں حسان کی طرف چلی گئی حسان انوار کا دوست ہے تم تو جانتی ہو نا انوار ہمیشہ اسی طرف رقم وغیرہ بھیجتا ہے۔ اور وہ گھر پہنچا دیتا ہے میں نے سوچا تھا ایک دو روز تک جیولر کو پے کرنی ہے خود ہی جا کر رقم لے آؤں حسان نے فون پر بتایا تھا کہ رقم آئی ہوئی ہے لیکن کچھ یلو مسائل ہیں ان سے نمٹ کر وہ رقم پہنچا جائے گا میں بلکہ ہم سب ہی کبھی کبھار حسان کے گھر تے رہتے تھے لیکن اس روز حسان اکیلا تھا اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بالکل معمولی سی بات پر ل ہو کر میکے چلی گئی ہے اسی پریشانی میں وہ رقم نہیں پہنچا سکا۔ وہ مجھے بٹھا کر شاید کوئی کولڈ لینے چلا گیا تھا۔ حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا اور یونہی ٹیبل پر سے اخبار اٹھاتے ہوئے الی اس خط پر پڑ گئی تھی۔ میں نے انوار کی تحریر پہچان لی تھی اور میں نے بلا ارادہ ہی وہ خط الا خط پڑھنے کے بعد مجھے لگا زہرا جیسے میں تو پانی پر گھر بنائے بیٹھی ہوں میرے اندر اتنی پھوٹ ہوئی کہ جب حسان آیا کولڈ ڈرنک لے کر تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری

تھیں۔

''کیا ہوا بھابی؟'' وہ گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں''، میں ایک دم ہی کھڑی ہوگئی تھی۔

''میرا دل گھبرا گیا ہے میں چلتی ہوں اب۔''

میں نے مٹھی میں بند خط اپنے پرس میں ڈال لیا تھا تم یہ خط پڑھنا زہرا! لیکن حسان ۔ زبردستی مجھے روک لیا پلیز یہ پی لیں لیکن میرے اندر یکایک جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کو یہ ٹھنڈ نج کوک بھی نہ بجھا سکی۔

''بھابی میں ہوں جب بھی کسی مدد کی ضرورت ہو مجھے بتایئے گا۔''

''اور تو سب ہو گیا ہے بس فرنیچر وغیرہ خریدنا ہے انوار شاید کچھ دن پہلے آ جائے خالو ج تو ظاہر ہے چل پھر نہیں سکتے۔'' میں نے بمشکل خود کو کمپوز کیا تھا۔

''میں آ جاؤں گا مجھے فون کر دیجئے گا۔''

اور اس روز گھر آتے ہوئے مجھے تم بہت یاد آئی تھیں کاش تم ہوتیں زہرا تو میں اپنا د تمہارے پاس ہلکا کر لیتی لیکن تم......نہیں تھیں......اماں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔

اور بلال اور ربیعہ ابھی اتنے بڑے کہاں تھے۔ بلال اب اگرچہ بیس اکیس سال کا تھ میں اتنی قریب ہی کب تھی اس سے کہ دل کا درد اس سے کہتی اور میرے ابا......میرے کم خاموش طبع ابا جو دل میں میرے اور تمہارے لیے یکساں محبت رکھتے تھے علی کی پیدائش کے بعد ہی ایک دن چپکے سے یہ دنیا چھوڑ گئے رات سوئے اور......صبح جب بلو جگانے گیا تو اٹھے تب بھی تم ہی تھیں جس نے مجھے سہارا دیا تھا میرے آنسو پونچھے تھے۔

پتا نہیں میں کیسے گھر پہنچی تھی میں نے یہ دس سال تنہا گزار دیے تھے انوار کے بغیر صر آس پر کہ ایک دن تو یہ جدائی کے دن ختم ہو جائیں گے اور میں سمجھتی تھی کہ اگر میں تنہا ہوں تو تو تنہائی کے عذاب سہہ رہا ہے ہمارے بغیر اجنبی ملک میں اکیلا لیکن وہ اکیلا کہاں تھا زہرا! پاس تو جوڈی تھی اور جب جوڈی نہیں تھی تو شاید کوئی جینی کوئی ایلن اس کو بھلا تنہائی کے اس کی کیا خبر جو میں نے برداشت کیا وہ اس بے چینی کو کیا سمجھ سکتا ہے جو اکثر راتوں کو مجھے رکھتی تھی میرا دل چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر روؤں مجھے لگ رہا تھا میرے دس سال رائیگاں

ن دن سالوں کے ہر ہر لمحے میں میں نے جس شخص کو سوچا جس سے محبت کی اس نے تو شاید کبھی یک لمحے کے لیے بھی میری کمی محسوس نہ کی ہوگی۔

میں کتنی ہی دیر تک بستر پر اوندھی لیٹی روتی رہی۔ زارا اور علی آئے تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ وہ پھوپھو سے کہیں ماما کے سر میں درد ہے وہ خود ہی کھانا بنا لیں۔

وہ پوری رات میں نے جاگ کر گزاری تھی صبح اٹھی تو میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سر ماری ہو رہا تھا۔ ناشتہ عامرہ نے ہی بنایا تھا اور مجھے کمرے میں ہی چائے دے گئی تھی مجھے کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور کیسے میرے دل کا درد کم ہو جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بہت بوجھ تھا ہرا میرے دل پر میں نے کوئی سات دفعہ وہ خط پڑھا تھا جو انوار نے حسان کو لکھا تھا اور ہر بار ہی را دل جیسے کسی گہری کھائی میں گر گیا تھا علی اور زارا کے اسکول جانے کے بعد میں بمشکل اٹھی تھی رہاتھ لے کر باہر نکلی تھی کہ خالہ جان نے بتایا۔

''حسان آیا ہوا ہے تم اس کے ساتھ جا کر فرنیچر پسند کر لو''بٹ فرنیچر'' کا مالک حسان کا ست ہے۔''

''جی اچھا!''

میں نے چاہا تھا کہ عامرہ یا آصفہ بھی ساتھ چلیں لیکن دونوں نے انکار کر دیا۔

''ہمیں آپ کی پسند پر اعتبار ہے دراصل آج ہماری فرینڈز آ رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بہو تم چلی جاؤ پسند کر لو یہ بعد میں کسی روز جا کر لو دیکھ لیں گی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے آنٹی اگر انہیں پسند نہ آیا تو کینسل بھی کیا جا سکتا ہے۔''

مجھے چکر سے آ رہے تھے لیکن میں خاموشی سے پرس اٹھا کر حسان کے ساتھ چلی گئی اور پھر وم میں اِدھر اُدھر گھومتے اور فرنیچر دیکھتے ہوئے اچانک ہی مجھے چکر آ گیا تھا اور میں لڑکھڑا کر نے لگی تھی کہ یکدم حسان نے مجھے تھام لیا۔

ایک لمحے کو جیسے میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور حواس جواب دے گئے تھے دوسرے ہی ب میں نے آنکھ کھولی تو حسان مجھے صوفے پر لٹا رہا تھا اور یکدم اس کے لمس سے میرے شعلے بھڑک اٹھے میں نے یکدم اس کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی لحہ بھر کو اس کی آنکھوں رت سی اتری۔

"آپ غالباً بے ہوش ہو کر گرنے لگی تھیں میں قریب ہی تھا میں نے سنبھال لیا۔" ا
وضاحت کی شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"ہاں مجھے صبح سے چکر آ رہے ہیں۔" میں نے بمشکل خود کو کمپوز کیا رات بھی ٹھیک
نہیں آئی۔

"تب ہی آپ کی آنکھیں اس قدر سرخ ہو رہی ہیں میرا خیال ہے پھر کسی روز آ
گے آج واپس چلتے ہیں۔"

"میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک احسان نے مڑ
دیکھا۔"

"غالباً آپ نے رات سے کچھ کھایا نہیں ہے یا پھر آپ کا بی پی لو ہو رہا ہے یہ سامنے
کافی ہاؤس میں کافی بہت اچھی ہوتی ہے۔ اگر ایک کپ مناسب سمجھیں تو پی لیتے ہیں ا
آپ کی طبیعت بحال ہو گی۔"

میری آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا آ رہا تھا۔ میں نے سوچا حسان صحیح کہہ
پینے سے شاید طبیعت کچھ بحال ہو جائے اور زہرا پھر کافی پیتے ہوئے میں نے محسوس
نے کئی بار بہت غور سے مجھے دیکھا۔

"آپ بہت کمزور ہو گئی ہیں میرے خیال میں آپ کو اپنا مکمل چیک اپ کروانا
کہیں تو میں ڈاکٹر سے ٹائم لے لوں۔"

اور اس کی یہ ہمدردی میرے اندر جل تھل کیے دے رہی تھی۔ تم نہیں تھیں زہر
مجھے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ سب کو اپنے کام سے مطلب تھا...... ہاں انوار ہوتا تو شاید
انوار کا ہی کام تھا لیکن یہ مجھ سے حسان کہہ رہا تھا۔ میں نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

"شکریہ لیکن عامرہ اور آصفہ کی شادی ہو جائے تو پھر آرام سے چیک اپ کروا
دراصل مجھے بہت دنوں سے ہلکا بخار رہتا ہے۔"

"چاہیے آپ تب تک جان سے گزر جائیں حد کرتی ہیں آپ؟" حسان ے
ناراضی تھی۔

"میں کل ہی ڈاکٹر سے ٹائم لیتا ہوں ڈاکٹر حامد علی خان بہت اچھے اسپیشلہ

میرے ان سے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔"

اس کی یہ اپنائیت...... زہرا مجھے یوں لگا تھا جیسے انوار میرے سامنے بیٹھا میرے لیے پریشان ہو رہا ہو۔

اس کی ہمدردی اور اپنائیت پر میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ مجھے ایک دم انوار بے حد بے حساب یاد آ رہا تھا۔

"انوار کی خوش قسمتی ہے کہ اسے آپ جیسی بیوی ملی۔ خوبصورت خوب سیرت ہر لحاظ سے مکمل لیکن اس نے آپ کی قدر نہیں کی میں اکثر کہتا رہتا ہوں اسے لکھتا رہتا ہوں کہ وہ پاکستان آ جائے بہت کما لیا ہے اس نے۔" اس کا لہجہ بہت سادہ سا تھا زہرا لیکن میری آنکھیں سمندر بن گئیں میں وہیں...... ٹیبل پر سر رکھے بے تحاشا رونے لگی۔

"پلیز...... پلیز بھابی! یہ کافی ہاؤس ہے۔ ریلیکس پلیز!" اس نے ٹیبل پر رکھے میرے ہاتھ کو ہولے سے چھوا۔ "ریلیکس میں بات کروں گا انوار سے پھر بات کروں گا ایک بار۔"

زہرا اس کے ہاتھ کا لمس ایک بار پھر میرے اندر شعلے بھڑکا گیا۔ میرا سارا بدن کسی انجانی آگ سے جل اٹھا تھا۔ میرے اندر ایک دم انوار کے قرب کی طلب جاگ اٹھی تھی انوار کی رفاقت انوار کی قربت میں دس سالوں سے اُس سے دور تھی۔ دس سال بہت ہوتے ہیں نا زہرا! مجھے انوار کی محبت اور رفاقت کی کتنی زیادہ ضرورت تھی۔ میں تو محبتوں کی ترسی ہوئی تھی ابا بہت کم گو تھے انہوں نے کبھی کوئی فالتو بات نہیں کی تھی اور اماں کا تو تمہیں پتا ہی ہے انہوں نے تو کبھی زندگی میں ایک بار بھی کوئی محبت بھری نظر نہیں ڈالی تھی حالانکہ ایک بار تم نے ان سے کہا بھی تھا کہ اس محبت کے صدقے میں جو ابا مجھ سے کرتے ہیں آپ منوں پر بھی کبھی محبت کی نظر ڈال لیا کریں۔

لیکن زہرا محبتیں کہنے سے تو نہیں ہوتیں ان کا تعلق کا دل سے ہوتا ہے اماں کبھی بھی مجھ سے محبت نہ کر سکیں۔ انوار کو پا کر میں نے سوچا تھا میری عمر بھر کی تشنگی ختم ہو جائے گی تمہاری محبت کے باوجود میرے اندر جو کہیں ایک خلا سا تھا انوار کی محبت اس خلا کو پُر کر دے گی تم کہو گی کہ تم نے مجھے اتنا چاہا پھر میرے اندر یہ خلا کیوں رہ گیا تھا۔

تو زہرا ایک بار میں نے بھی سوچا تھا کہ کیوں ہے یہ خلا یہ کمی سی کیوں محسوس ہوتی ہے تمہاری شدید محبت بھی اس خلا کو پُر کیوں نہیں کر سکی تو پتا ہے مجھے میرے اندر سے کیا جواب ملا تھا شاید

اس لیے کہ تمہاری محبتوں پر میرا کوئی حق نہ تھا تمہاری محبتوں کو ہمیشہ میں نے ایک احسان کی طر
وصول کیا۔ میں ہمیشہ تمہاری محبتوں کی ممنون رہی۔ تم سے بے تحاشا محبت کرنے کے باوجود ایک
ایسی محبت جسے میں حق سمجھ کر وصول کروں اس کی خواہش ہمیشہ میرے اندر رہی انوار کی محبت تو م
حق تھی نا۔ اور انوار نے میری زندگی میں شامل ہو کر سارے خلا بھر دیے تھے میں سوچتی تھی ا
محبتوں کے معاملے میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا تم تھیں...... انوار تھا اور تمہاری محبتی
میں تو مالا مال تھی۔

لیکن انوار نے پھر مجھے غریب کر دیا۔ اور اب دس سالوں کی جدائی نے میرے اندر کے
کو گہرا کر دیا تھا۔

"بھابی پلیز!" حسان نے پھر میرے ہاتھ کو چھوا تو میں اپنے اندر کی طلب سے گھبرا کر یک
کھڑی ہوگئی۔

"چلیں!" میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

حسان نے بل پے کیا۔

"آپ خود بھی تو انوار سے بات کریں مجبور کریں اسے کہ وہ واپس پاکستان آجائے"
نے مجھے ڈراپ کرتے ہوئے کہا تھا اور میں نے سوچا تھا زہرا کہ وہ صحیح کہتا ہے اور اس رات
نے انوار کو فون کیا۔ میں روئی بھی زہرا! میں نے کہا بچوں کو اس کی ضرورت ہے میں اکیلی ب
داریاں نہیں سنبھال سکتی وہ چند ماہ کے لیے ہی سہی ایک بار آئے یا پھر ہمیں اپنے پاس بلوا۔

"تم پاگل ہوگئی ہو آمنہ میں تمہیں کیسے بلوا سکتا ہوں اور نہ ہی میں آسکتا ہوں سا
شدہ رقم میں نے عامرہ اور آصفہ کی شادی کے لیے بھیج دی ہے انشاء اللہ اگلے سال آؤں گا۔

"یہ تو آپ پچھلے دس سال سے کہہ رہے ہیں کہ اگلے سال آؤں گا...... انوار اب میر
کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری ہمتیں جواب دے گئی ہیں۔"

لیکن زہرا ہمیشہ کی طرح اگلے سال آنے کا وعدہ میری جھولی میں ڈال کر اس نے فور
دیا میرے دل نے مجھے بتایا کہ وہ اگلے سال بھی نہیں آئے گا۔ اسے میری ضرورت نہیں تھی
ساری ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں یہ رات بہت اذیت ناک تھی ایسی اذیت ناک رات پچھ
سالوں میں کبھی نہیں آئی تھی یا مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میرے اندر د

شعلے بھڑک اٹھے ہوں۔ کبھی لگتا جیسے یکدم کسی نے ٹھنڈے یخ پانی میں ڈبو دیا ہو۔ زہرا میں پوری
رات سو نہ سکی۔ کبھی رونے لگتی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی کبھی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتی صبح اذان
کے بعد میری آنکھ لگی تھی اور پھر فون کی بیل سے آنکھ کھلی۔

دوسری طرف حسان تھا اور بہت تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ "کیسی طبیعت ہے آپ کی میں
آپ کے لیے بہت پریشان رہا۔ آپ کی حالت مجھے صحیح نہیں لگ رہی تھی۔"

اس ہمدردی پر میرا دل بھر آیا۔

"پلیز آپ روئیں مت مجھے تکلیف ہو رہی ہے؟" حسان بے چین سا ہو گیا میرے آنسو
رک ہی نہیں رہے تھے۔

"پلیز مت کریں ایسا میں شام کو آؤں گا آپ شام تک بالکل فریش ہوں اب بالکل نہیں
رونا...... پلیز!"

اور زہرا مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اور کیسے حسان کا اپنے لیے پریشان ہونا۔ اور خیال رکھنا
اچھا لگنے لگا۔ حسان نے عامرہ اور آصفہ کی شادی کی ساری تیاریوں میں میری ہیلپ کی۔ وہ
ام آجاتا تھا۔ فرنیچر سے لے کر جیولری تک کی خریداری میں وہ ساتھ رہا۔ کبھی عامرہ آصفہ بھی
ہوتیں کبھی اکیلے۔

شادی کی تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں لیکن شادی چھ ماہ لیٹ ہوگئی تھی دونوں بہنوں کی شادی
ہی گھر میں دو بھائیوں سے ہو رہی تھی ان کے ہاں کوئی مسئلہ ہو گیا تھا یوں بھی شادی کی
ہاں مکمل ہوگئی تھیں اس لیے حسان کا آنا کم ہو گیا تھا بلکہ اب تو وہ پندرہ بیس دن بعد ہی چکر
تھا مجھے لگتا زہرا جیسے کہیں کچھ کمی ہوگئی ہے ان گزرے دنوں میں اس نے میرا بہت خیال
تھا مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے آئرن کی کمی بتائی تھی جب بھی شاپنگ
لیے جاتے وہ اصرار کر کے انار اور سیب کا جوس پلاتا۔ اب تقریباً ایک ماہ ہو گیا تھا مجھے حسان
ملے اور بات کیے ایک بار وہ گھر آیا تھا حسبِ معمول...... انوار کی طرف سے آئے ہوئے پیسے
نے تب میں بچوں کے اسکول میں پیرنٹس میٹنگ میں گئی ہوئی تھی۔

اس روز صبح سے میری طبیعت خراب تھی۔ میں جلد ہی اپنے کمرے میں آگئی تھی اور پھر شاید
لی کسی طلب سے مغلوب ہو کر میں نے حسان کو فون کر دیا۔

"ارے آپ اس وقت خیریت ہے نا" حسان گھبرا گیا اس کی بیوی ابھی تک میکے میں

"ہاں خیریت ہے بس یوں ہی طبیعت گھبرا رہی تھی۔"

"اوہ تھینک گاڈ!" اس نے شکر کا سانس لیا۔

"میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔"

زہرا، اس روز اس نے مجھے مشورے دیے کہ میں کوئی کورس کرلوں۔ اپنے آپ کو مص کرلوں وغیرہ......وغیرہ۔

میں بھی اس کی بیوی کے متعلق پوچھتی رہی۔ اور پھر پتا ہی نہیں چلا زہرا کہ ہم نے ک بات کی شاید دو گھنٹے سے زیادہ پھر یہ سلسلہ چل ہی پڑا۔ ہم دو دو گھنٹے بات کرتے رہتے او گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ حسان کی وہی روٹین تھی ہر ماہ انوار کے ارسال کردہ روپے آتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا جاتا۔ شادی کی شاپنگ کے بعد میں کبھی اس کے ساتھ باہر نہ لیکن فون پر اس سے بات کرتی رہی۔ ہر بات شیئر کرنا مجھے اچھا لگنے لگا۔ کئی بار میں نے س میں یہ صحیح نہیں کر رہی ہوں کہیں اس کا انجام خراب نہ ہو لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا زہرا! اگر میر کرتی تو وہ کرلیتا۔ وہ بھی اپنے بچوں اور بیوی کے لیے اداس تھا۔ ہم دونوں ایک دوسر اپنی تنہائی شیئر کرنے لگے تھے۔ میں جانتی ہوں یہ غلط تھا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن زہرا اس کے علاوہ تو ہمارے درمیان کچھ بھی نہ تھا اس کے چند ہمدردی بھرے جملے میر کی تھکن دور کردیتے تھے۔

میں صبح سے شام تک ہونے والی ہر بات اس سے کہہ کر ہلکی پھلکی ہوجاتی تھی وہ ج وقت گھٹن سی محسوس ہوتی رہتی تھی مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی اونچی چار دیواری میں بند ہوں او آہستہ میرا سانس گھٹ رہا ہے لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی صورت میں کی گفتگو اس گھٹن کو کم کردیتی تھی میرے اندر بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں میری چڑچڑاہ گئی تھی اور میں اپنا خیال بھی رکھنے لگی تھی ورنہ تو مجھے لگنے لگا تھا جیسے زندگی میرے اند ہولے مر رہی ہو۔

زہرا، مالی پودوں کی دیکھ بھال کرنا انہیں پانی دینا بند کردے تو وہ مرجھا جاتے ہیں ہولے مرنے لگتے ہیں عورت بھی تو پودوں کی طرح ہوتی ہے شوہر اسے اپنی محبت اور رفاق

محروم کردے تو وہ مرجھا جاتی ہے ہولے ہولے مرنے لگتی ہے۔

انوار نے بھی تو مجھے اپنی محبت و رفاقت سے محروم کردیا تھا زہرا کبھی خط میں کبھی فون پر ہی وہ چند جملے کہہ دیتا تو شاید اتنی گھٹن نہ ہوتی مگر وہ تو بس چند ڈالر بھیج کر سمجھنے لگا تھا کہ اس نے فرض ادا کردیا تم تھیں نا یہاں تو تم سے ہر بات کہہ کر میں ریلیکس ہوجاتی تھی پھر تم چلی گئیں تو میں بہت تھکنے لگی تھی بہت گھٹن محسوس ہوتی تھی مجھے میں نے تو بس ایک چھوٹا سا روزن ڈھونڈا تھا زہرا ننھا سا روزن جس سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے رہیں اور میرے اندر کی زندگی باقی رہے میں مانتی ہوں زہرا میں نے بہت بڑی غلطی کی میری عمر بھر کی ریاضتیں محبتیں محنتیں سب رائیگاں چلی گئیں کسی نے میری بات نہیں سنی زہرا کسی نے مجھ سے سوال نہیں کیا بس فرد جرم عائد کردی مجھے آوارہ بددیانت اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا گیا۔ آصفہ نے مجھے دو ایک بار بات کرتے دیکھا تھا وہ اچانک ہی کسی کام سے رات میرے کمرے میں آئی تھی میں نے گھبرا کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

اور اس کے استفسار پر بتایا کہ رانگ نمبر تھا پتا نہیں اسے شک ہوگیا تھا یا کسی ضرورت کے لیے اس نے رات میں فون اٹھایا تھا اور ایکس ٹینشن پر ہماری بات سنی تھی۔ مجھے یاد تو نہیں زہرا شاید حسان کہہ رہا تھا کہ میں اپنا خیال نہیں رکھتی یا شاید یہ کہ مجھے انوار سے بات کرنا چاہیے اور حسان کو فوراً ہی محسوس ہوگیا تھا "کسی نے ایکس ٹینشن اٹھایا ہے۔" اس نے کہہ کہ فون بند کردیا تھا اور میں سہمی ہوئی سی بیڈ پر بیٹھی تھی کہ آصفہ عامرہ اور خالہ سب ہی آگئے خالہ جان مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئیں۔

"تو یہ لچھن ہیں تمہارے میرا بیٹا بے چارہ پردیس میں محنت کر رہا ہے اور تم یہاں راتوں کو غیر مردوں سے باتیں کرتی ہو۔"

زہرا میں تمہیں کیا بتاؤں انہوں نے مجھے کیا کیا کچھ کہا۔ میں کتنا تھکی ہوں ان سب کے لیے لیکن انہیں تو کچھ بھی یاد نہ رہا تھا تب۔ اور یہی نہیں انہوں نے زارا اور علی کو بھی جگا کر میرے سامنے کھڑا کردیا۔

"یہ تمہاری ماں ہے آوارہ اور بددیانت۔"

ان کی عمریں ہی کتنی ہیں بارہ سالہ زارا اور دس سالہ علی۔ علی تو نیند کا اتنا کچا ہے کہ اس کی تو آنکھیں ہی نہیں کھل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پہلے حیرت پھر نفرت بے بسی بے چارگی پتا

نہیں کیا کچھ تھا ان آنکھوں میں زہرا میں ان سے نظریں نہیں ملا سکی اور پتا نہیں بعد میں کیا کیا کچھ بتایا گیا ہے انہیں کہ ان تین دنوں میں انہوں نے میرے کمرے میں جھانکا تک نہیں۔ زہرا انوار کے فیصلے سے پہلے ہی شاید میں علی اور زارا کی آنکھوں کی نفرت سے مر جاؤں گی۔ میرے لیے د کرو زہرا! مجھے بچا لو انوار نے ابھی تک فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ میں حیران ہوں اس نے کچھ کیا کیو نہیں؟ لیکن ہاں یاد آیا انوار تو آؤٹ آف سٹی ہوگا۔ شاید اس سے ابھی تک ان کا رابطہ ہی نہیں سکا ورنہ مرد کو فیصلہ کرنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ صرف تین لفظ ہی تو کہنے ہوتے ہیں اسے مج یاد آ رہا ہے دو تین دن پہلے ہی تو انوار کا فون آیا تھا کہ وہ چھٹیاں گزارنے ایک ماہ کے لیے فران جا رہا ہے وہ تو ہر سال ہی گھومنے جایا کرتا ہے ایک بار میں نے اس سے کہا تھا وہ یہ ایک ماہ پاکستا میں گزار جائے لیکن اس نے ستر بہانے کیے تھے زہرا!

میں قصوروار ہوں زہرا! میں نے گناہ کیا ہے لیکن کیا صرف میں ہی گناہگار ہوں کیا انوا کوئی قصور نہیں ہے؟ تم جانتی ہو نا زہرا آج کل یا ایک ماہ بعد جب بھی انوار کو یہ سب پتا چلے گا کیا فیصلہ کرے گا...... وہی جو غیرت مند مرد کیا کرتے ہیں لیکن زہرا تب میں کیا کروں گی؟ م کہاں جاؤں گی کیا میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کو معاف نہ کیا جا سکے۔

کون میری دادرسی کرے گا کون میری وکالت کرے گا کسی نے تو مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہ ہاں تم...... تم نے صرف پوچھا ہے کہ کیا یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ تو زہرا یہ سچ ہے لیکن تم بھی زہرا صرف...... صرف اتنا بتا دو مجھے کہ کیا سارا قصور میرا ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو آ کر اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ دو۔ میں بھلا اتنی نفرتوں کے ساتھ کیسے زندہ رہ پاؤں گی۔ ہاں زہرا علی اور زا پھر تمہاری نفرت کے بعد زندہ رہنے کی خواہش نہیں رہے گی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ صرف ایک تم ہو اس بھری دنیا میں جو مجھے جان سکتی ہو اور جو مجھے میری غلطی کے باوجود سکتی ہو۔ زہرا تم ہی بتاؤ اس خط کے بعد جو میں تمہیں بھیج رہی ہوں اور جو انوار نے حسان کو لک اور جسے پڑھنے کے بعد ہی شاید ردعمل کے طور پر میں نے یہ روزن تلاش کیا تھا۔ میں اتنی ہی ہوں جتنا یہ سب سمجھ رہے ہیں۔ تم یہ نہ کہنا زہرا کہ میں نے ہر مجرم کی طرح اپنے جرم اور گ دلیل ڈھونڈی ہے۔ میں اپنا دفاع نہیں کر رہی زہرا میں نے تو سب لفظ لفظ تم سے کہہ دیا۔ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا۔ چاہو تو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دو اور چاہو تو کچھ رعایت دے کر م

کر دو۔ بہر حال قصوروار تو میں ہوں نا زہرا! لیکن مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ اس وقت...... پلیز آ جاؤ نا زہرا اور مجھے ان سب کی نظروں سے چھپا لو زہرا میری اپنی زہرا مجھے چھپا لو کہیں اور کسی اور جگہ لے چلو۔

تمہاری آمنہ

☆☆☆

ٹیکساس، امریکا

حسان یار

تمہارے خط ملتے رہتے ہیں اور فون پر بھی بات ہوتی رہتی ہے میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم میری عدم موجودگی میں سب کا خیال رکھتے ہو۔ چند ماہ کی بات ہے پھر اقدار کی ایجوکیشن ختم ہو جائے گی اور وہ گھر آ جائے گا اور جہاں تک واپسی کی بات ہے تو فی الحال میرا ارادہ نہیں ہے اور شادی وغیرہ میں نے نہیں کی۔ البتہ میں جوڈی کے ساتھ رہتا ہوں یہاں شادیوں کا رواج نہیں ہے نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی سے اکٹھے رہتے ہیں جب تک دل چاہتا ہے اور جب ناراضی ہو جاتی ہے تو الگ ہو جاتے ہیں شروع میں آن مجھے ملی تھی میں اسی کے فلیٹ میں رہنے لگا تھا اچھی لڑکی تھی مگر وہ شادی کرنا چاہتی تھی سو میں نے اس سے پیچھا چھڑا لیا اب جوڈی ہے بہت کیوٹ جوڈی میکسیکن ہے اور یہ میکسیکن لڑکیاں بہت وفادار اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی ہوتی ہیں ہم سات سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں وہ میرا اس طرح خیال رکھتی ہے جس طرح کہ ایک بیوی رکھتی ہے کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی جوڈی سے محبت کرنے لگا ہوں یار یہ جوڈی تو میرے شب و روز پر قابض ہو چکی ہے بڑی ساحر عورت ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے۔

بچوں کا خیال رکھنا آمنہ تو بے وقوف سی ہے۔ اسے باہر کی خبر نہیں بچوں کو کس اسکول میں ایڈمیشن دلوانا ہے کون سی اکیڈمی جوائن کرنا ہے یہ سب تمہیں ہی گائیڈ کرنا ہے اچھا اب خدا حافظ کہہ لوں۔ جوڈی آج غضب کی حسین لگ رہی ہے اور ہمارا پروگرام کہیں باہر جانے کا ہے بچوں کو پیار اور بھابی کے لیے آداب۔

تمہارا دوست

انوار

☆☆☆

لاہور پاکستان

''انوار بھائی!''

السلام علیکم!

امید ہے آپ اب تک اپنی طویل چھٹیاں گزار کر واپس آ چکے ہوں گے۔ جوڈی کے ساتھ آپ نے یہ چھٹیاں بہت انجوائے کی ہوں گی لیکن شاید یہ چھٹیاں گزارتے ہوئے آپ نے ایک بار بھی آمنہ کے متعلق نہیں سوچا ہوگا۔ آپ یقیناً میرا خط پا کر حیران ہو رہے ہوں گے اور شاید میرے خط کے ساتھ ہی اور بھی خطوط آپ کے منتظر ہوں گے جو آپ کے گھر سے آپ کی والدہ بہنوں یا بھائی نے بھیجے ہوں گے یا پھر ممکن ہے کسی نے کوئی خط نہ بھیجا ہو وہ آپ کے فون کے منتظر ہوں کہ آپ واپس آ کر فون کریں اور وہ آمنہ کے جرم اور گناہ کی تفصیل آپ کو بتا کر آپ سے فیصلہ چاہیں لیکن انوار بھائی! کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار غور ضرور کیجئے گا اور اس سوال کا جواب خود سے پوچھئے گا جو آمنہ نے مجھ سے پوچھا ہے کیا صرف آمنہ ہی قصوروار ہے؟

بہت پہلے جب میں کالج میں پڑھا کرتی تھی تو ہمارے محلے میں ایک عورت رہتی تھی جس کا شوہر سعودیہ میں یا عرب امارات میں کہیں جاب کرتا تھا اور اس کے متعلق ہر روز نئی نئی باتیں اڑا کرتی تھیں کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے اور ڈس اونسیٹ ہے اپنے شوہر کے ساتھ بددیانتی کرتی ہے تب اور سب کی طرح میں بھی اس سے نفرت اور کراہیت محسوس کرتی تھی اور سوچتی تھی کہ یہ کیسی عورت ہے جو اپنے شوہر کی وفادار نہیں ہے جو بے چارہ اس کی خاطر صحراؤں کی خاک چھان رہا ہے اور اجنبی دیاروں میں پتھر ڈھوتا ہے۔ وہ ایک ان پڑھ عورت تھی اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی مگر ایک بار بہت بعد میں جب میں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی تو ایک روز میری ایک فرینڈ کی ممی نے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا تھا کہ وہ مرد جو اپنی نئی نویلی بیویوں کو چھوڑ کر دور دیس چلے جاتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں۔

میری فرینڈ کی ممی ایجوکیٹڈ تھیں اور کالج میں لیکچرار تھیں ان کی ایک کولیگ جن کا شوہر شادی کے صرف دس دن بعد انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی تھیں اور ان دنوں وہ ہماری

کے پاس سیٹنگ کے لیے آتی تھیں۔ اور میری فرینڈ کی ممی ان کے ساتھ آتی تھیں اور ہم لوگ وں مسز نازگل کے ساتھ فونٹین ہاؤس جایا کرتے تھے اور اکثر ان کے پرائیویٹ کلینک میں چلے جایا کرتے تھے۔ انوار بھائی شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ حضرت عمرؓ نے ایک عورت کی فریاد جاری کیا تھا کہ جنگ پر جانے والا ہر مرد تین ماہ (یا شاید اس سے زیادہ ماہ ہوں مجھے ٹھیک ا نہیں بہت پہلے پڑھا تھا میں نے) بعد چھٹی پر گھر آئے گا۔ لیکن آج تو کوئی حضرت عمرؓ نہیں ہے جو ایسا کوئی حکم جاری کرے کہ دور دیس جانے والے مردوں کو وطن بھی لوٹنا چاہیے جہاں بیویاں ان کی رفاقت و محبت سے محروم ہو کر مرجھا جاتی ہوں اور کبھی کبھی اندر کی گھٹن سے گھبرا کوئی روزن تلاش کر لیتی ہوں آمنہ کی طرح...... مگر ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ صرف روزن ل کیا جائے کبھی کبھی گھٹن اتنی بھی بڑھ جاتی ہے کہ دروازے کھول دیے جاتے ہیں شکر ہے نہ نے دروازہ نہیں کھولا صرف روزن تلاش کیا ہے میں یہ نہیں کہتی کہ آمنہ نے اچھا کیا ہے یا غلطی نہیں کی لیکن انوار بھائی خلیل جبران کہتا ہے کہ۔

''جب تم میں سے کوئی کسی خیانت کار بیوی کو انصاف کی پیش گاہ میں لائے تو اسے چاہیے کے شوہر کے دل کو بھی ترازو میں رکھے اور اس کی روح کو بھی پیمانے سے ناپے۔''

نوار بھائی فیصلہ تو آپ نے ہی کرنا ہے لیکن بس فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار صرف ایک آپ سے بھی پوچھ لیجئے گا کہ کیا قصور صرف آمنہ کا ہے؟ اور ہاں آمنہ میرے پاس آپ کی منتظر ہے۔

زہرا''

☆☆☆

انوار احمد ہوں پیشے کے لحاظ سے الیکٹریکل انجینئر ہوں اور تقریباً دس سال سے یہاں مقیم ہوں میرے سامنے یہ تینوں خط پڑے ہیں میں کل شام ہی جوڈی کے ساتھ طویل گزار کر آیا ہوں۔ میری عادت ہے کہ میں آتے ہی اپنا میل باکس چیک کرتا ہوں۔ ساری رکھتے ہوئے اس بھاری بھرکم لفافے نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی یہ خط تھا میں نے سب سے پہلے اسے ہی کھولا شاید اقدار نے اپنے کوئی پیپر بھیجے ہوں۔

میں نے کئی بار اسے کہا تھا کہ وہ اپنے پیپر بھجوا دے تا کہ میں اسے اسپانسر کر سکوا
میرے سامنے زہرا کا خط تھا اور آمنہ کا طویل خط تھا جو اُس نے زہرا کو لکھا تھا اور خود میرا لکھا جو میں نے حسان کو بھیجا تھا۔

میں نے ان تینوں خطوط کو کوئی تین بار پڑھا ہے زہرا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اپ سے پوچھوں کہ کیا سارا قصور آمنہ کا ہے؟ اور میں نے کتنی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہ مجھے لگا کہ سارا قصور آمنہ کا ہے۔ وہ ہی تھڑ دلی اور بے حوصلہ عورت ہے اور کبھی مجھے لگا جیسے کہیں قصوروار ہوں۔ میں مکمل طور پر خود کو بری نہیں کر سکتا۔ قصوروار کوئی بھی ہو میں نے ف ہے کہ مجھے واپس جانا ہے اور میں نے جوڈی کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے کہ میں وط ہوں اور اب واپس آؤں گا تو آمنہ اور بچوں کے ساتھ۔ جوڈی مسلسل رو رہی ہے اُس ک میرے دل پر گر رہے ہیں۔ سات سال کی رفاقت اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتی۔ شاید ا آنسو ہمیشہ میرے دل کو بھگوتے رہیں۔ شاید یہی میری سزا ہے اور یہی میرا کفارہ ہے۔ ک ہمیشہ بھیگے دل کے ساتھ زندگی کے باقی ماندہ دن آمنہ اور بچوں کے ساتھ گزاروں مجھ ہے۔ آپ کو بھی میرا فیصلہ پسند آیا ہوگا۔ میں جوڈی کے آنسوؤں سے نظر بچا کر ایک بار پھ خط پڑھ رہا ہوں۔ اور ہر لمحہ میرا فیصلہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔

● ○ ●

وہ آج بڑے دنوں بعد "امن ہاؤس" آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح گیٹ کے پاس ر نے امن ہاؤس کے گیٹ کے ساتھ والی دیوار پر پینٹ کی ہوئی فاختہ کو دیکھا تھا اور کچھ د ہو کر یوں ہی دیکھتی رہی تھی۔ اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی یہ فاختہ اس طرح ی موجود تھی اگرچہ کہیں کہیں سے اس کا پینٹ اب اڑ گیا تھا اور یہ فاختہ شارب نے بنائی تھ نے ہی امین ہاؤس کے امین کے نیچے سے دو نقطوں پر برش پھیر دیا تھا۔

"یہ امن ہاؤس ہے محبت کا گہوارہ یہاں آج تک کبھی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ آئندہ ؟

"اور جو کبھی تمہاری بیوی آ گئی۔ لڑاکو جھگڑالو۔" وہ اسے چھیڑتی۔

"جی نہیں میری بیوی لڑاکو جھگڑالو نہیں ہوگی۔ اسے اس گھر میں قدم رکھنے سے امن کی فاختہ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانی ہوگی کہ وہ اس گھر کا سکون تباہ نہیں کرے گی اور اگر

اسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔"

"اور ہمیں کسی کو باہر سے لانے کی کیا ضرورت ہے۔" مونا شرارت سے اسے دیکھتی "اس معاملے میں کیا ہم خود کفیل نہیں ہو سکتے کیوں سونو۔"

اور وہ کندھے اچکا کر رہ جاتی شارب کی آنکھوں میں کوندا سا لپکتا اور ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ دوڑ اٹھتی۔

"اور کیا خبر ان خود کفیل لوگوں کو لمبی اڑانوں کا شوق ہو اور وہ اس خوب صورت باغ سے اڑ جائیں پھر کیا کرو گی مونا۔"

"شارب کے بچے! منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالتے ہیں۔"

مونا کو فوراً ہی غصہ آ جاتا تھا۔

اور شارب کی بات کتنی صحیح ہو گئی تھی حالانکہ اسے لمبی اڑانوں کا شوق تو ہرگز نہیں تھا پھر بھی۔

اور یہ گھر واقعی امن ہاؤس تھا۔ شارب نے اسے کتنا صحیح نام دیا تھا پارٹیشن سے پہلے کے بنے ہوئے اس وسیع و عریض گھر کے مالک امین الملک تھے اور ان کی صرف تین اولادیں تھیں دو بیٹے اور ایک بیٹی بیٹی تو بیاہ کر کراچی چلی گئی تھی اور دونوں بیٹے اس گھر میں رہتے تھے۔

بڑے بیٹے کے دو بچے تھے شارب اور مونا۔

چھوٹے بیٹے کی ایک ہی بیٹی تھی سنبل۔

اور سب آپس میں بہت پیار و محبت سے رہتے تھے۔ جتنا پیار بڑی امی اور چھوٹی امی میں تھا اتنا ہی تینوں بچوں میں تھا۔ جب تک امین الملک زندہ رہے ان کی خواہش تھی کہ بیٹے اکٹھے ہی رہیں لیکن ان کی وفات کے بعد بھی دونوں بھائیوں نے الگ ہونے کا کبھی نہیں سوچا تھا ایک بار امین الملک صاحب کی زندگی میں ہی ان کی بیوی کو خیال آیا کہ لڑکیوں کو شوق ہوتا ہے اپنے الگ گھر کا الگ کھانے پکانے کا سو انہوں نے دونوں بہوؤں سے کہا کہ وہ چاہیں تو الگ الگ کھا پکا لیں مگر دو دن بعد ہی شارب اور مونا چھوٹی امی کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور سنبل اور اس کے ابا بڑی اماں کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

"بھابی! ہمیں تو آپ ہی کے ہاتھوں کا پکا کھانا مزا دیتا ہے۔"

اور یوں دو دن بعد ہی پھر اکٹھا پکنے لگا تھا۔

اور کتنے خوب صورت تھے وہ دن۔

سنبل نے ایک گہری سانس لی اور گیٹ کو ہولے سے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئی ہوا میں کچے امرودوں کی باس تھی اور تیز ہوا شاں شاں کر کے درختوں میں سے گزر رہی تھی امین ہاؤس کے لان میں بے شمار درخت تھے اور دادا ابا کا شوق تھا کیلے امرود جامن آم حتیٰ کہ لیچی کے درخت بھی تھے اور بے شمار پھولوں کے پودے انہیں عشق تھا پھولوں اور پودوں سے وہ پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آئی اندر خاموشی تھی بڑے ابا اور ابا تو شاید اس وقت اپنے اپنے آفس میں ہوں گے اور امی اور بڑی امی کہیں کسی کمرے میں اکٹھی بیٹھی ہوں گی۔

اس نے ٹی وی لاؤنج میں رک کر سوچا۔

اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ میرے دو تین اور بہن بھائی ہوتے تو گھر میں رونق لگی رہتی مونا کی اور اس کی شادی اور شارب کے جانے کے بعد امن ہاؤس کتنا ویران ہو گیا تھا بس جب مونا آ جاتی سسرال سے یا کبھی چھٹیوں میں پھپھو تو رونق لگ جاتی تھی ورنہ تو بے چاری امی اور بڑی امی اکیلی بور ہوتی رہتیں اور وہ بھی تو مہینوں بعد آ پاتی تھی فرصت ہی نہ ملتی تھی پارٹیاں ڈنر میٹنگز آئے دن کچھ نہ کچھ مصروفیت رہتی۔

اور ہاشم علوی کہاں پسند کرتا تھا اس کا زیادہ میکے آنا جانا اور آج بھی وہ بڑی مشکل سے نکل پائی تھی ہاشم تو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے اسلام آباد چلا گیا تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے چلی آئی تھی حالانکہ ہاشم نے کہا تھا کہ وہ گھر پر ہی رہے کہ شاید آج گاؤں سے کوئی مہمان آ جائیں۔ لیکن وہ ملازموں کو ہدایت دے کر نکل ہی آئی تھی کہ چند دن پہلے جب امی سے فون پر بات ہوئی تھی تو انہوں نے بتایا تھا کہ بڑے ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی اور وہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ تب سے ہی وہ بے چین تھی بڑے ابا سے ملنے کے لیے اور بڑے ابا کتنا پیار کرتے تھے اس سے ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے۔

''بابا! یہ زیادتی ہے آپ سونو کی غلط سائیڈ لیتے ہیں چاہے غلطی اس کی ہو۔'' شارب کبھی کبھی ان سے الجھ پڑتا۔

''ہاں تو ہم لیں گے سائیڈ۔ چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو کہ یہ تو ہماری بہت پیاری بیٹی ہے اور اسے تو ہم نے بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد پایا ہے۔''

امی اسے بتایا کرتی تھیں کہ چونکہ ان کی اولاد نہیں بچتی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے تین ائی دو دو اور تین تین ماہ کے ہو کر مر گئے تھے تو جب وہ پیدا ہوئی تھی تو بڑے ابا نے مسلسل ایک ماہ کے نفلی روزے رکھے تھے اور ننگے پاؤں در رسول پر حاضری دی تھی اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کی زندگی کی دعا مانگی تھی پھر وہ بڑے ابا کو کیونکر عزیز نہ ہوتی۔

اور جب اس نے ہاشم سے کہا تھا کہ وہ بڑے ابا کو دیکھنے جانا چاہتی ہے تو ہاشم نے اسے ل لیا تھا۔

''نہیں یار! آج کیسے جا سکتی ہو آج تو صوبائی وزرا سب اکٹھے ہو رہے ہیں شاید میں انہیں روں۔''

اور اسی شاید شاید میں ہفتہ گزر گیا تھا اور اس نے پھر امی کو فون بھی نہیں کیا تھا اس خدشہ سے ہیں امی سے بات کرتے ہوئے وہ ضبط نہ کھو بیٹھے ایسے ہی دل بھرا ہوا تھا کہ وہ ان احساسات زاکت کو سمجھتا ہی نہ تھا کہ میکے اور میکے سے وابستہ افراد کتنے پیارے ہوتے ہیں اور کیسے دل ا دیکھنے اور ملنے کو ہمکتا ہے اور پھر یہ تو بڑے ابا تھے جنہوں نے اسے گودوں کھلایا تھا اور بچپن وہ اکثر ضد کر کے ان کے پاس ہی سو جایا کرتی تھی۔

حالانکہ ہاشم علوی کو محبت کرنے کا دعویٰ تھا اور محبت کرنے والوں کے دل تو گداز ہوتے ہیں اور حساس۔

لیکن پتا نہیں ہاشم کا دل کیسا تھا سخت اور بے حس پتا نہیں اس کا دل ہمیشہ سے ایسا ہی تھا یا ہو گیا تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں کھڑی سائیڈ والی دیوار پر لگے بارہ سنگھے کے سینگوں کو دیکھنے لگی اور بچپن ں اسے ان سینگوں سے دلچسپی تھی۔

''یہ ہرن بابا نے شکار کیا تھا۔'' شارب اسے بتایا کرتا۔

''بابا نے تو بڑے بڑے شیروں اور چیتوں کو بھی مارا ہے۔''

''اچھا!'' وہ مرعوب ہو جاتی اور بڑے ابا سے ضرور پوچھتی بڑے ابا یہ ہرن آپ نے شکار

بیٹا! ایک دوست نے تحفہ دیا تھا۔''

اوران سینگوں کو ہاتھ لگا کر اسے عجیب سنسنی سی محسوس ہوتی کبھی یہ کسی زندہ ہرن کے تاج ہوں گے اوراب۔

''تم آج بھی ان سینگوں کو اتنی ہی دلچسپی سے دیکھتی ہو سونو۔'' وہ یک لخت پلٹی تھی شار اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

''شارب! تم......تم کب آئے۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی تھی۔''

''کل رات......'' شارب کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔

''کہاں چلے گئے تم اچانک بغیر بتائے اور سب لوگ کتنے پریشان ہوئے جانتے ہ ابا کو میں نے خود روتے دیکھا ہے۔''

''شارب نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور آہستگی سے چلتا ہوا اس کے کھڑا ہوا تم کیسی ہو ٹھیک تو ہو نا۔''

''ہوں'' اس نے سر ہلا دیا لیکن آنکھوں میں چمکتے جگنو پلکوں پر آکر اٹک گئے تو نظریں جھکالیں۔

''اور تم کیسے ہو شارب! اتنے برسوں کیسے رہ لیے سب سے دور۔''

''بیٹھو نا۔ میں کتنی دیر سے دیکھ رہا تھا تم کھڑی ہو۔''

وہ خاموشی سے واپس صوفے پر بیٹھ گئی شارب بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اکیلی آئی ہو؟ ہاشم کدھر ہے۔''

''ہاشم تو اسلام آباد گئے ہیں میں بڑے ابا کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی ڈرائیور گیا ہے پھر اسے اسٹیشن جانا تھا کچھ مہمانوں کو لینے اور کیسے ہیں بڑے ابا۔''

''وہ بہتر ہیں اس وقت تو سو رہے ہیں دراصل رات سب ہی دیر تک جاگتے رہے

''تھینک گاڈ!'' اس نے سکون کا سانس لیا۔

''مجھے بہت پریشانی تھی شارب! اب کہیں نہ جانا انہیں چھوڑ کر۔''

ریلیکس ہوتے ہوئے اس نے دھیان سے شارب کی طرف دیکھا ان بارہ برسو زیادہ نہیں بدلا تھا بس کچھ رنگت سنولا گئی تھی اور چہرے سے دبلا بھی لگ رہا تھا۔

بارہ سال کچھ بہت زیادہ عرصہ تو نہیں ہوتا لیکن اسے لگتا تھا جیسے وہ صدیوں بعد اسے دیکھ رہی ہو بارہ سال بارہ صدیاں بن کر ہی تو گزرے تھے اس پر۔

''تم نے بتایا نہیں شارب! کہاں چلے گئے تھے۔''

''کہاں چلا گیا تھا سونو کیا بتاؤں؟''

نگر نگر گھومتا پھرا میں۔

مغرب کے بیکراں شہر مجھ کو حیرت سے دیکھتے تھے میں ان دیاروں کی اجنبی وسعتوں میں۔

نگر نگر گھومتا پھرا میں۔

جو سر اٹھاتی تھی وحشت دل

تو سب فصیلوں کو توڑتا

شکستہ خوابوں کو جوڑتا

اجنبی فضاؤں میں کھو گیا تھا۔

اس کا شعری ذوق آج بھی اتنا ہی نکھرا ہوا تھا اور لہجہ بھی اتنا ہی دلکش اور خوب صورت تھا۔

''تمہیں آج بھی شعروں سے اتنی ہی دلچسپی ہے شارب؟'' سنبل نے پوچھا تو وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''ہاں سونو! مجھے آج بھی ہر اس شے سے دلچسپی اور محبت ہے جس سے آج سے بارہ سال پہلے تھی۔ ہم تو اس در گرفتہ است و خوب گرفتہ است کے قائل ہیں سنبل بی بی!''

اور ان دنوں اسے شعروں سے کتنی دلچسپی ہوا کرتی تھی اور ہر بات کے جواب میں وہ کھٹ سے ایک شعر پڑھ دیتا تھا اور جب پھپھو کے بچے آئے ہوتے تھے تو پھپھو کی سب سے بڑی بیٹی بینہ اس کے ان بے تحاشا شعروں سے کتنا چڑتی تھی۔

''دراصل سائنس پڑھ پڑھ کے اس کا دماغ خشک ہو گیا ہے لطیف چیزوں سے اس کا ہاضمہ اب ہو جاتا ہے۔''

شارب اس کے چڑنے کی بالکل پروا نہیں کرتا تھا اور شعر پر شعر پڑھتا جاتا اور خود اسے بھی لی دلچسپی تھی شاعری سے ہر نئی کتاب جاکر وہ ضرور خریدتی تھی اور پھر جب تک اس کے اچھے شعر شارب کو سنا نہ لیتی۔ اسے چین نہیں آتا تھا اور شارب بھی تو ایسا ہی کرتا تھا جب شاعری

کی کوئی نئی کتاب خریدتا تھا تو جب تک اس میں سے اچھے اچھے شعر اسے سنا نہ لیتا اسے چین آتا تھا اور کاش کوئی اچھے اور خوب صورت دنوں کو وہیں منجمد کر دیتا وقت کو روک لیتا۔

اور اب تم جب شاعری کی کتابیں خریدتے ہو تو کسے شعر سناتے ہو؟......اس کا جی چاہا شارب سے پوچھے لیکن کیا وہ اس سے یہ پوچھنے کا حق رکھتی تھی؟

اس کے دل کے اندر ایک آنسو گرا اور پھر ٹپ ٹپ برسات ہونے لگی۔

اور وہ یونہی صوفے کی سائیڈ پر کہنی رکھے کھوسی گئی۔

☆☆☆

میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ کی چوٹیوں پر شعاعیں
انہیں سے وہ خورشید چھوئے گا آخر
بخارا و سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں

ہاشم کی آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔

خوب صورت بھاری سحر طاری کرتی ہوئی آواز۔

''میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو۔''

ہاشم نے پورے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور مسکرایا بے شمار ہاتھ بلند ہو گئے تھے میں موجود افراد جیسے یکدم اس کی آواز کے سحر سے نکل آئے تھے اور پھر ہال تالیوں سے گ سنبل کے ہاتھ تالیاں بجاتے بجاتے سرخ ہو گئے وہ بے خودی میں تالی بجائے جا رہی تھ تک کہ ہال میں صرف اس کی تالی کی آواز رہ گئی تو مونا نے ہولے سے اس کے ہاتھ پکڑ۔

''اب بس بھی کرو سونو!''

''یار یہ ہاشم کتنا خوب صورت بولتا ہے میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس طر اسٹیج پر کھڑی ہو کر دھواں دھار تقریر کروں اور اس ملک اور قوم کی قسمت بدل دوں۔''

''قوم کی قسمت اور تقدیر اگر صرف تقریروں سے بدلنی ہوتی میری جان تو کب کی

ہوتی ہم نے سوائے جذباتی تقریریں کرنے کے ان سارے سالوں میں اور کیا ہی کیا ہے۔''

مونا نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو اٹھو شارب انتظار کر رہا ہوگا۔''

''مونا! یہ ہاشم کیا میں کبھی مل سکتی ہوں اس سے۔''

مونا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے اب تم یونیورسٹی میں آئی ہو تو کبھی نہ کبھی ملاقات تو ہو گی ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا ہے اور یوں بھی یونین کی صدارت کے لیے کھڑا ہو رہا ہے وہ خود ہی سب سے ملاقات کرے گا۔''

''رئیلی مونا!''

''ہاں سونو بی بی! اور بالفرض وہ نہ آیا تو میں تمہیں ملوا دوں گی۔ مگر......''اس نے رک کر سنبل کی طرف دیکھا ایسے کوئی سرخاب کے پر بھی نہیں لگے ہوئے اس میں کہ تم اس سے ملنے کو اتنی بیتاب ہو رہی ہو۔

''مجھے اس کے آدرش اس کے عزائم اور خیالات اچھے لگے ہیں مونا یہی تو وہ لوگ ہیں جو ملکوں کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔''

''ہم اس کی یہ تقریریں سال بھر سے سن رہے ہیں ابھی تک تو وہ کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکا حالانکہ دور پی پی میں دو بار جیل یاترا بھی کر چکا ہے۔''

مگر سنبل نے مونا کے لہجے کی تلخی پر غور نہیں کیا وہ تو بس خیالوں میں کھوئی تھی ابھی اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اسے ہاشم کی تقریر سننے کا موقع مل گیا۔

ہاشم کالج کے زمانے سے ہی مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر تھا اور کالج اب یونیورسٹی میں بھی اس کی لاریٹی نے اسٹوڈنٹ کو ایک مرکز تلے اکٹھا کر دیا تھا۔

شارب گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''شارب!'' وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''شارب! آج میں نے ہاشم علوی کی تقریر سنی ہے سچی شاری! وہ اس طرح بولتا ہے کہ سحر طاری ہو جاتا ہے۔''

''اچھا تو ہاشم کی تقریر تھی میں سمجھ رہا تھا کہ یونیورسٹی کا کوئی فنکشن ہے آئندہ ایسے فضول

اجتماعات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ڈپارٹمنٹ کے سب ہی لڑکے لڑکیاں تھے۔" مونا نے وضاحت کی۔

"اس نے بطور خاص سب سے درخواست کی تھی آنے کی۔"

"اور پتا ہے تمہیں اس طرح کے جلسوں میں بعض اوقات لاٹھی چارج بھی ہو جاتا ہے اور ہاشم علوی کی تو عادت ہے حکومت کے خلاف بولنے کی پہلے پی پی پی کے خلاف بولتا تھا اور اب جبکہ پی پی پی رخصت ہو چکی ہے تو اب موجودہ حکومت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔"

شارب اچھا خاصا ناراض ہو رہا تھا۔

"نہیں نہیں شاری! وہ حکومت کے خلاف تو نہیں بول رہا تھا وہ تو یہ کہہ رہا تھا کہ ہم نے ان بیتے سالوں میں کچھ نہیں کیا۔ اس وطن کی قدر نہیں کی جو اتنی مشکلوں سے حاصل کیا تھا جس کے لیے ہمارے اجداد نے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ یہ وطن جو اسلام کے نام سے پر حاصل کیا گیا لیکن کہاں ہے اسلام؟"

"بس بس!" شارب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا مجھے سیاست سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں پہلے ہی بہت بور ہو چکا ہوں اور میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں ایک سیاسی تقریر سننے کے آنے کی ضرورت کیا تھی۔

"دراصل سونو مستقبل میں سیاسی لیڈر بننے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

مونا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"واؤ۔" اس نے حلق پھاڑ کر کہا اور مڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا واقعی سونو؟"

"ہاں!" سنبل سنجیدہ تھی "سیاسی لیڈر تو خیر نہیں لیکن میری یہ دلی خواہش ضرور ہے کہ اپنے وطن کے لیے کچھ کروں اور عوام کو بتاؤں کہ یہ ملک کیسے حاصل کیا گیا تھا کس طرح اور اس کے استحکام کے لیے کچھ کرنا چاہیے اپنی ذاتی خواہشات تج کر اپنے پرسنل خزانے بھرنے بجائے وطن کے لیے کچھ کریں۔"

"اوئے!" شارب نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔

"ابھی تو تمہیں دیر ہو رہی تھی شاری۔" مونا نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر پیچھے مڑ کر مونا کو دیکھا۔

"مونا! یہ آخر ہاشم علوی نے کیا کہہ دیا ہے جس نے ہماری سونو کی کایا ہی پلٹ دی ہے ابھی جب تم لوگ گھر سے تشریف لائی تھیں تو تم دونوں ہی ٹھیک ٹھاک تھیں پھر چند گھنٹوں میں ہاشم نے سحر پھونک دیا سونو پر۔"

یہ چند گھنٹوں کی تو بات نہ تھی بہت پہلے سے بچپن سے ہی اس کی خواہش تھی کہ وہ اس ملک کی خاطر کچھ کرے۔ یہ اہل وطن جو بے خبری کی نیند سوئے ہوئے ہیں انہیں بتائے کہ یہ ملک اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید تقریریں کر کے وہ ذہنوں کو بدل دے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب اس ملک کا رہنے والا ہر فرد مخلص دیانت دار محب وطن اور سچا مسلمان ہو گا اور یہ ملک ساری دنیا کے لیے مثال ہو گا۔ وہ ایک یوٹوپیا کے خواب دیکھتی تھی اور ہاشم علوی میں اسے اپنے یوٹوپیا کے ہیرو کی جھلک دکھائی دی تھی اور اس نے سوچا تھا یہی وہ شخص ہے جو اس ملک اور قوم کی تقدیر بدل دے گا۔ اس کی زبان سے نکلے سارے لفظ اس کے دل میں اتر آئے تھے اور آنے والے ہر دن میں اس کا یقین اس بات پر پختہ ہوتا گیا کہ ہاں یہی۔"

یہی ہے وہ شخص جو اس خواب غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو جگا دے گا۔ وہ جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی تھی۔

ایک مثالی ملک کا

جہاں سب ایجوکیٹڈ تھے۔

جہاں کی گلیاں اور سڑکیں صاف ستھری تھیں۔

جہاں رشوت چوری ذخیرہ اندوزی سفارش جیسی کوئی برائی نہ تھی۔

جہاں لوگوں کے گھروں کے دروازے لاک کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

جہاں ہر ایک کو انصاف ملتا تھا۔

"دراصل یہ نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے تاریخی ناول پڑھنے کا اثر ہے ایک روز شارب نے انکشاف کیا۔

"بی بی! یہ وہ دور نہیں ہے تم چاہو تو بھی پاکستان غرناطہ اور قرطبہ نہیں بن سکتا نہ اس کے حکمران خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا ایسا آخر وہ بھی تو ہماری تمہاری طرح کے انسان تھے جن کے گھوڑ
ایک طرف تو افریقہ کے صحراؤں کو روندر ہے تھے اور دوسری طرف علم وفن کی دنیا میں نام پیدا
رہے تھے۔"

وہ بحث پر اتر آتی تھی۔

اس لیے محترمہ سنبل صاحبہ! کہ اس قوم کی رگوں میں حرام گھس گیا ہے اور اس کے حکمران تجوریاں بھرنے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں ان کے دل میں قوم وملک کا درد نہیں ہے ان کی تجور بھری رہیں۔ ان کے خزانوں میں کمی نہ آئے قوم وملک جائے بھاڑ میں۔

"کوئی تو کوئی تو ہوگا موسیٰ بن نصیر طارق بن زیاد۔"

اس کی آنکھوں کے آگے ہاشم علوی آجاتا دھواں دھار تقریر کرتا ہوا کیسا جادو تھا اُ آواز میں کیسا سحر طاری کر دیتا تھا۔

ہزاروں کے مجمع میں آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔

وہ اس کا کوئی جلسہ مس نہیں کرتی تھی اس نے یونین کے انتخاب کے سلسلے میں اس کی ط سے بھرپور کنویسنگ کی تھی اور اسی دوران ہاشم علوی سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی اور جیتنے بعد بطور خاص ہاشم اس کی ڈیپارٹمنٹ میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔

ہاشم اسٹوڈنٹ کا مقبول ترین لیڈر تھا یونین کا صدر تھا۔

یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر تھا اور شاعر بھی تھا یہ اتنی بہت ساری خوبیاں اس میں اکٹھی تھیں سوکئی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں مونا نے اسے بتایا تھا کہ ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کی اور اس کا افیئر چلا تھا۔ ان دنوں یہ کالج میں پڑھتا تھا اور پھر سنا تھا کہ اس لڑکی کی شادی کہیں ا گئی اور ہاشم اس کے بعد ہی سیاست میں آیا تھا اس لڑکی کی بے وفائی کے بعد۔

لیکن سنبل کو یقین نہیں آیا تھا۔

"بھلا کوئی لڑکی اسے کیسے ٹھکرا سکتی ہے رد کرسکتی ہے وہ تو ایک آئیڈیل شخص ہے۔"

"ممکن ہے اس کا بیک گراؤنڈ بہت مضبوط نہ ہو سنا ہے اس کے والدین کسی چھو گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور کافی غریب ہیں۔"

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے مونا! اصل بات تو ہاشم کی شخصیت اور اس کا کردا

"میری جان جب شادی بیاہ کے فیصلے ہوتے ہیں تو بہت ساری باتوں کو دیکھا جاتا ہے صرف ایک شخص کا اچھا اور آئیڈیل ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔"

مونا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سنبل خیالی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم علوی ایک آئیڈیل شخص ہے اور ہر لڑکے کو اسی جیسا ہونا چاہیے۔

"سنو شارب! تم کیوں نہ سیاست میں آجاتے ویسے بھی فارغ ہوتے ہو۔"

ایک روز اس نے شارب سے کہا۔

"مجھے سیاست سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے اور میں ہمیشہ فارغ نہیں رہوں گا بلکہ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بابا کے ساتھ آج کل ان کے آفس جا رہا ہوں۔ بلکہ ان کی تو خواہش ہے کہ میں ان کے ساتھ بزنس میں ان کا ہاتھ بٹاؤں انجینئرنگ میرا شوق تھا وہ میں نے کر لیا اب میں نے انٹرویو دیئے ہیں امید ہے جلد ہی جاب مل جائے گی۔"

"اچھا!" سنبل کو حیرت ہوئی۔

"تم بابا کے ساتھ جا رہے ہو اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں اس لیے کہ اب تم مصروف جو ہوگئی ہو۔ گھر پر ہوتے ہوئے بھی گھر پر نہیں ملتیں۔"

"سوری شارب! ان دنوں دراصل ہاشم ایک سیاسی پرچہ نکال رہا ہے تو میں اس کی ہیلپ کر رہی ہوں۔"

"اور کیا تمہاری مدد کے بغیر وہ پرچہ نہیں نکال سکتا سنو" شارب کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"کیوں نہیں اس کے پاس کام کرنے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔ یہ تو میں اپنی خوشی سے کر رہی ہوں بلکہ جیسے ہی اسے ڈیکلریشن ملے گا میں یونیورسٹی کے بعد دو گھنٹے اس کے پرچے کے لیے کام کروں گی میں نے اس سے پرامس کیا ہے اس نے وہاں یونیورسٹی کے قریب ہی دفتر کے لیے ایک کمرہ لے لیا ہے۔"

"اور تمہارا کام کیا ہوگا کیا سیاسی کالم لکھو گی؟" شارب نے پوچھا۔

"نہیں وہ تو ہاشم خود ہی لکھا کرے گا میں اور شکیل ہم انٹرویو لیا کریں گے اور یہ انٹرویو اس لحاظ سے منفرد اور انوکھے ہوں گے کہ یہ ایک شخص کا انٹرویو نہیں ہوگا۔ کسی بڑے سیاست دان کسی بزنس مین یا کسی بیوروکریٹ کا بلکہ یہ عام لوگوں کے انٹرویو ہوں گے جن میں ہم مختلف مسائل سے

عوام کو آگاہ کریں گے سب سے پہلے ہم نے کچی بستیوں کا انٹرویو لیا ہے وہاں کا سروے کر
مختلف لوگوں سے ان کے مسائل پوچھے ہیں اور اگلا انٹرویو ہم ان بچوں کا لے رہے ہیں جو تو
سے پندرہ سال تک ہیں اور جو مزدوری کرتے ہیں۔"

وہ جوش سے بتاتی چلی گئی اور شارب خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے سنبل کی کسی بات
تبصرہ نہیں کیا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی نہیں سنے گی بچپن سے ہی وہ ایسی ہی تھی جو بات اس
ذہن میں سماجاتی تھی وہ ضرور کرتی تھی سب کے سمجھانے کے باوجود اور پھر بعد میں سوری ک
شارب کو بھی یقین تھا کہ جلد ہی اسے احساس ہو جائے گا کہ ہاشم علوی وہ شخص نہیں ہے جو ا
کی تقدیر بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

بلکہ یہ بھی ان بہت سے دوسروں کی طرح ہے جو سیاست سے اپنی دکان چمکاتے
تجوریاں بھرتے ہیں۔

شارب جانتا تھا کہ اس کی کوئی بات اس پر اثر نہیں کرے گی سو وہ خاموش رہتا تھا
اکثر اسے سمجھاتی رہتی تھی۔

"سونو! تم بہت اتاولو ہو چکی ہو یہ بہت زیادہ ہے یونیورسٹی میں لوگ تمہاری او
باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"تو کریں بھلے۔" وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتی ہم دونوں ایک کاز ایک مقصد
کام کر رہے ہیں۔

اسے کسی کی باتوں کی پروا نہ تھی لیکن مونا کو اس کی ہاشم میں حد سے زیادہ دلچسپی پر ا
اگرچہ وہ سب سے تردید کرتی رہتی تھی۔

"نہیں یار! وہ ذرا آئیڈیلسٹک سی لڑکی ہے اس نے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا
ہاشم اس ملک اور قوم کے لیے نجات دہندہ ہے سو وہ اس کے ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے۔"

جب مونا کی کوئی کلاس فیلو اس سے ہاشم اور سنبل کی بات کرتی تو وہ پوری طرح ا
کرتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ بات بہت پھیلی نہیں تھی اور خدا کا شکر کہ انہیں دنوں ہاشم ا
فائنل ہو گئے اور یوں ہاشم کا یونیورسٹی آنا کم ہو گیا۔ اب وہ پوری توجہ اپنے پرچے کو دے
سنبل اس کی ہر ممکن مدد کر رہی تھی۔

"تمہیں اپنا بھی پڑھنا ہوتا ہے اب فائنل میں ہو تم سونو! سو یہ اتنا کام مت کرو۔"

اس پر روز وہ جیل میں مختلف خواتین کے انٹرویو لے کر آئی تھی تو بے حد تھکی ہوئی ٹی وی
لاؤنج میں ہی صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی کہ مونا نے سمجھایا۔

"نہیں تو تھکی تو نہیں ہوں اور پڑھائی پر پوری توجہ دے رہی ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں اپنی یہ ذرا سا منہ نکل آیا ہے اور رنگت بالکل جل گئی ہے
ان بھر نہ جانے کہاں کہاں دھکے کھاتی پھرتی ہو اور رات کو دیر تک جاگتی ہو۔" مونا نے بہت پیار
سے اسے سمجھایا بہت خدمت خلق کر لی اب چھوڑو۔

"نہیں مونا! اس سب کام میں بہت لطف اور بہت سکون ہے اور تھکن تو صرف آج ہو گئی
ہے وہ بھی ذہنی تھکن جیل میں ان خواتین کی حالت اور ان کے حالات سن کر دل و دماغ دونوں ہی
بہت بوجھل ہو گئے ہیں ہاشم کہہ رہا تھا کہ ان کی پارٹی برسر اقتدار آئی تو وہ جیلوں کی طرف بطور
خاص توجہ دیں گے۔ اف وہاں کی حالت کتنی بری تھی مونا! تمہیں کیا بتاؤں۔"

وہ جذباتی ہو گئی مونا چند لمحے اسے یوں ہی دیکھتی رہی اور پھر پوچھا۔

"کیا ہاشم نے کوئی پارٹی جوائن کر لی ہے؟"

"ہاں!"

"لیکن وہ تو کہتا تھا کہ وہ آزاد رہ کر کام کرے گا کسی بھی پارٹی پر اسے اعتبار نہ تھا۔"

"لیکن اب اس کا خیال ہے کہ پارٹی جوائن کیے بغیر وہ حکومت میں نہیں جا سکتا اور حکومت
میں جائے بغیر وہ عملی طور پر کبھی اس ملک کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا صرف تحریر اور تقریر سے کچھ
نہیں ہوگا۔"

"اور موجودہ حکومت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہے گی کیونکہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو
ظالم کا اقتدار خطرے میں پڑ جاتا ہے اور عوام شاید زیادہ دیر تک زیادتی اور ظلم برداشت نہ کریں
ہمارے ہاشم نے سوچا ہوگا یہ موقع مناسب ہے اسے کسی ایسی پارٹی کو جوائن کر لینا چاہیے جس
مستقبل میں حکومت میں آنے کے زیادہ امکانات ہوں۔"

"لیکن تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے مونا۔" سنبل کو حیرت ہوئی تھی۔

"ظاہر ہے جس دور حکومت میں صبح کے وقت سڑکوں پر نوجوان لڑکیوں کی لاشیں ملیں وہ

زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی اور ہاشم کی تو بہت گہری نظر ہے سیاست پر کیا اس نے تمہیں
نہیں۔"

"ہاں اس کا خیال ہے کہ بہت جلد حکومت تبدیل ہو جائے گی اور وہ لوگ کامیاب
جائیں گے۔"

"سونو! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہاشم حکومت میں جانے کے بعد وہ سب کچھ کرے گا
دعویٰ وہ کر رہا ہے۔"

"ہاں مجھے یقین ہے۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاشم ایک مخلص آدمی ہے اور پتا ہے مونا!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ہاشم بھی وہی سب کچ
ہے جو میں سوچتی ہوں وہ بھی چاہتا ہے کہ ایک ایسا دور میرے وطن میں آئے کہ خلفائے را
کے دور کی یاد تازہ ہو جائے۔"

"اور کیا ایسا ممکن ہے سونو؟"

"ہاں کیوں نہیں سب کچھ ممکن ہے۔ صرف ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے اور پتا۔
کی پارٹی کے حوصلے بلند ہیں اور آدرش اونچے وہ سب کے سب اس ملک وقوم کے۔
زندگیاں تک تج دینے کو تیار ہیں پتا ہے مونا! کل اقبال پارک میں بہت بڑا جلسہ ہو رہا۔
بھی اس میں تقریر کر رہا ہے تو چلو گی میرے ساتھ۔"

"نہیں یار اور تم بھی مت جاؤ جتنا کچھ تم کر رہی ہو یہ بھی بہت ہے شارب کو بھی پ
ہے اس طرح۔"

لیکن اسے کسی کی پسند ناپسند کی کب پروا تھی وہ یونیورسٹی سے ہی سیدھی اقبال پارک
تھی حالانکہ رات جلسے کی خبر پاتے ہی حکومت نے پابندی لگا دی تھی لیکن پھر بھی ہزاروں کی
میں لوگ جمع تھے۔ اسے بھی کسی نہ کسی طرح جگہ مل گئی تھی اسٹیج کے قریب ہی۔ شکیل اس کے
ہی تھا وہ بیک وقت رپورٹر بھی تھا اس کے ساتھ انٹرویو کے لیے بھی جاتا اور فوٹو گرافی بھی
اس وقت بھی فوٹو گرافی کے لیے وہ آگے ہی موجود تھا۔ مختلف لوگ تقریریں کرتے رہے س
آخر میں ہاشم کی تقریر تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کی تقریر نے آگ لگا دی تھی۔
اور لوگ مشتعل ہو کر حکومت اور حکمرانوں کے خلاف نعرے لگانے لگے تھے پھر وہی

ہوا جو ایسے جلسوں کا ہوتا تھا۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس۔ وہ بے حد گھبرا رہی تھی اس کے ساتھ یہ
پہلی بار ہوا تھا کہ کسی جلسے میں آنسو گیس پھینکی گئی ہو وہ تو شکیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسے
کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا تھا اور پھر قریب ہی وہ ایک دوست کے گھر چلے گئے تھے کافی دیر بعد
وہ باہر نکلے تھے۔ فضا میں ابھی تک آنسو گیس کا اثر تھا۔

"کیا ہاشم؟"

"چھوڑو ہاشم کو اس وقت۔ سنبل اور اپنی فکر کرو آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

شکیل بہت مخلص اور ہمدرد سا تھا اور سنبل کا خیال بھائیوں کی طرح ہی رکھتا تھا۔

وہ دونوں روڈ پر آ گئے اور ابھی کسی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہی تھے کہ شارب کی گاڑی
قریب آ کر رک گئی۔

"شاری!" وہ یکدم خوش ہو گئی۔

"کہاں تھیں تم؟ ایک گھنٹے سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں" اس نے شکیل کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"میں شکیل کے ساتھ اس کے دوست کے گھر چلی گئی تھی۔"

اس نے بتایا تو تب اس نے شکیل کی طرف دیکھا۔

"ہاں ایک دم ہی لاٹھی چارج ہو گیا تھا اور میں بہت مشکل سے انہیں جلسہ گاہ سے نکال کر
لے گیا۔"

"ایک دم نہیں شکیل صاحب! اس کا امکان تو تھا بلکہ یقینی تھا دفعہ 144 نافذ ہو چکی تھی۔"

ہاں میں نے منع کیا تھا سنبل کو کہ یہ نہ آئے لیکن شکیل سنبل کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"لیکن انہوں نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہو گا کہ ان پر تو ملک کو سنوارنے کا
بھوت سوار ہے۔ ملک کی آئندہ وزیر اعظم یہی ہوں گی۔"

شارب بہت غصے میں تھا۔

"کم آن اب بیٹھو۔ گھر میں سب پریشان ہو رہے ہیں جب مونا نے بتایا کہ تم جلسے میں جاؤ
گی تو تب سے ہی سب کی جان پر بنی تھی اور بابا نے خوامخواہ ہی مجھے اور مونا کو ڈانٹ دیا کہ ہم
انہیں سمجھاتے نہیں ہیں۔"

سنبل چونکہ اس وقت خود بھی سہمی ہوئی تھی اس لیے بنا بولے بیٹھ گئی۔

"آیئے شکیل!" اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا آپ کو بھی ڈراپ کردوں گا۔ ا
وقت ٹیکسی مشکل سے ملے گی۔ آگے سٹوڈنٹ اکٹھے ہوکر روڈ بلاک کرنے لگے ہیں ٹائر وغیرہ
کرآگ لگا رہے ہیں انہیں۔

"کیوں؟" شکیل نے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کے ہاشم علوی صاحب کو گرفتار کرلیا گیا۔"

"نہیں!" اسے حیرت ہوئی۔

"ہاں جی اور ہاشم علوی کو خبر تھی اس کی کہ وہ گرفتار ہوجائے گا اور اس کی تقریر ہی اسی مقـ
کے لیے تھی۔" شارب کا موڈ سخت آف تھا۔

وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا مین روڈ پر آیا تھا اور شکیل کو ڈراپ کر کے اس نے بے حد
سے سنبل کو دیکھا تھا۔

"بہت ہوگئی سیاست سونا! اب ختم کرو یہ سب جانتی ہو جب پتا چلا کہ ہاشم گرفتار ہوگیا
اور اس کے ساتھ کئی لیڈی ورکر بھی اور کئی کارکن اور یہ کہ لاٹھی چارج ہوا ہے تو بابا کی کیا
ہوئی یہ جان کر کہ تو بھی وہاں ہو لگتا تھا جیسے ان کا دل رک جائے گا۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔"

امین ہاؤس کے گیٹ پر ہارن دیتے ہوئے شارب نے قدرے تلخ لہجے میں کہا اور وہ
پورچ میں رکتے ہی بھاگتی ہوئی بابا کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"سوری بابا! آپ کو میری وجہ سے پریشان ہونا پڑا لیکن میں تو وہاں تھی ہی نہیں لاٹھی
سے پہلے ہی ہم لوگ چلے گئے تھے۔ میں اور شکیل......اس کا ایک دوست نا اس کے گھر۔"

اور بابا نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔

"میری بچی! میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔"

ان کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں بیٹا! یہ تمہارا کام نہیں ہے ملک سے
اور اچھا جذبہ رکھنا اچھی بات ہے قابل تحسین ہے لیکن تم کسی اور طریقے سے بھی تو ملک کی خـ
کرسکتی ہو بہت سے راستے ہیں تمہارے سامنے ہم ہر قدم تمہارے ساتھ ہیں لیکن یہ سیاسـ
خارزار میں تم جیسی لڑکی کا کیا کام۔"

بابا ہولے ہولے اسے سمجھاتے رہے اور وہ سر جھکائے سنتی رہی وہ بابا کی بے حد لاڈلی تھی
اور اپنے ابو امی سے زیادہ اسے بابا اور بڑی امی سے پیار تھا۔

امی نے تو اسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا دی تھی اور ان کا بس چلتا تو اسے دو چار دھمو کے بھی لگا
دیتیں۔ لیکن بڑی اماں نے انہیں روک دیا۔

"اب بس بھی کرو بچی ہے تم تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو اب نہیں کرے گی ایسی حماقت۔"

لیکن وہ کیا کرتی وہ تو بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طرح ہاشم رہا ہوکر آجائے اور خود اسے اپنی
بے چینی کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی اگرچہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ ایسے معاملات سے
سروکار نہیں رکھے گی۔ لیکن شکیل جب یونیورسٹی میں آکر ملا اور اسے بتایا کہ ہاشم نے پیام دیا ہے
کہ پرچہ ہر صورت اپنے مقررہ وقت پر آنا چاہیے۔

تو وہ سارے عہد بھلا کر یونیورسٹی سے پھر پرچے کے دفتر پہنچ گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح وہاں
اس نے دو گھنٹے کام کیا تھا اور ہاشم کی عدم موجودگی میں اس کا ایک دوست عابد رضوی پرچے کو دیکھ
رہا تھا اور اسی نے ایڈیٹوریل لکھا تھا اور ہاشم کی گرفتاری کی سخت مذمت کی تھی اور حکومت کے
پرخچے اڑا دیے تھے اور دعویٰ کیا تھا کہ بہت جلد وہ اس حکومت کے کالے کارنامے سب کے
سامنے لائے گا۔

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ پرچہ ضبط ہوگیا تھا اور عابد رضوی گرفتار اور یوں اس کے پاس
کرنے کے لیے جیسے کوئی کام ہی نہ رہا وہ از حد بے چین اور مضطرب تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ
رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سو اس وقت بھی وہ بے چینی سے لان میں ٹہل رہی تھی اور خدا جانے ہاشم
کب تک جیل میں رہے گا اور کاش وہ ہاشم کے شروع کیے ہوئے کام کو جاری رکھ سکتی رسالہ بند ہو
گیا تھا۔ عابد رضوی جیل میں تھا اور شکیل امریکہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا اس کے ایک کزن
نے اسے اسپانسر کیا تھا اور اس نے ویزا حاصل کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے خرچ کیے تھے اور
تیاریوں میں تھا۔

"کیا بات ہے سنبل؟" شارب اس کے قریب آگیا وہ بہت دیر سے پورچ کی سیڑھیوں پر
کھڑا اسے لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "کیا پریشان ہو کچھ؟"

"ہاں نہیں تو۔"

اس نے چونک کر شارب کی طرف دیکھا اور لان میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی شارب بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مت پریشان ہو دیکھو بابا نے جو کچھ بھی تم سے کہا ہے تمہارے بھلے کے لیے کہا ہے شعبہ لڑکیوں کے لیے نہیں ہے سیاست تو یوں بھی خوار کرتی ہے کہاں تم ایک نرم و نازک سی لڑکی۔"

"نہیں یہ بات تو نہیں شارب۔"

وہ دل ہی دل میں نادم سی ہوگئی شارب سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ اس لیے پریشان ہے بابا کے کرنے پر وہ کون سا رکی تھی مسلسل پرچے کے دفتر جاتی رہی تھی اور اب جبکہ وہ پریشان تھی تو اس وجہ ہاشم تھا۔

"تم چاہو تو ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد لڑکیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی ادارہ بنا لینا اور میں ہر ممکن مدد کریں گے ہمارے ہاں کی عورت بہت مظلوم ہے سونو! خاص طور پر دیہات عورت بلکہ استحصال تو شہر میں بھی ہے حالانکہ ہمارا مذہب عورت کو جو حقوق دیتا ہے وہ دنیا کے اور مذہب نے عورت کو نہیں دیے۔ یوں تو بے شمار ایسے ادارے کام کر رہے ہیں لیکن وہ سب نہاد ادارے اس اوٹ میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ تم جانتی ہو انٹرویو لے چکی ہو تم ان عورتوں کا"

"تو تم میرے انٹرویوز اور سروے پڑھتے رہے ہو۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں لمحے کو وہ ہاشم کی پریشانی بھی بھول گئی۔

"ہاں!" شارب نے اس کے چمکتے چہرے پر نظر ڈالی۔ تمہارے قلم میں بہت طاقت اور بہت اثر ہے سونو۔ تم اس سے بھی بہت کام لے سکتی ہو ان ذہنوں میں جو اپنی برتری کے میں کھوئے ہوئے ہیں احساس جگا سکتی ہو تم چاہو تو اپنا کوئی ہفت روزہ نکال لو لیکن فار گاڈ سونو! اس سیاست کے چکر سے خود کو نکال لو تمہارے سامنے کرنے کو بہت کچھ ہے کیا کر ر۔ یہ سیاست دان اور کیا دیا ہے انہوں نے پاکستان کو یہ پینتیس سالوں میں سوائے اس کے ملک کو دولخت کر دیا اور صرف چند سالوں میں ان زخموں کو بھول بھی بیٹھے کبھی ذکر کیا انہوں ۔ المیے کا یاد کیا ان جیالوں کو جو وہاں کٹ مرے یہ تو محض اپنی ہی سیاست چمکانے میں لگے ہیں"

وہ جذباتی ہو رہا تھا لیکن سنبل کا دھیان جانے کہاں تھا وہ شاید ہاشم کے متعلق سوچ ر کہ جوں ہی وہ خاموش ہوا اس نے پوچھا۔

"شاری تمہارے خیال میں ہاشم کب تک رہا ہو جائے گا۔"

"معلوم نہیں۔" شارب نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا تم۔ آئی مین کیا تم اس کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اسے جس پارٹی کی پشت پناہی حاصل ہے وہ اس وقت ملک میں موجود سب پارٹیوں سے زیادہ پاورفل ہے وہ اس کی رہائی کے لیے جو کچھ کر رہے ہوں گے وہ میں کہاں کر پاؤں گا۔"

"ہاں یہ تو ہے" اس نے آہستگی سے کہا اور پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔

"تم اس ادارے کے متعلق سوچو سونو! اور پھر امتحان کے بعد اس پر باقاعدہ کام کریں گے تمہارے امتحان کب ہو رہے ہیں۔"

"بس جلد ہی......شاید دو تین ماہ تک ابھی ڈیٹ نہیں آئی۔"

"تو پھر اس وقت سب کچھ بھول کر تم پیپرز کی تیاری کرو تمہارے پیپرز کے بعد مونا کی شادی کی تاریخ بھی رکھی جائے گی۔"

"رئیلی؟" وہ اچھل پڑی مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔

"تم خود ہی سب سے بیگانہ ہوگئی ہو سونو! اور تمہارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ تم ہمارے پاس آؤ بیٹھو اور پہلے کی طرح ہم سے باتیں کرو سچ ترس گئے ہیں۔" شارب نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کر بیٹھا۔

"اور تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا ہوگا کہ مجھے کراچی میں بہت اچھی جاب مل گئی ہے ایک غیر ملکی کمپنی میں اور اگلے سنڈے میں کراچی جا رہا ہوں۔"

"تم......تم بہت خراب ہو اب بتا رہے ہو مجھے۔"

مت کرو بات مجھ سے۔ میں مصروف تھی تو تم خود نہیں آ سکتے تھے میرے کمرے میں۔

اس نے روٹھ کر منہ بنا لیا اور شارب کو وہ پہلے والی سونو لگی پہلے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ ایسے ہی روٹھ جایا کرتی تھی تو وہ کہا کرتا تھا۔

"امن ہاؤس میں روٹھنے والوں پر فائن ہوتا ہے سونو یاد ہے نا۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر فائن ہوگیا۔"

"ہاں!" وہ کھلکھلا کر ہنسی چلو اٹھو مونا کو بھی بلاتے ہیں اور باہر کھانا میری طرف سے۔

"یہ بہت تھوڑا فائن ہے اس مقابلے میں جو تم نے ہمیں ستایا ہے۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شارب پھر گلہ کر بیٹھا۔

"اور جو تم لوگوں نے مجھے اپنی جاب اور مونا کی شادی کا نہیں بتایا اس کا بھی فائن ہوگا کل ٹریٹ دو گے اور پرسوں مونا۔"

بالکل پہلے کے سے انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چلتی لڑتی جھگڑتی سنبل اسے بہت اچھی لگی اور وہ یونہی اس کی طرف سے بدگمان ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اور ہاشم۔

پھر اس کے کراچی جانے تک سنبل اس کے ساتھ ساتھ ہی رہی خوب گھومے خوب انجوائے کیا۔ اس نے انہیں ان کے پسندیدہ ہوٹل میں ڈنر دیا اور انہوں نے مووی دیکھی رات کو دیر تک بیٹھ کر بیت بازی کی اور ہمیشہ کی طرح سنبل جیت گئی اور ان چند دنوں میں شارب نے ان تمام کتابوں پر بحث کر ڈالی جو اس نے اس دوران خریدی تھیں اور اس نے بھی وقت نکال کر انہیں پڑھا کیرم اور شطرنج کھیلتے ہوئے خوب بے ایمانی کی اور شارب کو مونا کے ساتھ مل کر خوب تنگ کیا خوب لوٹا۔

"اُف تم نے تو میرا والٹ ہی خالی کر دیا ہے" شریر لڑکیو! تنخواہ ملنے تک مجھے اسی میں گزارا کرنا تھا۔

اور پھر چپکے سے ایئر پورٹ پر جانے سے پہلے وہ اس کی ٹیبل پر پیسے رکھ آئی تو شارب کو اس پر بہت پیار آیا۔

"پاگل! میں تو یونہی تنگ کر رہا تھا تم سب کو ورنہ ابھی تو بہت مال ہے۔"

اور شارب کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک اداس رہی ہاشم کی بھی کوئی خبر نہ تھی۔

شارب کی وجہ سے گھر میں کتنی رونق تھی سب ہی اداس تھے مونا تو کتنی بار چھپ چھپ کر روئی خود اسے اپنی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی یہ چند دن اچھے گزر گئے تھے شارب کی وجہ سے دھیان بٹا لیکن اب پھر اسے رہ رہ کر ہاشم کا خیال آ رہا تھا اس روز بھی وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلی تو شکیل مل گیا۔

"ارے شکیل! تم کیسے ہو اور ہاشم کا کچھ پتا ہے۔"

ہاشم کو تو وہ جلد ہی غالباً کوٹ ادو منتقل کرنے والے ہیں اور میں پرسوں شام کی فلائیٹ سے جا رہا ہوں۔ سنبل! میرے لیے دعا کرنا اور اپنا بہت خیال رکھنا اور پڑھائی سے فارغ ہو کر اچھی لڑکیوں کی طرح شادی کر کے آرام سے گھر بیٹھنا۔ تمہارا وہ کزن کیا نام ہے اس کا شارب بہت اچھا ہے۔ ہاشم کے مقابلے میں ہزار بار درجے اچھا ہاشم اور طرح کا آدمی ہے سنبل! اور تم بالکل اور طرح کی ہو نازک احساسات رکھنے والی کانچ کی طرح ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاؤ گی اور یہ تمہارا کزن تمہیں کانچ کے نازک اور قیمتی پیس کی طرح ہی سنبھال کر رکھے گا۔

"مگر تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو میں نے کبھی ہاشم کے متعلق اس طرح نہیں سوچا میں تو ہاشم کو ایک نجات دہندہ سمجھتی ہوں جو اس قوم کی تقدیر بدلنے کے لیے خود قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے میرے دل میں اس کا بہت احترام ہے۔"

"پتا نہیں کیوں سنبل! میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ تم ہاشم کے لیے بہت حساس ہو اس کے لیے بہت اپ سیٹ رہتی ہو تو۔"

کیفے ٹیریا میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے شکیل نے وضاحت کی۔

شکیل کے جانے کے تصور سے وہ بہت اداس ہو رہی تھی وہ یہاں تھا تو کم از کم اسے ہاشم کے متعلق کچھ نہ کچھ خبر ہو جاتی تھی۔

"سنبل! تم مجھے اپنی بہنوں کی طرح عزیز ہو میرا بہترین مشورہ یہ ہے کہ تم اب اس سیاست وغیرہ کے چکر سے الگ ہی ہو جاؤ تو بہتر ہے اس روز اگر تم بھی عابدہ اور فاطمہ کی طرح گرفتار ہو جاتیں تو حوالات میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے تم جانتی ہی ہو تمہاری یہ فیلڈ نہیں ہے کہ تم ہاشم کے ساتھ ماری ماری پھرو جلسوں میں شرکت کرو جلد یا بدیر ہاشم رہا ہو کر آئے گا تو تم سے رابطہ کرے گا ہی تم معذرت کر لینا۔"

جانے سے پہلے اس نے پھر سمجھایا تھا اور اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ جب سب ہی چاہتے ہیں تو یہی سہی لیکن اندر ہی اندر وہ اس طرح اتنے بلند و بانگ دعوے کرنے کے بعد الگ ہو جانے پر نادم تھی ہاشم کیا سوچے گا اس کے متعلق کہ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی تھی اور آزمائش کے لمحے آئے تو ساتھ چھوڑ بیٹھی۔ لیکن ہاشم کے بارے میں کچھ سوچنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی شکیل کے جانے کے چند دن بعد ہی عابد رضوی رہا ہو کر آ گیا۔ اس کی ضمانت ہو گئی تھی لیکن ہاشم ابھی جیل

میں ہی تھا۔اس پر بے شمار کیس بنا دیئے گئے تھے اور ابھی اس کی ضمانت نہیں ہو رہی تھی عابد اس
کے لیے ہاشم کا پیغام لایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں اس کی رہائی کی خاطر تحریک چلائے اور طلبا سے
کہے کہ وہ کچھ کریں اور وہ انتظار نہ کر سکی۔

"ٹھیک ہے۔" اور یوں اندر ہی اندر وہ طلبا کو تیار کرنے لگی کہ وہ کچھ کریں اور ایسے میں اس
کے ڈپارٹمنٹ کے ذکا نے بڑا کام کیا وہ خود بھی ہاشم کی پارٹی سے تھا یوں ہر روز جلوس نکلنے لگے

"ہاشم کو رہا کرو۔"

"جھوٹے مقدمات واپس لو۔"

"اگر چہ جلوس منتشر کر دیا جاتا تھا۔پھر بھی اخبارات وغیرہ بھی ہاشم کے لیے لکھ رہے تھے
اور ساتھ ہی ساتھ طلبا کی مذمت بھی کی جا رہی تھی کہ وہ ملکی املاک کو نقصان پہنچائے بغیر اپنا مطالبہ
کریں۔

ان ہی دنوں جب طلباء توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور کئی ایک طلبا بھی لاٹھی چارج کے سلسلے
زخمی ہوئے تھے ایک طالب علم مارا بھی گیا ہاسٹل خالی کرا لیے گئے تھے اور یونیورسٹی غیر معینہ
کے لیے بند کر دی گئی تھی چونکہ امتحانات کا کچھ پتا نہ تھا اس لیے مونا کی شادی کی تاریخ مقرر کر
گئی کیونکہ عدنان کے پاس زیادہ چھٹی نہ تھی اور وہ کویت سے چھٹی لے کر شادی کی غرض سے
تھا سو وہ اس سلسلے میں بے حد مصروف ہو گئی تھی۔

آئے دن بڑی امی اور امی اسے ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے چلی جاتیں۔شارب
ہفتہ بھر پہلے ہی آ گیا تھا اور اکثر رات گئے تک وہ تینوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے گپ لگاتے
کبھی مونا بے اختیار رو پڑتی اور یہ کس قدر مشکل لمحے ہوتے ہیں۔

ایک گھر جہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے بڑی ہوتی ہے اور جہاں اس کے بچپن سے لے کر
تک سارے ماہ و سال گزرتے ہیں اُس گھر کو چھوڑنا۔

"ان محبتوں سے بچھڑنا کس قدر مشکل اور کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کی آنکھیں
آتیں۔"

شارب بھی آبدیدہ ہو جاتا اور پھر ان دونوں کو روتے دیکھ کر فوراً ہی کوئی لطیفہ یا
ہنسانے لگتا شادی سے تین دن پہلے دوسرے عزیز و اقارب بھی اکٹھے ہو گئے خالہ پھپھو

سب لوگ ڈھولک بھی منگوالی گئی تھی اور اس کی پھپھوزاد بہنیں خود گانوں کی تیاریاں کر رہی تھیں وہ
تایا ابا کو ناشتہ دے کر آئی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے اٹھایا دوسری طرف عابد رضوی تھا۔

"سنو سنبل! میں ہاشم سے ملنے گیا تھا۔اس نے تمہارے لیے پیغام بھیجا ہے کہ تم اس سے ملو
شاید ایک دو روز میں وہ اسے فیصل آباد بھیج دیں گے یا نہ جانے کہاں۔"

"مگر میں کیسے۔؟" وہ حیران تھی۔

"کل ذکا وغیرہ اس سے ملنے جا رہے ہیں تم بھی ان کے ساتھ چلی جانا۔"

"مگر کل......کل تو مونا کی مہندی ہے میری بہن کی عابد! تمہیں پتا ہے نا میں نے بتایا تھا کہ
شادی ہے مونا کی۔"

"ہاں لیکن ممکن ہے ہاشم کو پرسوں صبح ہی کہیں اور منتقل کر دیں پھر اسے تم پر بڑا اعتماد تھا اور
بڑا مان۔"

"وہ کیوں ملنا چاہتا ہے مجھ سے تم ہی پوچھ لیتے۔"

"ممکن ہے وہ تم سے ہی کچھ کہنا چاہتا ہو بہر حال اگر تمہارا ارادہ ہے تو ذکا کو فون کر دینا وہ
تمہیں پک کر لے گا۔"

"اچھا!" اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن اب وہ پریشان سی ہو گئی تھی آخر ہاشم نے مجھے کیوں
بلوایا ہے اور وہ کیا بات ہے جو اسے مجھ سے ہی کہنی ہے اور اسے یقین ہے کہ میں ضرور جاؤں گی
اس کی بات سننے اور اگر میں نہ گئی تو وہ ضرور ہرٹ ہو گا۔

دن بھر وہ بے چین سی رہی اور اس نے اپنی کزنز کی سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لیا۔

"کیا بات ہے سونو؟" اس کی کزنز نے پوچھا بھی۔

"کچھ نہیں۔یونہی سر میں درد ہے۔"

وہ بہانا کر کے ان کے پاس سے اٹھ آئی جبکہ وہ گانے گا رہی تھیں حالانکہ اس کی پھپھو کی بیٹی
نے اسے روکا بھی تھا۔

"سونو! ہم نے لڑکے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بڑا زبردست گانا تیار کیا ہے ابھی
ناتے ہیں تمہیں وہ لیکن وہ کمرے میں چلی آئی کیا کرے وہ کل مہندی بھی تھی اس کا جانا ناممکن ہی
ھا صبح اگر چلے جائیں تو۔"

اس نے ذکا کو فون کیا۔

''ذکا! تمہارا پروگرام کب ہے جانے کا ہاشم سے ملنے۔''

''دو بجے کی اجازت ملی ہے میں تمہیں پک کرلوں گا۔''

''فارغ کب تک ہو جائیں گے۔''

''زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگ جائیں گے آنے جانے اور ملاقات میں۔''

''اچھا دراصل وہ میری بہن کی مہندی کا فنکشن ہے نا اس لیے۔''

''تو تم مت جاؤ پھر کبھی چلی جانا۔''

ذکا نے مشورہ دیا۔

''لیکن عابد کہہ رہا تھا کہ ممکن ہے ہاشم کو ایک دو روز میں کہیں اور منتقل کر دیں۔''

''ہاں شاید سنا تو یہی ہے۔''

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے تم مجھے پک کر لینا بلکہ نہیں تم نہ آنا میں خود آ جاؤں گی رسالے میں وہاں سے تم لے لینا مجھے۔''

اس نے ہاشم سے ملنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''خدا جانے وہ لوگ ہاشم سے کیا سلوک کریں گے وہ دن بھر سوچتی رہی تھی۔''

''چھ بجے سب لوگ گھر سے نکل جائیں گے۔'' بابا کا حکم تھا۔

زیادہ دیر سے فنکشن کرنے کے وہ خلاف تھے عموماً مہندی وغیرہ پر رات کے دو جاتے تھے زیادہ سے زیادہ نو بجے تک واپسی ہو جائے انہوں نے لڑکے والوں سے کہہ دیا سات بجے تک فلیٹی پہنچ جائیں آٹھ بجے کھانا سرو کر دیا جائے گا۔''

اور سنبل کا خیال تھا کہ وہ چار بجے تک واپس آ جائے گی لیکن ہوا یوں کہ وہاں حوالا خاصی دیر ہو گئی نہ جانے کیا کیا کارروائیاں ہوتی رہیں چار بجے کے قریب انہیں ہاشم ۔ لے جایا گیا ہاشم پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور لگ رہا تھا۔

''مجھے ایک دو روز میں یہاں سے منتقل کر دیا جائے گا کہاں؟ یہ ابھی معلوم نہیں لیکن اپنا مشن ادھورا نہ چھوڑنا۔''

سنبل! تم سے مجھے بہت امیدیں ہیں عورتوں کے دو ایک جلوس نکلیں گے خواتین

چارج ہوا تو عوام بھڑک اٹھیں گے اخبار اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے کہ ہمارے ملک میں آج بھی عورت کو بہت سپورٹ کیا جاتا ہے۔

وہی باتیں جو ہاشم ہمیشہ کہتا تھا وہ کہتا رہا اور اس پر سحر سا طاری ہوتا رہا اور ہر بات کے جواب میں وہ سر ہلاتی رہی۔

''سنبل! میں تمہارا بے حد ممنون ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اور جس طرح طلبا کو اکٹھا کیا ہے ذکا مجھے بتاتا رہتا تھا اور میں نے اس لیے بھی تمہیں بلایا تھا کہ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا تم بہت اچھی ہو سنبل۔''

اور سنبل کے دل کی دھڑکنیں جیسے یکدم تیز ہو گئی تھیں ہاشم اسے ہی دیکھ رہا تھا اس نے ایک دم نظریں جھکا لیں وہ فوراً ہی وہاں سے نکلے تھے اور اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ ذکا کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔

''چھ بجے سب نے نکل جانا تھا ذکا! گاڑی یہیں کھڑی کر کے مجھے ٹیکسی پر چھوڑ آؤ۔''

وہ ازحد پریشان ہو رہی تھی ساڑھے پانچ تو وہاں ہی بج گئے تھے گھر پہنچتے پہنچتے سات بج گئے تھے۔

''شارب اسے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔ اور اس نے اسے ذکا کی گاڑی سے اترتے بھی دیکھ لیا تھا۔''

''حد ہو گئی سونو!'' ''تمہیں پتا نہیں تھا کہ۔

''سوری مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر ہو جائے گی۔'' یہ شکر تھا کہ وہ مونا کو بتا گئی تھی کہ وہ ا بہت ضروری کام سے جا رہی ہے اور مونا نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

''یہ آخر آج کے دن تمہارا کیا ضروری کام تھا سونو؟''

امی ازحد غصے میں تھیں۔

''وہ امی!''

''مونا نے آپ کو بتایا تو تھا چچی! کہ اس کی ایک عزیز دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا فون آیا تھا ہسپتال چلی گئی تھی۔''

شارب نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی امی کو جواب دے دیا تو اس نے متشکر نظروں سے

اسے دیکھا۔لیکن وہ سخت خفا لگ رہا تھا اور پھر باقی کے دو دن بھی اس کا موڈ از حد خراب نے سنبل سے بات تک نہ کی اور مونا رخصت ہو کر چلی گئی۔

مونا کی شادی نے بے حد تھکا دیا تھا۔وہ رات اس کے ولیمے سے واپس آئی تو اس ہوئی تھی کہ الٹے سیدھے کپڑے تبدیل کر کے بڑی امی کے کمرے میں ہی سو گئی تھی اور سوتی رہی تھی حتیٰ کہ سب مہمان بھی رخصت ہو گئے تھے پھپھو کی بیٹیاں اس کے کمرے میں خدا حافظ کہنے آئی تھیں اور اس نے یونہی سوتی جاگتی کیفیت میں اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا اور سو گئی تھی بابا کے منع کرنے کے باوجود بھی ولیمہ اور بارات کا فنکشن ختم ہوتے ہوتے ایک جاتا تھا۔اور پھر بستر پر لیٹتے لیٹتے تین بج جاتے تھے سو اس کا ارادہ تھا کہ وہ آج خوب سو کر اتارے گی۔اور بڑی امی نے بھی اسے ڈسٹرب نہ کیا کوئی ایک بجے کے قریب اس کی آنکھ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اتنا بہت زیادہ سونے سے سستی ہو رہی تھی۔اس نے سوچا وہ باتھ لے کر فریش ہو جا مونا کو فون کرتی ہے اس خیال سے وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ شارب اندر آ گیا وہ بے حد سنجیدہ تھا شاید مونا کی وجہ سے افسردہ ہے اس نے سوچا اور شارب کی طرف دیکھا۔

شاری بہت سنجیدہ لگ رہے ہو مونا کے لیے اداس ہو رہے ہو شام کو چلیں گے نا اسے۔

"ہاں!" شارب نے بہت گہری نظر سے اسے دیکھا۔

"سونو! تم مونا کی مہندی والے دن کہاں گئی تھیں۔"

"وہ میں نے مونا کو بتایا تھا کہ ذکا نے بلایا ہے۔ادھر جا رہی ہوں۔"

"ذکا یہ وہی لڑکا ہے جس کے ساتھ تم آئی تھیں اس روز؟"

"ہاں۔"

"اور ذکا کے ساتھ تم ہاشم سے ملنے گئی تھیں؟"

"تم ...... تمہیں کس نے بتایا ہے۔" اسے حیرت ہوئی مونا کو بھی اس نے ہاشم سے نہیں بتایا تھا۔

"یہ دیکھو۔" شارب نے اخبار اس کے سامنے پھینک دیا۔

"ہاشم سے آج اسٹوڈنٹ لیڈرز ذکا نے ملاقات کی ان کے ساتھ ان کی ساتھی کار

تھیں۔" نام نہیں لکھا تھا ذکا اور اس کی تصویر تھی جب وہ ہاشم کے ساتھ بات کر رہے تھے اس کا سائیڈ پوز تھا اگرچہ کوئی اور اسے نہ پہچان سکتا لیکن خود اس کے لیے اور شارب کے لیے اسے پہچاننا مشکل نہ تھا یہ غنیمت تھا کہ اس کا نام نہیں لکھا تھا۔

"کیوں گئی تھیں تم ہاشم سے ملنے؟ سونو! تمہیں بابا نے منع نہیں کیا تھا۔"

"اس نے بلایا تھا وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔"

سنبل نے آہستگی سے کہا وہ جانتی تھی کہ اگر بابا کو پتا چل جاتا تو انہیں دکھ ہوتا۔اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ہاشم وغیرہ سے سروکار نہیں رکھے گی۔

"سونو! دیکھو یہ راستے تمہارے لیے مناسب نہیں ہیں سب پُر خار راہیں ہیں بہت تکلیف دہ سفر ہے یہ اور اس کا حاصل کچھ بھی نہیں یہ سب بہروپیے ہیں ہاشم ہو یا کوئی اور یہ جب اقتدار میں آئیں گے تو سارے دعوے بھول جائیں گے۔وطن کے لیے بلند و بانگ دعوے کرنے والے اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔خالی برتنوں کی طرح سونو پلیز آنکھیں بند کر کے مت ان کے پیچھے چلو۔میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں دیکھو ایک بار تم تعلیم سے فارغ ہو جاؤ پھر ہم دونوں مل کر کچھ کریں گے۔جو دعویٰ نہیں ہوگا سونو! تھوڑا سہی معمولی سہی لیکن ایک حقیقت ہوگی وہ"

اور کتنا صحیح کہا تھا شارب نے۔

سب خالی برتنوں کی طرح تھے کھوکھلے۔

محض لفظ ہی لفظ۔

لیکن تب وہ اتنی سمجھ کہاں رکھتی تھی کہ حقیقتوں کو سمجھ سکتی وہ تو جیسے ٹرانس میں تھی۔

ہاشم سے متاثر۔

اس کے سحر میں گرفتار۔

شارب کے سمجھانے کے باوجود جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر آیا تو وہ خود کو اس سے ملنے سے روک سکی۔حالانکہ تب تک وہ امتحانات سے فارغ ہو چکی تھی اور یونیورسٹی جانے کا سلسلہ بھی ہیں تھا لیکن جب عابد نے فون کر کے اسے ہاشم کی رہائی کا بتایا تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔

"ہاشم شام کو پرچے کے دفتر میں آئے گا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل بنائے گا۔" عابد نے

اسے بتایا۔

اگرچہ پرچہ نئے نام کے ساتھ دوبارہ شروع ہو چکا تھا مگر سنبل نے اس میں لکھنا شروع کیا تھا۔

پہلے مونا کی شادی پھر امتحان کی تیاری۔

اور پھر کچھ بابا اور شارب کے خیال سے بھی وہ رسالے کے دفتر نہیں آئی تھی حالانکہ دو بار عابد نے فون بھی کیا تھا اور ذکا کے ہاتھ یونیورسٹی میں پیغام بھی بھیجا تھا مگر اب عابد نے ہاشم کے آنے کا بتایا تو وہ خود کو نہ روک سکی۔

"سنبل! میں آپ سے ناراض ہوں۔" ہاشم نے گلہ کیا۔ "آپ نے رسالے کے بالکل کوئی کام نہیں کیا معلوم ہے آپ کے سروے پرچے کی جان تھے کتنے پسند کیے جاتے۔"

"سوری ہاشم! کچھ مصروفیت رہی۔" اس نے معذرت کی۔

"لیکن اب میں کوئی معذرت قبول نہیں کروں گا آپ باقاعدہ پرچے میں شمولیت اخ لیں آپ کا نام اب معاونین میں لکھا جائے گا یوں بھی آپ فارغ ہیں پڑھائی کا سلسلہ تو ختم"

"ہاں لیکن۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتانا پڑا کہ اس کے والدین پسند نہیں کرتے کہ وہ اس طر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے۔

بہرحال وہ شارب اور بابا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"مگر کیوں سنبل! انہیں آخر اعتراض کیا ہے کیا وہ اس ملک کے شہری نہیں ہیں کیا فرض نہیں ہے کہ اس ملک کو بچائیں ان ظالم لوگوں سے جو اسے بیچ کھائیں گے ایک روز ملک نہ رہا تو پھر کہاں ٹھکانا ہوگا ان کا۔"

ہمیشہ کی طرح سنبل اس کے لفظوں کے سحر میں بہتی چلی گئی اور اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ پرچے کے لیے لکھے گی مگر اب کے وہ شارب کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ تکلیف دینا چاہتی تھی۔

امی ابو کو تو اس کی ان سرگرمیوں کی اتنی خبر ہی نہ تھی سو اس نے شارب سے پوچھ لیا ایک دو دن کے لیے چھٹی پر آیا تو۔

"شارب! ہاشم ضمانت پر رہا ہوگیا اور اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں وہ سروے انٹرویوز کا سلسلہ پھر سے شروع کردوں۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے نا اس کا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک بالکل الگ سلسلہ ہے کیا کرلوں؟"

اس نے کچھ اتنی معصومیت سے پوچھا کہ شارب انکار نہ کرسکا۔

"ہاں لیکن سنو! تم ہاشم کے ساتھ عملی سیاست میں حصہ نہیں لوگی بس سروے کی حد تک کام کرلو انشاء اللہ جلد ہی ہم اپنا پرچہ نکالیں گے پھر تم اس کے لیے کام کرنا میں کوشش کررہا ہوں کہ لاہور برانچ میں میرا ٹرانسفر ہو جائے پھر سوچیں گے کچھ۔"

اسے سنبل کی دل آزاری ہرگز منظور نہ تھی حالانکہ اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ وہ ہاشم کے پرچے کے لیے سروے کرے مگر وہ سنبل کو منع بھی نہ کرسکا اور یوں اس کے کہنے پر ہی ابو اور امی نے اسے کام کرنے کی اجازت دی۔

"تھینک یو شاری!"

"میرے خیال میں ہمارے درمیان یہ فارمیلیٹیز تو کبھی نہیں رہی تھیں سنو۔"

"ہاں ٹھیک ہے تو پھر میرا تھینک یو واپس کردو۔"

"لے لو۔" شارب بے اختیار ہنس دیا۔

"اپنا خیال رکھنا بہت۔" جاتے جاتے اس نے تاکید کی تھی اور ایک بار پھر اسے سمجھایا تھا کہ وہ جلسے جلوسوں وغیرہ میں جانے سے پرہیز کرے اور اس نے واقعی ایسا کیا تھا بہرحال اسے امی ابو شارب سب کا خیال تھا۔ جب کہ ہاشم چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کام کرے۔

"سنبل! تمہاری تحریر اور تمہاری تقریر دونوں میں بہت تاثر ہے۔ تم کیوں نہیں اپنے آپ کو ہماری پارٹی کے لیے وقف کردیتیں۔ ذکا نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح تم نے چند دنوں میں طلبا کو اکٹھا کرلیا تھا۔"

"ہاشم! میں تمہارے ساتھ مل کر یہ سب کرنا چاہتی ہوں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میری فیملی کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے بلکہ امی تو اچھا خاصا ناراض ہوتی ہیں یہ شارب ہے نا اس نے ہی بڑے ابا اور ابو سے اجازت دلوائی ہے پرچے میں لکھنے کی۔ اصل میں جب وہ لاٹھی چارج ہوا تھا نا اور میں تم سے ملنے آئی تھی نا۔" اس نے ساری تفصیل ہاشم کو بتائی تو وہ لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا

پھر یکدم اس نے سر اٹھا کر سنبل کو دیکھا۔

"سنبل! مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کیا؟" سنبل کتنی ہی دیر تک حیرت سے اسے دیکھتی رہی اس نے ایسا کبھی نہیں سو
حالانکہ یونیورسٹی میں اکثر لڑکیاں ہاشم کو پسند کرتی تھیں اس کی شاعری کی وجہ سے اور ا
شخصیت کی وجہ سے لیکن سنبل کو اس کے کاز سے پیار تھا۔ وہ اس کے اونچے آدرش کی وجہ سے
کی فین تھی۔

اسے ہاشم کے جذبہ حب الوطنی سے محبت تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم وہ شخص ہے جو ایک
قائداعظم کی طرح اس قوم کی تقدیر بدل دے گا۔

"ایسی کوئی جلدی نہیں ہے سنبل! تم اچھی طرح سوچ لو۔" وہ کھڑا ہو گیا میں تمہیں کھونا
چاہتا میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا ساتھ بہت ضروری ہے او کے مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے ا
سعید خان نے مجھے بلایا تھا وہ شاید کوئی پریس کانفرنس کرنا چاہتے ہیں۔

وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور سنبل کے لیے سوچ کے دروازے کھول گیا۔

"یہ...... یہ ہاشم نے کیا کہہ دیا تھا۔"

وہ ازحد مضطرب اور بے چین تھی۔

"کیا ہاشم اس سے محبت کرتا ہے؟"

اس نے خود سے کئی بار سوال کیا۔ لیکن ان دو سالوں کی رفاقت میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا ن
تھا۔ جس لمحے اسے احساس ہوا ہو کہ ہاشم اس کے لیے اپنے دل میں اس طرح کا کوئی جذبہ
ہے۔ ہاں کئی بار اس نے اس کی تعریف ضرور کی تھی۔ اس کے کام کی اس کے آرٹیکل کی اس
جذبے کی۔

وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو کھلے دل سے سراہتا تھا شکیل کو عابد رضوی کو ذکا کو سب
اور اسے خاص طور پر اس لیے بھی سراہتا تھا کہ وہ مالی طور پر بھی اکثر نامساعد حالات میں مد
کرتی تھی پرچے کا ڈیکلریشن بار بار ضبط ہونے کی وجہ سے پرچہ ہمیشہ مالی بحران کا شکار ر
تھا۔

پھر ہاشم نے کیوں پرپوز کیا تھا اسے۔

"اور کیا وہ...... کیا وہ ہاشم سے محبت کرتی ہے۔"

اس نے پھر اپنے آپ سے پوچھا لیکن اس سوال کا کوئی جواب بھی اس کے پاس نہ تھا وہ
م کو پسند کرتی تھی اس کی عزت کرتی تھی لیکن شارب۔

"شارب!" اس کے دل میں کسی نے چٹکی سی لی۔

"کیا وہ شارب سے محبت کرتی ہے۔ اس کے متعلق بھی اس نے کبھی سوچا نہ تھا وہ اور
ارب ہمیشہ سے بچپن سے اکٹھے تھے اس کے متعلق اسے سوچنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی
ں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کہیں الگ ہونا ہوگا۔"

"بڑے ابا۔ بڑی امی شارب ان سب سے بلکہ جیسے اب بچپن سے ہی ادراک تھا کہ اسے
ہ اسی گھر میں رہنا ہے۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ سنبل کو کسی اور گھر جانا ہے ہاں مونا کا ذکر کر
ے اکثر سب افسردہ ہوتے تھے خاص طور پر امی۔"

کاش سنبل کا کوئی بھائی ہوتا تو مونا کو باہر کیوں دینا پڑتا اور اب ہاشم نے اسے عجب الجھن
ال دیا تھا اگرچہ باقاعدہ اس کی اور شارب کی منگنی نہیں ہوئی تھی پھر بھی۔

ازحد پریشان ہو کر اس نے مونا کو فون کر دیا۔ مونا اس سے صرف ایک سال بڑی تھی پھر بھی
اپنی ہر مشکل اسی سے ڈسکس کرتی تھی۔

"مونا! مجھے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے پلیز آ جاؤ نا ابھی۔"

"سونو! کیا بات ہے؟" مونا پریشان ہو گئی۔

"پریشان نہ ہو مونا! لیکن مجھے تمہاری ضرورت ہے؟"

بڑی امی اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"ارے اس وقت وہ بھی اکیلی عدنان کہاں ہے؟

"عدنان تو انکل کے آفس گئے ہیں میرا دل چاہ رہا تھا سونو سے ملنے کو۔ میں نے فون کر
ے گاڑی منگوالی۔"

بڑی امی اور امی سے ملتی وہ سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔

اور پھر اس کی بات سن کر ایک لمحہ کو حیران رہ گئی۔

"سونو...... تم...... تمہیں اسے بتا دینا چاہیے تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔"

لیکن مونا! اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا فیصلہ کرو ل

"سونو! کیا تم...... تم ہاشم کو پسند کرنے لگی ہو اس حد تک کہ۔"

"پتا نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔

"کیا تم جانتی ہو سونو! کہ ہم سب کی کیا خواہش ہے اور خود شارب کی بھی۔"

"ہاں جانتی ہوں لیکن میرے بھی تو کچھ آدرش ہیں میں نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں او نہیں کیوں مجھے لگتا ہے۔ جیسے یہ خواب یہ آدرش صرف اور صرف ہاشم کی ہمراہی میں پور۔ سکتے ہیں۔"

وہ ایک بات جو ابھی تک وہ خود سے بھی نہیں کہہ پائی تھی ایک دم مونا سے کہہ دی تو مونا از حد دکھ سے اسے دیکھا۔

"سونو! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم اس طرح کی حماقت کرو گی۔"

"پلیز مونا! میری مدد کرو امی سے کہہ دو کہ وہ ہاشم مجھے پروپوز کر رہا ہے اور......"

"میں کم از کم تمہاری اس حماقت میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اگر کچھ کہنا ہے تو خود ہی دو۔" مونا اس سے خفا ہو کر بڑی امی کے کمرے میں چلی گئی۔ مگر وہ سنجیدگی سے ہاشم کے مت سوچنے لگی۔

ہاشم میں کیا کمی ہے اور پھر ہاشم کے سنگ وہ آرام سے اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتی تھی نے کہا تھا وہ اسے کھونا نہیں چاہتا۔

اسے اس کی ضرورت ہے سنبل کی۔

"وہ جتنا سوچتی اتنا ہی ہاشم کے متعلق اس کا خیال پختہ ہوتا جاتا۔ کہ ہاشم کی بات ما جائے۔"

اس روز مونا اس سے بات کیے بغیر اور ملے بغیر واپس چلی گئی تھی شاید وہ اس سے ہو گئی تھی لیکن وہ کیا کرتی جوں جوں وہ سوچتی اسے لگتا جیسے وہ ہاشم کے ساتھ اچھی اور بہتر گزار سکے گی۔ بالکل اپنے خوابوں اور آدرش کے مطابق مونا نے شاید شارب کو بتا دیا تھا تو وہ آ گیا تھا بغیر اطلاع کے۔

"ارے شاری تم! اسے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گئی تھی۔"

یقیناً شارب ہی وہ واحد شخص تھا جو اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا تھا بچپن سے لے کر اب تک ہر معاملے میں وہ اسے سپورٹ کرتا آیا تھا۔

"یہ مونا کیا کہہ رہی ہے سونو؟"

"وہ بے حد تھکا تھکا اور نڈھال لگ رہا تھا۔ شاید بڑی امی سے مل کر وہ سیدھا اسی کے پاس آیا تھا۔"

"ہاں شاری! ہاشم مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اور تم" شارب کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

"میں بھی۔" اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

شارب کو یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو اور کوئی بہت بڑی عمارت گر گئی ہو اور وہ اس کے ملبے کے نیچے دب گیا ہو بڑی دیر بعد اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"سونو! سوچ لو اچھی طرح سے بعض خوابوں کی تعبیریں بڑی بھیانک ہوتی ہیں تم ہاشم کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔ بہت جلد تھک جاؤ گی وہ جس خارزار کا مسافر ہے وہ راستے تمہارے لیے بہت طویل ہو جائیں گے سو تم نہیں چل سکو گی۔"

"شاری! کیا تم میری مدد نہیں کرو گے۔ کیا ہم اچھے دوست نہیں ہیں ہمیشہ سے بچپن سے"

"ہیں...... لیکن ابھی فیصلہ کرنے میں جلدی مت کرو کچھ دن اور سوچ لو میں بھی ذرا ہاشم کے متعلق پتا کروں گا کون ہے؟ کیا فیملی بیک گراؤنڈ ہے وغیرہ وغیرہ۔"

اپنے دل کی آرزوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے شارب نے کہا تو وہ جو اتنے دنوں سے مضطرب سی تھی۔ اسے سکون سا مل گیا اور سارا بوجھ شارب کو منتقل کر کے وہ بہت آرام سے سو گئی شام کو اٹھی تو پرچے کے دفتر جانے کے لیے تیار ہو گئی دو دنوں سے آرٹیکل لکھا ہوا تھا لیکن جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا شارب باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔

مضطرب اور بے چین سا۔

"تم سوئے نہیں شاری؟"

وہ اس کے قریب چلی آئی۔

شارب نے صرف نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ تو پتا نہیں کب سے جاگ رہا تھا کتنی راتوں

سے جب سے مونا نے اسے فون کر کے سنبل کی خواہش بتائی تھی۔

''کیوں جا رہی ہو؟''

''یہ آرٹیکل دینا تھا عابد کو۔''

''چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

دفتر میں ذکا عابد ہاشم تینوں تھے اور آئندہ ہونے والے جلسے پر بحث کر رہے تھے۔

''یہ شارب ہے میرا کزن۔'' سنبل نے تعارف کروایا تھا۔

ذکا اور عابد گرم جوشی سے ملے لیکن ہاشم نے سرسری انداز میں اسے دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا اور پھر ذکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو ذکا! میں کہہ رہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ منزل کی جدوجہد کے لیے قوم کو جھنجوڑ جائے اصلاح اور آزادی کے مدھم ترانے گانے کا وقت گزر گیا ہے۔ کچھ کرنے کا وقت ہے ذکا!''

''لیکن ہاشم! ابھی تم ضمانت پر ہو کسی بھی جلسے کو منعقد کرنے کی صورت میں وہ تمہیں گرفتار کر سکتے ہیں پھر میرا خیال ہے اس جلسے میں تم تقریر مت کرو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں ایک طرف خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں اس خوف سے کہ وہ مجھے گرفتار کر لیں گے۔ ان جابر حاکموں کو قوم کی قسمت سے کھیلتے ہوئے دیکھتا رہوں۔ نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں ان ظالموں کے چہرے سے نقاب ہٹانا چاہتا ہوں میں۔''

''لیکن ہاشم۔'' عابد نے بھی مشورہ دیا۔ ''کچھ دن رک جاؤ ہولے ہولے آہستگی سے بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ اتوار کو ہونے والے جلسے میں تمہارا شرکت نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

مصلح قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہ جاگ نہ جائے
میں تو اک عام سپاہی ہوں مجھے
حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا
اور اسی سعی جگر دوز میں جاں دینے کا

اس کا لہجہ پرسوز تھا اور آواز...... سحر طاری کرتی ہوئی۔

سنبل کے رخساروں، پر سرخی دوڑ گئی اور آنکھیں دمکنے لگیں۔ وہ اپنے فیصلے میں اور بھی

مضبوط ہو گئی۔

ہاں وہ اسی عام سپاہی کے ساتھ مل کر ملک و قوم کی خاطر لڑنا چاہتی تھی۔ اس نے شارب کی طرف دیکھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

واپسی پر بھی اس نے ہاشم کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ البتہ پولکا پارلر سے اس کے پسندیدہ فلیور میں آئس کریم کھائی تھی لمبی ڈرائیو کی تھی اور مونا سے مل کر گھر آ گئے تھے۔

اگلے دو تین دن پتا نہیں وہ سارا سارا دن کہاں غائب رہا۔ سنبل بے چین تھی کہ وہ شارب سے ہاشم کے متعلق رائے لے لیکن وہ دیر تلک آتا اور آتے ہی گھر میں گھس جاتا ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ شارب گھر پر ہو اور یوں اسے نظر انداز کر دے اس شام وہ آیا تو وہ سیدھی اس کے کمرے میں چلی آئی وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پر ترچھا لیٹا تھا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''کہاں غائب رہتے ہو سارا دن؟''

''یوں ہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں۔''

''پہلے تو تم ایسے نہیں تھے شارب!''

''پہلے تم بھی ایسی نہیں تھیں سونو۔''

اس نے گہری نظروں سے سنبل کو دیکھا۔

''میں نے ہاشم کے متعلق پتا کیا ہے اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بہت کمزور ہے اس کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے اس کے والدین بہت معمولی۔''

''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے شارب؟'' سنبل نے اسے ٹوک دیا۔

''تمہیں نہیں پڑتا لیکن باقی سب کو پڑتا ہے بابا کو چھوٹے ابا کو اور مجھے۔ ہمارا ایک مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ ہے سونو۔ اور وہ دیکھو۔''

وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بالکل سامنے۔

''ایسا مت کرو سونو! اپنا فیصلہ بدل دو۔ تم ہاشم کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو شارب کہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہوں گی۔''

''اس لیے کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں اور ہاشم میں اور بھی کمزوریاں ہیں اس کے بہت قریب رہنے والوں سے ملا ہوں۔ اس کا کردار بھی مضبوط نہیں ہے سونو اور وہ ایک عجیب و

غریب نیچر کا ہے تم جیسی نازک دل کانچ پیکر لڑکی اس کے سنگ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔"

"میرے سامنے ایک مقصد ہوگا تو میں خوش رہوں گی ہم دونوں مل کر اس قوم و ملک کے لیے وہ کچھ کریں گے۔ جو پہلے کسی نے کبھی نہیں کیا۔"

وہ بولتی رہی دلائل دیتی رہی۔ تو وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"سونو! کیا تم جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں بے حد اور میں نے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں یہاں اس امن ہاؤس میں سنگ سنگ جینے کے خواب۔"

اس نے سر ہلایا۔

"پھر کیوں کر رہی ہو ایسا؟"

"اور اس کیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا بس اسے لگتا تھا جیسے وہ ہاشم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے اور ہاشم کو اس کی ضرورت ہے وہ ہاشم کے ساتھ نہیں ہوگی تو ہاشم کا مشن ادھورا جائے گا۔

اس کے آدرش بکھر جائیں گے۔

وہ ہوگی اس کے سنگ سنگ اس کا حوصلہ بڑھانے کو تو وہ اپنے مقاصد کو پا لے گا۔

"کیا تم...... کیا تم بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی نہیں سونو۔"

"ہاں کرتی ہوں۔" اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے لگا کہ وہ شارب سے محبت نہیں کر ہے بے حد لیکن۔

"پھر...... کیا تم اپنے اوپر بھی ظلم نہیں کر رہی ہو۔"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے شاری! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے کزن ہو زندگی کے سارے دن بچپن سے لے کر اب تک تمہارے سنگ گزرے ہیں ہم مل کر روئے اور مل کر ہنسے ہیں تمہیں کانٹا بھی چبھے گا تو اس کی تکلیف مجھے اپنے دل میں محسوس ہوگی۔"

"پھر اب...... اب کیوں محسوس نہیں کر رہی ہو اس تکلیف کو جس سے میں گزر رہا ہوں میرے دل کو توڑے جا رہی ہے۔" شارب نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

"لیکن شاری میں نے جو خواب دیکھے ہیں ان کی تعبیر صرف اور صرف ہاشم کے پاس ہے

"تم غلط سوچ رہی ہو سونو! تم نے آزمایا ہی نہیں اور فیصلہ کر لیا میرے پاس بھی تمہارے

خوابوں کی تعبیر ہے لیکن تم۔"

"پلیز شاری! مجھے آرگو مت دو مجھے بے حوصلہ مت کرو میرا ساتھ دو۔"

شاری خاموش ہو گیا جانتا تھا کہ وہ بچپن سے ہی بہت ضدی ہے جو ٹھان لیتی ہے وہ کر کے رہتی ہے۔" اسے سمجھانا اور بحث کرنا فضول تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کرتا تھا لیکن سنبل نے ہاشم کو فون کر دیا تھا کہ وہ اپنا پروپوزل لے آئے اور یہ اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد اور یقین تھا کہ وہ خود ہی اپنا پروپوزل لے کر آ گیا تھا۔

"میرے والدین بوڑھے ہیں اور دور دراز ایک پہاڑی گاؤں میں رہتے ہیں اس لیے خود حاضر ہو گیا ہوں البتہ شادی پر وہ آ جائیں گے۔"

بڑے ابا نے بہت تحمل سے اس کی بات سنی تھی۔

"ہاشم میاں! آپ یقیناً ایک جانی پہچانی سی شخصیت ہیں اور جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ سو آپ کا آنا سر آنکھوں پر لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم لوگ فیملی سے باہر اپنی لڑکیوں کی شادیاں نہیں کرتے اور پھر سنبل کے لیے بھی ہمارا خیال گھر میں ہی ہے۔"

"لیکن محترم بزرگ میں یہاں یوں ہی منہ اٹھائے نہیں آ گیا میرے پاس بھی کوئی یقین تھا جو مجھے یہاں تک لے آیا ہے پلیز آپ سنبل سے بھی پوچھ لیجئے گا اور پھر مجھے انفارم کر دیجئے گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"شارب کو اس کا یہ رعونت بھرا انداز پسند نہیں آیا تھا اور بڑے ابا بھی کچھ ششدر سے ہو گئے تھے۔"

"شارب" اس کے جانے کے بعد انہوں نے زخمی نظروں سے شارب کی طرف دیکھا تھا۔

"جی بابا! یہ صحیح کہہ رہا ہے۔"

شارب نے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی۔ جانتا تھا کہ وہ کتنا چاہتے ہیں سنبل کو انہوں نے اپنے سے دس سال چھوٹے اس بھائی سے بچوں کی طرح محبت کی تھی اور اس کے حوالے سے سنبل انہیں اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر عزیز تھی۔

"وہ تو معصوم ہے انجان ہے شاری اور یہ...... یہ لڑکا ہاشم یہ تو اندر سے بہت چھوٹا آدمی لگ رہا ہے۔ تم نے دیکھا تھا اس کا انداز۔ اس کا اسٹائل احساس کمتری کا مریض لگ رہا تھا۔"

بابا کی نظریں بہت گہری تھیں لیکن سنبل کو کون سمجھاتا۔
امی نے تو اس کی خوب بے عزتی کی تھی بس مارنے کی کسر رہ گئی تھی اور ابو نے صاف انکا
دیا تھا۔

”وہ بے وقوف ہے بھائی جان! ہم تو نہیں آپ شارب کی شادی کی تیاری کریں سنب
صرف آپ کی ہی بہو بن سکتی ہے۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“ بڑے ابا بے بس دکھائی دیتے تھے۔”اس کی خواہش اس کی مر
کے بغیر کیسے زبردستی کر سکتے ہیں ہم۔“

”نہ ہو اس کی مرضی لیکن اس کی یہ ضد نہیں مانی جا سکتی ناممکن ہے۔“

ابو نے فیصلہ سنا دیا تھا لیکن سنبل نے تو رو رو کر حشر کر دیا مرنے کی دھمکیاں دیں ہاشم ک
قدر ناراض ہوا تھا فون پر۔

”سنبل! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم گھر میں پہلے سے بات کیے بغیر مجھے گھر آنے کو
دو گی۔“

”لیکن ہاشم! جب تک تم پرپوزل نہ بھیجتے تو میں کیسے کہہ دیتی کہ میں تم سے شادی ک
چاہتی ہوں۔“

”اب رائے پوچھیں گے تو میرا فیصلہ ظاہر ہے تمہارے حق میں ہی ہو گا۔“

”لیکن تمہارے بڑے ابا نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔“

”مگر بڑے ابا مجھے چاہتے بھی بہت ہیں ہاشم! تم بے فکر رہو۔“

اس نے ہاشم کو تو تسلی دے دی تھی لیکن ابو کا فیصلہ سن کر ہراساں ہو گئی تھی تب اس
شارب سے مدد چاہی۔

”شاری! تم...... کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟“

”میں کیا کروں سونو! چھوٹے ابا میری بات نہیں سنتے وہ بہت غصے میں ہیں۔“

”دراصل تم خود ہی نہیں چاہتے کہ میری شادی ہاشم سے ہو۔“

وہ ایک دم ہی غصے میں آ گئی تھی۔

”تم خود غرض ہو محبت کرتے ہو اس لیے نہیں چاہتے ایسا مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو لیکہ

فائدہ جب میں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہوں گی۔ محبت کرتے ہو سچی اور خالص تو میری خوشی
خیال ہونا چاہیے تمہیں نہ کہ۔“

”سونو!“ شارب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔

”تو اگر محبت کرتے ہو واقعی مجھ سے تو ابو کو منالو کہ وہ ہاشم کو انکار نہ کریں۔“

وہ اسے امتحان میں ڈال کر چلی گئی اور جانے شارب نے پھر کیسے منایا تھا۔ ہاشم کو ہاں کہلا
دی گئی تھی امی تو اس سے بات ہی نہیں کرتی تھی ہاں بڑی امی تھیں۔شارب اور مونا تھے جو سب
تیاری کر رہے تھے۔

”سونو! تم نے اچھا نہیں کیا نہ اپنے ساتھ نہ شارب کے اور ہمارے ساتھ اور دیکھ لینا
پچھتاؤ گی ایک دن۔“

بارات والے دن مونا نے کہا تھا۔

”بددعا تو نہ دو مونا!“

”بددعا نہیں دے رہی سونو!“ مونا روہانسی ہو گئی ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں جو فی الحال
تمہاری نظروں سے بوجھل ہے لیکن کیا اتنے بہت سارے لوگوں کو دکھ دے کر خوش رہ سکو گی خد
تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور ہمارے حصے کی خوشیاں بھی تمہیں مل جائیں کہ ہم نے تمہیں بے حا
بے حساب چاہا ہے۔“

وہ اسے گلے لگا کر رو پڑی۔

اور کتنا صحیح کہا تھا مونا نے سب کو دکھی کر کے وہ کہاں خوش رہ سکی تھی ہاشم کے سنگ ایک دن
بھی خوش نہیں رہ پائی تھی۔

وہ کانچ کا پیکر لڑکی۔

جس کا دل بے حد نازک تھا۔

جو بے حد حساس تھی۔

گلاب کی کلی سے مضطرب ہونے والی شہزادی۔

پہلے روز ہی ہاشم نے اس کے دل میں اچانک اگ آنے والے محبت کے پودوں کو اجاڑ دیا۔

”سنو سنبل! میں ایک بہت سچا اور کھرا آدمی ہوں میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا میں شاید تم

سے محبت نہ کر سکوں اس لیے کہ میں تم سے ملنے سے پہلے ہی اس جذبے سے روشناس ہو چکا ہوا
میں غزالہ سے محبت کرتا ہوں آج سے نہیں آٹھ سال سے کر رہا ہوں وہ بھی مجھ سے محبت کر
ہے۔اتنی ہی شدت سے جتنی شدت سے میں کرتا ہوں۔میں نے اس کے ساتھ بہت سے دا
اور بہت سی شامیں گزاری ہیں اور میں اس کے اتنا قریب بیٹھا ہوں کہ اس کی سانس تک کی آو
سنی ہے میں نے لیکن اس کے دولت مند باپ نے مجھے میری غربت کی بنا پر ریجیکٹ کر کے اس
شادی اس کے کزن سے کر دی لیکن میری محبت روز اول کی طرح ہے تر و تازہ اور فریش میں آ
بھی صرف اور صرف غزالہ سے محبت کرتا ہوں سو تم مجھ سے محبت مطلب مت کرنا ہاں ایک بیوی
حیثیت سے تمہارے حقوق پورے کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ ہاشم اس سے اپنی محبتوں کا اظہار کرے گا اسے بتائے گا کہ وہ ا
سے محبت کرتا ہے اس وقت سے جب پہلی بار یونیورسٹی میں اس نے اس کے لیے کنوینسنگ کی تھ
اس کا دل جیسے کہیں پاتال میں گر گیا اور اب تک یہ دل یونہی پاتال میں گرا ہوا تھا۔وہ اس
پوچھنا چاہتی تھی پھر اس نے اس سے شادی کیوں کی بھلا بغیر محبت کیے دو افراد ایک چھت
کیسے رہ سکتے ہیں۔

لیکن وہ رہ رہے تھے پورے بارہ برس سے۔

ایک ہی چھت تلے بغیر محبت کیے محض فرائض نبھاتے ہوئے۔

مگر تب اس کے اندر گویائی مر گئی تھی۔

اور پھر بہت دن بعد ایک روز ذکا اور عابد کی باتوں سے اس نے جانا تھا کہ ہاشم نے
سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ وہ والدین کی اکلوتی بیٹی ہے اور ان کی بے تحاشا دولت
وارث ہے اور اسے مالی سپورٹ کی ضرورت تھی۔شادی تو اسے کرنی تھی کہیں بھی کر لیتا لیکن
کے ساتھ شادی کرنے میں اس کے بہت سے مفادات وابستہ تھے۔ان دنوں جب اس نے
سے شادی کی تھی۔اس کے مالی حالات بہت خراب تھے۔یہاں تک کہ پرچہ جاری رکھنا
مشکل ہو رہا تھا۔اگرچہ پارٹی کی طرف سے بھی اس کی تھوڑی بہت ہیلپ ہو جاتی تھی لیکن ا
پارٹی میں اتنی زیادہ اہمیت بھی حاصل نہ تھی۔اسے پارٹی جوائن کیے بہت زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا
وہ خود بہت آگے تک جانا چاہتا تھا اور اس روز جیسے اس کے دل کے ایک حصے پر پالا آ گرا......

پھر دل کا وہ حصہ کبھی سرسبز نہ ہوا وہاں ہمیشہ پت جھڑ ہی رہا کوئی بھی لمحہ اسے سرسبز نہ کر سکا۔

نہ انیل اور فرحان کی آمد۔

نہ ہاشم کی وزارت کوئی بھی چیز اس کے دل میں ٹھہر جانے والے پت جھڑ کو ختم نہ کر سکی تھی۔

زندگی کی وہ رمق جو پہلے روز ہاشم نے اس سے چھین لی تھی وہ پھر اس میں زندہ نہ ہو سکی تھی حالانکہ اس نے ہاشم کا بہت ساتھ دیا۔محض اس ایک خواہش میں کہ شاید ہاشم وہ نجات دہندہ ہو جس کے خواب اس نے دیکھے تھے۔

اور شاید اس ملک و قوم کی تقدیر بدل جائے لیکن مونا نے سچ کہا تھا۔

"خالی خولی تقریریں اور بلند بانگ دعوے قوموں اور ملکوں کی تقدیر نہیں بدل سکتے۔"

ہاشم بھی صرف اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔

قوم و ملک کی بقا کی نہیں۔

وہ صرف غزالہ کے باپ کو بتانا چاہتا تھا اور شاید غزالہ کو بھی وہ اتنا کم مایہ نہ تھا کہ اسے ٹھکرا دیا جاتا۔اس کے دل میں قوم کا درد کتنا تھا اس کا اندازہ سنبل کو اچھی طرح ہو گیا تھا۔

شارب نے اس کی شادی کے کچھ دنوں بعد ہی ملک چھوڑ دیا تھا۔

بڑے ابا بیمار رہنے لگے تھے بڑی امی اور امی نے چپ کی بکل اوڑھ لی تھی وہ گھر جاتی تو یہ خاموشی کاٹ کھانے کو دوڑتی اسے ابو گھر پر ہوتے تو سر پر ہاتھ پھیر کر خیریت پوچھ لیتے۔

بڑے ابا پاس بھی بٹھاتے باتیں بھی کرتے حال احوال بھی پوچھتے اور ان کے پاس بیٹھے ہوئے ان سے باتیں کرتے ہوئے اسے لگتا تھا جیسے اس کا دل پانی ہو کر بہہ جائے گا۔

"ہاشم ٹھیک تو ہے نا بیٹا! تم خوش تو ہو نا بیٹا۔"

بڑے ابا ہر بار اس سے ضرور پوچھتے تھے۔

اور وہ سر جھکا لیتی۔"جی بڑے ابا۔"

"شارب کا فون آیا تھا امریکہ میں ہے۔"

وہ ہر بار اسے شارب کی خیریت کی خبر ضرور دیتے تھے اور اس کے پاؤں میں تو جیسے چکر تھا ایک جگہ ٹھہرتا ہی نہیں تھا یہاں وہاں۔

امی ہر بار شارب کو یاد کرتیں۔

"بے چارہ بچہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا ہے۔" ان کی آنکھیں شکوہ کرتیں۔

وہ نادم ہو جاتی۔

وہ بڑے ابا سے اپنی خوشحال زندگی کا جھوٹ بولتے بولتے تھک گئی اور امی کی شکوہ کرتی کرتی نظریں اسے برچھیاں مارتیں تو اس نے امین ہاؤس آنا کم کر دیا کبھی کبھار جب دم گھٹ تو تھوڑی سی آکسیجن لینے کے لیے آ جاتی تھی۔

گھنٹوں شارب کے کمرے میں بیٹھی اسے یاد کرتی بڑے ابا سے باتیں کرتی اور ا شکایت کرتی نظروں سے نادم ہوتی اور چلی جاتی تھی۔

اور اب تو ان بارہ سالوں میں زندگی بہت ہی بدل گئی تھی اس دوران حکومتیں دو یا تی تبدیل ہوئی تھیں۔

ہاشم اب وزارت میں تھا۔

شاندار بڑا گھر۔

بہترین سہولتوں سے آراستہ۔ ہاشم نے جو چاہا تھا پا لیا تھا عزت دولت مقام زندگی سب کچھ تھا لیکن سنبل کے حصے میں کیا آیا تھا۔

نارسائی۔

عمر بھر کے لیے پت جھڑ کے موسم اس کا مقدر ہو گئے تھے۔

اور زندگی اس کے اندر مر چکی تھی۔

پھر بھی پتا نہیں وہ کیوں زندہ تھی۔

ایک بار اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

انیل اور فرحان کو تو بہت چھوٹی عمر سے ہی ہاشم نے مری بھجوا دیا تھا وہ چھٹیوں میں آ اس سے زیادہ ہاشم کے ساتھ ساتھ رہتے۔

"میں انہیں تربیت دے رہا ہوں...... مستقبل میں ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں گی۔ وہ مقام جہاں تک میری رسائی نہیں ہوئی وہاں تک انیل اور فرحان پہنچیں گے ایک فرحان اس ملک کا وزیر اعظم ہوگا اور اگر اس وقت مجھے نہ ٹھکراتیں تو یہ اعزاز تمہیں ملتا وزیرا

ماں ہونے کا۔"

"ایک روز وہ فون پر بات کر رہا تھا۔ تو ڈریسنگ روم میں آئینے میں خود کو دیکھتی۔ سنبل سن رہی تھی۔"

"غزالہ بیگم! تم چاہتیں تو میرے ساتھ کورٹ میرج کر سکتی تھیں لیکن تم...... تم بھی دولت کی پجاری تھیں تم نے سوچا تھا میرے سنگ تمہیں بھوکا رہنا پڑے گا بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنا پڑے گا سو تم پیچھے ہٹ گئیں اور آج تم کیا ہو ایک بزنس مین کی بیوی جس کو کوئی نہیں جانتا۔ ایک مکمل گھریلو عورت اور میں ہاشم علوی جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھتا ہوں اور اس ملک کے بے شمار لوگوں کی تقدیر میرے ہاتھوں میں ہے چاہوں تو تمہارے اس شوہر کو جس نے صرف پیسے کے بل بوتے پر تمہیں جیت لیا تھا کوڑی کوڑی کا محتاج کر دوں لیکن تمہاری محبت کے صدقے میں نے اسے معاف کر دیا ہے اور وہ تمہارا باپ جو محض صوبائی اسمبلی کا ایک رکن تھا اور خود کو بڑا سیاست دان سمجھتا تھا آج۔"

وہ غزالہ سے بات کر رہا تھا اور اندر ڈریسنگ روم میں بیٹھی سنبل کا دل بالکل خالی ہو گیا تھا ویران اور بنجر۔

"کیا وہ خدا بن بیٹھا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"آج جس لڑکی کو چاہوں اس سے اپنی خلوت سجا لوں۔ تم سے زیادہ حسین اور دلربا لڑکیاں میرے شبستان کو مہکاتی ہیں لیکن تم...... تم نہیں ہو غزالہ! میں نے انتہائی قربت کے باوجود تمہیں کبھی بھی نہیں چھوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ تم کسی اور کے شبستان سجاؤ بلکہ اس لیے کہ تم میری تھیں۔"

وہ خدا جانے اور کیا کیا کہہ رہا تھا سنبل کی سماعتیں تو جیسے مر گئی تھیں وہ جانتی تھی کہ وہ غزالہ سے آج بھی محبت کرتا ہے لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ جب وہ راتوں کو گھر نہیں آتا تو کہاں ہوتا ہے۔

وہ آج بھی جلسوں میں تقریریں کرتا تو سحر طاری کر دیتا تھا۔

اس کی تقریریں لوگوں کے دلوں میں آگ لگا دیتی تھیں وہ آج بھی غریب عوام کا ہمدرد تھا لیکن سنبل کے دل پر اب اس کی باتیں اثر نہیں کرتی تھیں۔

"اس نے اپنی آنکھوں، سے اسے اپنے لیے دولت اکٹھا، کرتے دیکھا تھا۔ اپنا ضمیر

فروخت کرتے۔"

اس بے چاری عورت کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتے جو اس سے انصاف طلب کر آئی تھی۔ اپنے بے گناہ شوہر کا جسے انجانے لوگوں نے قتل کر دیا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کس طرح اس نے دو معصوم یتیم بچوں سے ا جائیداد اونے پونے خرید لی تھی تاکہ وہاں اپنا پلازہ کھڑا کر سکے۔

سو وہ نہ تو اس کی تقاریر سنتی تھی اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی سیاسی میٹنگ میں جاتی۔

"آپ کی بیوی تو کبھی بہت پرجوش رکن ہوا کرتی تھیں پارٹی کی۔" اب کیا آپ نے م دیا ہے۔" اخبار نویس پوچھتے تو وہ مسکرا کر اسے دیکھتا۔

"نہیں بلکہ ایک وقت ہوتا ہے جب عورت صرف ہاؤس وائف بن کر رہنا چاہتی ہے۔ میری وائف تھی اب صرف ہاؤس وائف ہے لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ک سنبل نہ ہوتی تو میں آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ سنبل نے مجھے بہت سپورٹ کیا ہے۔"

وہ جانتی تھی یہ سپورٹ کیا تھی بڑے ابا یا ابا نے کبھی نہیں جتایا تھا لیکن امی کے منہ سے کبھار نکل جاتا تھا۔ کہ کب کب ہاشم نے انہیں مجبور کر کے ان سے روپے لیے تھے اور یہ مرد یہ آئیڈیل مرد کتنا چھوٹا تھا شارب نے کتنا سچ کہا تھا۔

"سونو......! کیسی ہو......خوش تو ہو نا۔ اتنی اداس اتنی دل گرفتہ کیوں ہو؟"

اسے یوں مسلسل خاموش سر جھکائے کچھ سوچتے دیکھ کر شارب نے آہستگی سے کہا نے چونک کر سر اٹھایا۔ مسکرانے کی کوشش کی لیکن جیسے سیلاب امڈ آیا۔

"سونو!" بے قرار ہو کر شارب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"کیا خوش نہیں ہو سونو؟"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ کتنے سالوں وہ روئی تھی یوں اس طرح بے قرار ہو کر۔ ورنہ تو جیسے سارے آنسو برفاب کر کے اس نے اندر اتار لیے تھے۔

"مت رو سونو! میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔" وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"میں تو سوچ رہا تھا تم بہت خوش بہت مطمئن بہت پرسکون ہو گی۔ ہاشم کی کامیابیوں کی خبر مجھے ملتی رہتی تھی۔ کئی بار تم بھی دکھائی دیں اس کے سنگ کھڑی ہوئی مطمئن سی۔ پھر کیوں رو رہی ہو پلیز مت رو۔"

اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

"اچھا بتاؤ۔ کیا کرتی رہتی ہو بابا نے بتایا تھا بچے تو تمہارے مری میں ہوتے ہیں کیسے ہیں وہ تمہاری طرح ہوں گے ہیں نا۔"

اس کا دھیان بٹانے کے لیے وہ پوچھنے لگا۔

"تم اور ہاشم......کیا اب بھی پرچہ نکالتے ہو لکھتی ہو اس میں پتا ہے ایک روز میں نے یونہی ڈائری کھولی تو تمہاری نظم نکل آئی یاد ہے نا ان دنوں تم شاعری کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور کئی سیدھی نظمیں لکھا کرتی تھیں پھر تم ایک سیاست میں الجھ گئیں میرے پاس تمہاری وہ ساری نظمیں پڑی ہوئی ہیں۔"

"مگر تب تو......تب تو تم مذاق اڑایا کرتے تھے۔"

اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ اتنے برسوں کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"ہاں تب......اور کیا تم اب بھی اسی طرح اوٹ پٹانگ نظمیں لکھتی ہو۔"

"اب......اب کیا تھا زندگی میں۔"

وہ ہم اور وہ کتابیں اور وہ نظمیں۔
فقط ہیں ڈھیر کاغذ کے۔
یہاں ہم کو۔
کسی نے طاقچے میں رکھ دیا ہے اور ہم کو بھول بیٹھا ہے۔
زبانوں پر اگرچہ لفظ اگتے ہیں۔
مگر ان کو۔
یہاں اس طاقچے میں۔
چار سو پھیلے ہوئے منحوس جالے چاٹ لیتے ہیں۔
اور اک کیڑا۔

ٹشو پیپر سے اپنی انگلیوں کو صاف کرتا ہے۔

آنسو پھر اس کی پلکوں کے کنارے پر آ بیٹھے۔ آج کیا ہو گیا تھا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"ہاشم ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ؟"

شارب کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"تمہارا خیال تو رکھتا ہے نا۔"

"ہاشم وہ نہیں تھا جیسا نظر آتا تھا وہ تو بہروپیا ہے۔" وہ یکدم پھٹ پڑی۔

"کوئی تو ہو کوئی تو جس کے سامنے دل کا درد ہلکا کیا جا سکے اتنے سارے سالوں سے اپنے اندر سارے درد اتارتے اتارتے نڈھال ہو گئی تھی۔ یہ کانٹے اس کے جسم و جاں میں جاتے تھے۔"

ایک ایک کر کے وہ سارے کانٹے نکالتی چلی گئی۔

"اور ہاشم اکثر راتیں گھر سے باہر گزارتا ہے وہ غاصب ہے۔"

دولت کے یہ ڈھیر جو اس نے اکٹھے کیے ہیں جائز نہیں ہیں۔ اسے اہل وطن یا وطن محبت نہیں ہے۔

"وہ تو صرف غزالہ کے باپ کو نیچا دکھانے کے لیے سیاست میں آیا تھا اپنا آپ منوا کے لیے۔"

اور اب اس نے اپنا آپ منوا لیا ہے اور اب بھی غزالہ سے ملتا ہے۔

اور اس کے سنگ مری اور کاغان میں وقت گزارتا ہے تم نے صحیح کہا تھا شاری! کہ ہاشم کمزور کردار کا آدمی ہے لیکن میں۔

"کیا اب...... کیا اب کچھ ہو سکتا ہے سنو! کیا تم واپس پلٹ سکتی ہو اور اگر ایسا کر سکو تو ...... میں ہوں نا۔"

"واپس پلٹنا کوئی آسان تو نہیں ہوتا غلط اٹھنے والے قدم بعض اوقات چاہیں بھی تو نہیں سکتے۔"

اس نے آہستگی سے اپنے آنسو پونچھے اور کھڑی ہو گئی۔

"شاری! میں نے تم سے محبت کی تھی اور صرف تم سے لیکن جان نہ پائی۔ اور جب جانا ہاتھ خالی ہو چکے تھے۔"

"مگر۔"

"پلیز کچھ مت کہنا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کچھ بھی مت کہنا!" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیا۔

کہ یہاں موسم نہیں اچھے۔
مسافر تم پلٹ جاؤ۔
بدن کے نرم حصوں کو کسی ریشم کے مرہم میں لپیٹو۔
اور اپنے پاؤں کے تلوے۔
یہاں کی گرم نوکیلی زمین سے دور لے جاؤ۔
یہاں کی خاک ہوئی رہ گزر سے دور لے جاؤ۔
مسافر تم پلٹ جاؤ۔
کہ اب۔

"اب کیا رہ گیا ہے سنبل کے پاس ایک خالی ویران دل جہاں ریت اڑتی ہے اور کوئی سبز نہیں اگتا اور کوئی پھول نہیں کھلتے۔"

"شاری! اب واپس نہ جانا اور شادی کر لینا پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"بابا اور بڑی امی کی خاطر...... اور ابا اور امی کے لیے اس "امن ہاؤس" کے لیے۔"

جہاں اب خاک اڑتی ہے۔
اُڑا کرتی ہے وہ مٹی۔
کہ جو سبزہ اگاتی تھی۔
کہ جو بارش کے پانی میں نہا کر۔
اپنی خوشبو کو دلوں کے ہر علاقے میں اڑاتی تو۔
یہاں آئے ہوئے ویران لوگوں کو۔
اداسی بھول جاتی تھی۔

گزرگاہیں ہوا کے نرم لہجے میں۔

ہمیں نظمیں سناتی تھیں۔

کتابیں تھیں کہ جو آہستہ آہستہ۔

طلسم جاں کے عقدے کو۔

کسی حیران لمحے میں اچانک کھول دیتی تھیں۔

اس ''امن ہاؤس'' کی رونقوں کے لیے شارب بڑی امی کی بات مان لینا۔''

''اور تم...... تم سونو۔''

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

''میرے دل کی زمین پر اب کوئی مسافر کیسے قدم دھر سکتا ہے تپتی جلتی زمین ریتیلے صحر
مانند۔ سو مسافر تم پلٹ جاؤ۔''

اس نے برابر کھڑے شارب کو دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

''میرا امان رکھنا اور سنو بابا کو میرا سلام کہنا۔''

''بابا سے ملے بغیر چلی جاؤ گی۔''

''وہ سو رہے ہیں نا۔''

اس نے پلکیں جھپکائیں پھر آ جاؤں گی کل۔

پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے آج وہ ان کے سامنے بھرم قائم نہ رہ سکے گا ان کی ن
تو اسے اندر تک دیکھتی تھیں کھوجتی تھیں اور وہ ہر بار ان سے جھوٹ بول کر ان کی جھولی میں ت
کے بہت سے سکے ڈال دیتی تھی پھر بھی وہ پوچھتے رہتے تھے۔

''تم خوش تو ہونا سونو! ہاشم اچھا ہے نا تمہارے ساتھ؟''

اور پتا نہیں کیوں بابا سے مل کر ہمیشہ اسے اس شہزادی کی کہانی کیوں یاد آ جاتی تھی
کے باپ نے بہت ناز و نعم سے پالا تھا اور جسے سات گدوں کے نیچے پڑی ہوئی گلاب کی
سونے نہیں دیتی تھی۔ اور جس نے اس باپ کو دھوکا دیا تھا اور اس نے بھی تو سب کو دکھی کر د
ان سب کو جنہوں نے اسے اس شہزادی کی طرح ہی چاہا تھا۔

وہ بھی تو اتنی ہی نرم و نازک سی گلاب کی پتی سے ڈسٹرب ہونے والی اور بابا...... بابا

بادشاہ کی طرح ہی۔

''سونو اگر......''

''پلیز شارب......''

اس نے پھر اسے کچھ کہنے سے روک دیا اور سر جھکائے امن ہاؤس سے باہر نکل آئی کہ اسے
اسی طاقچے میں واپس جانا تھا۔

جہاں پر لفظ اگتے تھے۔

مگر ان کو۔

وہاں اس طاقچے میں۔

چار سو پھیلے ہوئے منحوس جالے چاٹ لیتے تھے۔

اور اک کیڑا۔

ٹشو پیپر سے اپنی انگلیوں کو صاف کرتا تھا۔

● ○ ●

''بعض لوگوں کے مقدر میں ہجر ہی لکھ دیا جاتا ہے وہ جس جانب لپکیں جس شخص کی تمنا
یں اسے کبھی نہیں پا سکتے کبھی سمتیں راستہ بدل لیتی ہیں تو کبھی انجانے میں وہ شخص ہاتھوں سے
ٹ جاتا ہے۔''

عاصم چوہدری نے بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے سوچا۔

ناکردہ گناہوں کی سزا کب تک جھیلتا رہوں گا کب تک سین یہ حقیقت کیوں نہیں جان لیتی
ول اس کا ماضی تھی اور وہ اس کا حال ہے۔

اس کا لمحہ موجود۔

اس کی ذات کا حصہ۔

اس کے دل کے ٹکڑوں نے اس کے وجود سے تشکیل پائی ہے کیا ان تینوں میں بھی وہ اس کا
ں نہیں دیکھتی۔

کتنے خلوص چاہت اور محبت سے وہ سین کی طرف بڑھا تھا لیکن سین نے اس کے خلوص کی

قدر نہیں کی تھی۔ اس کی محبت کو پہچانا نہیں تھا اور اسے اس جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکا رکھا تھ اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ پندرہ برس سے وہ سکون کے ایک ایک پل کے لیے ترس رہا تھا اور ایک پھر...... ایک بار پھر اپنی زندگی کے تپتے صحرا کو اپنے لہولہان قدموں سے طے کرتا ہوا وہ اس سمت بڑھ رہا تھا کہ اس نے ایک بار پھر اسے پیچھے دھکیل دیا تھا اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کتنی بار بانہیں وا کیے وہ اس کی طرف بڑھا تھا لیکن ہر بار سبین نے اس کے گرد نفرت اور اجنبیت دیواریں کھڑی کر دی تھیں اتنی بلند دیواریں کہ وہ انہیں پھلانگ ہی نہ سکا۔

یہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس کے چاروں اور پھیلا گویا اس پر ہنستا رہا ان کے فقرے ان کے اشارے کنائے ان کی انگشت نمائی۔

اور ان کے نوکیلے ناخنوں سے اس کے زخموں کے کھرنڈ کھرچ کر ان سے رستے لہو پر اور ہمدردی کے پھاہے رکھنے کا آزار کن سلسلہ جاری رہا سبین کے اور اس کے درمیان فا بڑھتے رہے خلیج پاٹی نہ جا سکی ان کی دوئی کبھی ایک دوسرے میں ضم ہو کر یکجان نہ ہو سکی۔

وہ ایک ہی منزل کے راہی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں سفر کر رہے لیکن اس کے راکھ ہوتے وجود میں اچانک پھر ایک چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ ایک بار پھر شدت سے وہ سبین کے قرب کی۔ اس کی رفاقت کی خواہش کرنے لگا تھا اور اس نے سوچا تھ اس سارے سیٹ اپ میں ساری قصوروار تنہا سبین نہیں ہے بلکہ لوگ اور وہ حالات ہیں جو خود پیدا ہوتے گئے اور شاید کسی حد تک وہ خود تھی اس کے کومل نازک اور نئے نویلے خوبصورت جذ پر درد کا پہلا پتھر شاید انجانے میں وہ خود ہی رکھ بیٹھا تھا اور سبین وہ نازک گل بدن لڑکی جو سارے کومل اور نازک کنوارے جذبے لیے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی درد کا یہ پتھر اٹھا اس کے ان کومل جذبوں میں آگ لگانے کا قصوروار شاید وہی تھا حالانکہ اس کی نیت میں کھو تھی۔

وہ تو پورے خلوص اور جذبے کی گہرائیوں کے ساتھ اس کے پاس آیا تھا اور ایک کے آغاز سے پہلے اس نے سوچا تھا وہ اپنا ماضی اپنی ذات سے جھٹک کر الگ کر دے گا اس سوچا تھا اپنے زخم دکھا کر اپنے درد بتا کر وہ سبین کے آنچل میں سارے آنسو بہا دے گا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی شاہراہ پر سنگ سنگ چلتے رہیں گے ہمیشہ لیکن

آئینہ اتنا مضبوط نہ تھا۔

اس کے حرف میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ اس کے درد سمیٹ کر اس کی جھولی اپنی محبتوں کے پھولوں سے بھر دیتی۔

اپنی چاہتوں کی چاندنی سے اس کے اردگرد روشنیوں کی اتنی چکا چوند کر دیتی کہ اس میں سوائے اس کی ذات کی چاندنی کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وہ چاہتی تو ہر نقش یوں مٹا دیتی کہ نام ونشان تک نہ رہتا۔

اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ اپنے حسن میں اسے ہمیشہ کے لیے یوں...... قید کر لیتی کہ وہ اس حسن کے جال سے نکل نہ پاتا لیکن اس نے اپنی نفرتوں اپنی بے اعتنائیوں اور اپنے رویوں سے س نقش کو اور بھی گہرا کر دیا تھا کبھی نہ ملنے کے لیے۔

حالانکہ یہ نقش تو اس کی محبتوں کی معمولی سی پھوار سے ہی مٹ جانے والا نقش تھا اور خود اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ سبین اس کا اس کی محبتوں کا اس کے خلوص کا اس کی چاہتوں کا یقین کر لے اور پھر ہار کر تھک کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا کہ اچانک ایک محفل میں سمیرا سے مل گئی بے حد نفیس اور سادہ سی اور اپنی باتوں سے انجانے میں سمیرا نے اس کے دل کے زخموں کو کرید ڈالا تھا اور اس کے دل میں بڑی شدت سے سبین کی یاد نے ضرب لگائی تھی وہ سبین کے س جانے کو بے قرار ہو گیا تھا۔

وہ سمیرا کو بہت زیادہ نہیں جانتا تھا ایک ڈنر پارٹی میں وہ یوں ہی بلا ارادہ اس سے باتیں لے گیا۔ وہ ”ماحولیاتی آلودگی“ کے سلسلے میں کام کر رہی تھی اور خود اس نے اس سلسلے میں کافی رچ کی تھی اور کچھ آرٹیکل وغیرہ بھی لکھے تھے اور جب یہ بات اس نے سمیرا کو بتائی تو وہ ازحد ران ہوئی تھی۔

”ارے وہ آرٹیکل آپ نے لکھے تھے میں نے نہ صرف ان کو پڑھا ہے بلکہ ان کا ریکارڈ بھی میرے پاس۔“

”کیا واقعی؟“ ہاشم چوہدری کو انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ وہ مسکرائی تھی کیا آپ کوئی کہانی نگار یا شاعر ہیں آپ اتنے ٹھوس مضامین میں بھی ری کرتے نظر آتے ہیں الفاظ میں عجیب سی نغمگی اور غنائیت ہے۔

''آپ شرمندہ کر رہی ہیں میں نہ تو شاعر ہوں اور نہ ادیب۔''

''کمال ہے میرے خیال میں آپ کو ضرور ادیب یا شاعر ہونا چاہیے بہر حال اگر آپ اب تک کوئی کہانی نہیں لکھی تو اب ضرور لکھیے گا۔'' اس نے مشورہ دیا بلکہ اصرار بھی کیا۔''

''Spare time (فالتو وقت) کا بہترین مصرف اور اپنی ذات کا کتھارسس یقین آپ بہت بہترین لکھ سکتے ہیں۔''

اور بعد میں بھی دو تین بار اس نے لکھنے پر اصرار کیا تو اس نے واقعی قلم اٹھا لیا۔

''دیکھیے میں آپ کے کہنے پر قلم اٹھا رہا ہوں مجھے شرمندہ نہ کروا دیجیے گا۔''

''ارے نہیں کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔''

اور اس کے قلم سے جو پہلی کہانی نکلی وہ اس کی اولین محبت کی کہانی تھی دل میں کھلنے پہلے کومل جذبے کی کہانی وہ سب جو وہ کومل سے کبھی نہیں کہہ سکا تھا اور وہ سب جو اس نے کوم بچھڑ کر جھیلا تھا وہ سب اس نے لکھ ڈالا تھا۔

دل میں چھپے درد کے سارے کانٹے نکال کر کاغذ پر بکھیر دیے تھے۔

''اس کہانی میں کوئی سچ ہے جو دل کو چھوتا ہے اور مٹھی میں لیتا ہے۔''

سمیرا نے اس کی کہانی پڑھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں!'' کہانی لکھتے ہوئے وہ جن موسموں میں گھر گیا تھا انہوں نے اسے نڈھال سو وہ سمیرا سے کچھ نہ چھپا سکا اور اس نے کومل کے متعلق اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور تب بڑے خلوص سے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی سیٹ کر لے یوں تنہا سفر کب تک ایک دن تنہائی کی اذیت اسے تھکا دے گی۔

''اور سنو'' اس نے ہمیشہ کی طرح پھر مشورہ دیا تھا۔ ''اپنی بیوی کو کومل کے متعلق بتانا نہیں تو اس کے دل میں گرہ پڑ جائے گی ہاں جب تم اسے دوست بنا لو اور دیکھ لو کہ و دوست بھی ہے تو تب ورنہ کبھی نہ بتانا۔''

اور وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا کہ سمیرا کو بھلا کیا خبر کہ وہ یہ حماقت کر چکا ہے اور دل میں تو ایسی گرہ پڑی ہے کہ کھلتی ہی نہیں اس گرہ کو کھولتے کھولتے اس کی انگلیاں زخمی لیکن ہر کوشش اس گرہ کو سخت ہی کرتی گئی ہے۔

سمیرا نے اس کی کہانی اور تحریر کو پسند کیا تھا اور کہا تھا کہ چند دنوں تک وہ پاکستان جا رہی ہے وہ مزید کچھ کہانیاں لکھ کر اسے دے دے۔ اس کے ایک کزن ایک میگزین نکالتے ہیں اور ہمیشہ اچھی تحریروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ کہانیاں انہیں دے دے گی اور اس نے وعدہ کر لیا تھا لیکن پھر سب سارے دن وہ کچھ نہ لکھ سکا تھا ماضی کے سفر نے اسے پارہ پارہ کر دیا تھا تھکا ڈالا تھا سمیرا پاکستان چلی گئی تھی لیکن وہ اسے اپنا ایڈریس دے گئی تھی کہ وہ کہانیاں لکھ کر اس پتے پر پوسٹ کر دے تب اس نے اپنے ایک دوست کے ہاتھ وہ کہانیاں پاکستان بھیج دی تھیں اور دوست کو تاکید کی تھی کہ پاکستان جا کر وہ یہ کہانیاں سمیرا کو پوسٹ کر دے اور خود عجیب سے موسموں میں گھر گیا تھا۔

سمیرا سے اپنا دردِ دل کیا کہا تھا سارے زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے ایک ایک درد جاگ اٹھا تھا۔ کتنی یادوں نے دردِ دل پر دستک دے ڈالی تھی سبین کی یادیں لو دے اٹھی تھیں۔

اس کی قربت کا وہ مختصر عرصہ۔

اس کی ادائیں۔

اس کا حسن اور خوبصورتی۔

اس کی حیا اور اس کا بانکپن۔

وہ تو سراپا رنگ تھی سرتاپا سانچے میں ڈھلی اور وہ ان رنگوں سے دور بے رنگ زندگی گزار رہا انارسائی کا عذاب اور جدائیوں کی اذیتیں اسپیل پل مارتی تھیں۔

سبین کے سارے رنگ ساری ادائیں اس کی تھیں لیکن وہ ان سے دور تھا کوئی بھی رنگ اس مٹھی میں نہیں تھا۔

کیا اس کا قصور اتنا بڑا تھا کہ اس کی سزا ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی؟

اس نے سمیرا کی انجانے میں کہی باتوں کو بار بار دہرایا اور سوچا۔ ہاں شاید غلطی اس کی تھی کہ انے سبین کے کومل جذبوں کا خیال کیے بغیر...... وہ تڑپ اٹھا تھا اور ایک بار پھر...... گیارہ لوں بعد ایک بار پھر اس نے اپنا آپ آزمانا چاہا تھا۔ اپنی انا کو قتل کر دیا تھا اور سوچا تھا کہ وہ سبین سامنے ایک بار پھر جھک جائے گا اس سے کہے گا۔

''آؤ سبین! پچھلی تلخیوں کو بھلا کر ہم ایک بار پھر سے زندگی کا سفر آغاز کریں جو میں نے کہا

اور کیا اور جو تم نے کہا اور کیا۔ دونوں بھول جائیں اور دونوں ایک دوسرے کو اس کی غلطیہ معاف کر دیں۔'' اس نے سوچا تھا وہ اسے منا لے گا جیسے بھی ممکن ہو۔

تنہا چلتے چلتے وہ تھک گیا تھا ایک ہی جیسے صبح و شام تنہا شامیں اور راتیں ایک سے موسم بین کرتے روتے کرلاتے اور ایک سی تنہائیوں کا زہر۔

اس کے اندر پھر سے پھول چٹکنے لگے تھے امیدیں ایک بار پھر اس کے دامن دل سے تھیں یقیناً سبین بھی تنہا چلتے چلتے تھکنے لگی ہوگی شاید وہ بھی ہر قدم اسے سوچتی ہوگی اس کی ضـ محسوس کرتی ہوگی تنہائیوں کے عذاب اس پر بھی تو یوں ہی اترتے ہوں گے ساون کی بارشـ کے من میں بھی آگ لگاتی ہوں گی چاندنی راتیں تڑپاتی ہوں گی۔

وہ بھی اندر سے ٹوٹ رہی ہوگی لیکن ظالم انا اسے جھکنے نہیں دیتی ہوگی۔

اور میں ایسا کر سکتا ہوں کہ اس کی انا کو ٹوٹنے نہ دوں۔ اسے سر بلند رہنے دوں اور کے سامنے جھک جاؤں۔

عاصم چوہدری نے بہت خلوص سے سوچا تھا اور خود پاکستان جانے کی تیاریاں کر۔ ایک بار اس نے سوچا تھا کہ وہ فون کر کے یا خط لکھ کر سبین کو بتا دے کہ وہ آ رہا ہے ہمیشہ لیکن پھر اس نے سوچا نہیں وہ اسے سرپرائز دے گا اچانک اس کے سامنے جا کھڑا ہوگا حیران کر دے گا وہ یکدم اسے اپنی بانہوں میں لپیٹ لے گا اور اس کی گل بدنی کی آ پنکھڑی سے اس خوشبو کا مطالبہ کر ڈالے گا جو اس کی تھی لیکن جس سے اس نے خود کو محرو تھا۔

اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا کیا تھا اسے لگتا جیسے برسوں کی تھکن اترنے وا دنوں وہ بہت شوخ ہو رہا تھا ایک انجانی سی خوشی نے اس کے اندر سرتیں بھر دی تھی اور ان دو تین بار وہ سمیرا سے مختلف فنکشنز میں ملا تو اس سے بھی شوخ ہو گیا۔

''ہیلو کیوٹ!'' ذرا سا سر خم کر کے اس نے اسے ہیلو کیا تو ایک لمحہ کو حیران ہو کر سمیر کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

''ہیلو ناٹی بوائے۔''

وہ اسے پیارے پیارے القاب سے چھیڑتا رہا۔ اسے مذاق کرتا رہا اور اس نے

برا نہ مانا بلکہ اس کی شرارتوں سے محظوظ ہوتی رہی۔

''میں بھی بہت جلد پاکستان جانے والا ہوں۔''

''کیا شادی کرنے؟''

''ہاں شاید میں نے مما کو کہہ دیا ہے کہ میرے لیے لڑکی تلاش کر رکھیں۔'' اس کی آنکھوں کے سامنے سبین کا سراپا لہرانے لگا نازک نازک کومل سی سبین۔

''اور میں آپ سے بھی ملنے آؤں گا۔''

''ضرور۔'' وہ مسکرائی لیکن اکیلے مت آنا۔

''تو کیا لشکر ساتھ لے کر آؤں۔''

''نہیں صرف ایک عدد بیوی بھی ایک لشکر پر حاوی ہوتی ہے اچھے لڑکے! زندگی کو ضائع مت کرو چلتے چلتے تھک جاؤ گے۔''

اس کے چہرے پر خلوص کی چمک تھی ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا وہ اسے بتا دے کہ بیوی تو ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا ہے نہیں دوسرے لمحے ہی اس نے سوچا وہ سمیرا کو سرپرائز دے گا اچانک سبین اور بچوں کو ساتھ لے کر اور ایک بار پھر سبین اپنی پوری رعنائی کے ساتھ اس کے تصور میں ہلچل مچانے لگی تو وہ سمیرا کے پاس سے اٹھ آیا اور اس کے بعد سمیرا سے اس کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔

جمال اس کا بے حد گہرا دوست پاکستان جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس نے کہانیاں بھجوادی تھیں کیونکہ باوجود شدید چاہت کے وہ پاکستان نہیں جا سکا تھا اور کمپنی کی طرف سے ایک ماہ کے لیے اسے کینیڈا جانا پڑ گیا تھا۔ اب جبکہ اس نے واپس پلٹ جانے کا سوچ لیا تھا تو ایک ایک پل کتنا بھاری ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی کام بنٹا کر وہ آج ہی واپس آیا تھا اور آتے ہی اس نے گھر فون کیا تھا۔

وہ جانتا تھا مما ناراض ہوں گی تین سال ہو گئے تھے اسے پاکستان گئے اور اس نے مما سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان چھٹیوں میں پاکستان آئے گا بلکہ اس نے کینیڈا جانے سے پہلے بھی فون کیا تھا اس کی آواز سن کر بے تحاشا خوش ہوئیں لیکن وہ اس سے ناراض بھی تھیں۔

''بیٹا! تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ گھر میں تمہارے بوڑھے ماں باپ بھی ہیں جن کی

آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں اور کان ہر وقت آہٹ پر لگے رہتے ہیں۔ تم نے پندرہ اَ
تک آنے کو کہا تھا اور اب دسمبر میں فون کر رہے ہو۔''

''سوری مما! دراصل اتنی زیادہ مصروفیت تھی کہ فون ہی نہیں کر سکا لیکن مما! میں بہت
رہا ہوں۔''

''کب؟'' ان کی آواز میں جوش تھا۔

''شاید ایک دو روز میں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنے رشتوں کو بھی یاد اور قائم و دائم
یہ بہت احسن بات ہے۔''

وہ زیر لب مسکرا دیا جانتا تھا کہ مما کا اشارہ کس طرف ہے اور گھر میں سب لوگ ٹھیک
پپا کیسے ہیں اور بچے؟ سبین کا ذکر اس نے نہیں کیا تھا۔

''تمہارے پپا بالکل اچھے ہیں اور بچے اور سبین آئے ہوئے ہیں آج کل اور سبین
بات بھی کرنا چاہتی ہے کوئی بہت ضروری بات کرنا ہے اسے تم سے۔''

سبین اور یہاں مما کے پاس؟ اسے از حد حیرت ہوئی تھی اور پھر اس کے دل میں
خوشگوار سی دھڑکن نے جنم لیا۔

''بیٹا! بیوی ہے وہ تمہاری اس کی بات ایک بار سن تو لو اور خدا کے لیے یہ جھگڑ
بچوں کو تمہاری ضرورت ہے تم دونوں کی۔''

اسے خاموش پا کر مما نے کہا۔

''مما! آپ اچھی طرح جانتی ہوں ان لڑائی جھگڑوں میں میں کتنا قصور وار ہو
میں نے کہ وہ......''

''جانتی ہوں بیٹا!'' وہ افسردہ ہو گئیں انہوں نے خود ہی تو سبین کو عاصم کے لیے پ
اور پھر اسے مجبور کیا تھا کہ وہ سبین سے شادی کر لے۔

''پھر بھی بیٹا! وہ تمہاری بیوی ہے تمہارے بچوں کی ماں ہے اور......''

تب ہی سبین نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

''ہیلو عاصم چوہدری صاحب! کیا حال ہے؟''

سبین کے لہجے میں طنز تھا وہ چونک گیا۔

''ہیلو عاصم چوہدری! کیا سوچنے لگے ہیں کیا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے؟''

''سبین!'' اس کے انداز گفتگو نے عاصم کو پتا دیا۔

''خیر آپ ہم سے بھلے بات کرنا پسند نہ کریں لیکن یہ جاننے کی خواہش تو ضرور ہو گی آپ ک
کہ ہم نے سمیرا سے کیا بات کی؟ اس گفتگو کا کچھ حصہ تو سننا آپ ضرور پسند فرمائیں گے۔''

''سمیرا......کون سمیرا؟'' عاصم گڑبڑا گیا میں کسی سمیرا کو نہیں جانتا اور اگر جانتا بھی ہوں تو
تمہیں اس سے کیا۔''

یہ سمیرا سبین سے کہاں ملی اور سبین کو سمیرا کا کس نے بتایا اور پھر اس نے سمیرا سے کیا بات کی؟
وہ ایک دم الجھ گیا تھا۔

غالباً سمیرا تمہاری نئی مصروفیت ہے سبین کی آواز جیسے اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگی تھی۔

''شٹ اپ۔'' اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

وہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ سبین کے لیے کیسے احساسات رکھتا تھا ریشم ریشم
حساسات اور پچھلے ڈیڑھ ماہ میں اس نے سبین کو کتنا سوچا تھا اور تصور ہی تصور میں کتنی بار اس کو
اراتھا آوازیں دی تھیں اس کے قرب اس کی رفاقت کے لیے تڑپا تھا۔

یہ اتنی طنزیہ گفتگو یہ ایسا کاٹتا ہوا لہجہ آخر سبین کیا سمجھتی ہے اسے کہ وہ کوئی......

اور سمیرا......وہ سادہ دل لڑکی۔

پتا نہیں کہاں سے جان لیا ہے اس نے اس کے متعلق اور خدا جانے کیا سمجھ رہی ہے وہ وہ تو
ر سمیرا کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا چند ایک ملاقاتوں میں اس کی ذات کے متعلق تو کوئی
ت ہی نہیں ہوتی تھی وہ سبین کو اس کے متعلق کیا بتاتا کہ وہ کون ہے موضوع گفتگو زیادہ تر اس کی
ہانیوں کے پلاٹ اور ماحولیاتی آلودگی پر لکھے گئے اس کے مضامین اور تحقیق ہی رہے تھے۔

یا پھر ایک کمزور لمحے میں اس سے کومل کے متعلق کہہ بیٹھا تھا اور ان ملاقاتوں میں کبھی کبھار
ل کے حوالے سے بھی بات ہو جاتی تھی۔ خاص کر اس روز کے بعد سے جب سے اس نے اپنی
ہانی ''غم ہستی'' لکھی تھی اور کومل سے متعلق اپنے جذبوں کا اظہار کیا تھا۔

سمیرا کا سراپا اس کے تصور میں آیا تو اس کے ہونٹوں کے کونوں پر مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

اور سمیرا......وہ دوپہر اور شام کے سنگم پر کھڑی پرخلوص لڑکی۔جس کے متعلق وہ یہ تک جانتا تھا کہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ تنہا ہے یا......اور اسے کچھ جاننے کی خواہش بھی جان کر اسے کرنا بھی کیا تھا بس دوست تھی وہ اس کی۔

اور یہ سبین کے لہجے کی تپش یہ آگ اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔جب اس نے مجھ سے الگ کر دیا تو پھر یہ آگ یہ تپش کیوں؟ضرور وہ اس کے دل میں کہیں موجود ہے تب ہی تڑپ اٹھی ہے۔

تب ہی تو اس کے لہجے میں اتنا زہر گھلا ہوا ہے لیکن سمیرا......سمیرا کہاں ملی اسے۔یہ عق نہیں ہو پا رہا تھا۔وہ ایک طویل سفر کر کے آیا تھا اور آتے ہی............

اس نے کپڑے تبدیل کیے اور اپنے لیے کافی بنائی۔

''کیا سبین کو فون کروں یا سمیرا سے پوچھوں؟''ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی بیل دوسری طرف جمال تھا۔

''ارے جمال!تم کب آئے پاکستان سے؟''

''ایک ہفتہ ہو گیا اور تم کیوں نہ آئے پاکستان؟''

''بس یار!یوں ہی کام میرے اندازے سے زیادہ تھا۔''

''آنٹی کو بھی تمہارا بہت انتظار تھا۔''

''ایک دو روز تک جاؤں گا۔ابھی مما سے بات ہوئی ہے۔''

''ضرور جانا آنٹی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی اور ہاں سوری یار وہ لفافہ جو پوسٹ کرنے کے لیے دیا تھا وہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔آتے ہوئے اپنا اٹیچی کھولا پڑی اب ٹی سی ایس جانے کا وقت نہ تھا سو آنٹی کو بھجوا دیا تھا لیکن سبین بھابھی آئی ہوئی تھیں میرا ملازم انہیں دے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ کل ہی پوسٹ کر دیں گی۔''

تو یہ بات تھی لفافے پر سمیرا کے ایڈریس کے ساتھ اس کا فون نمبر بھی تھا۔یقیناً س فون پر سمیرا سے بات کی ہوگی۔

عاصم نے ایک گہری سانس لی عقدہ حل ہو گیا تھا سبین نے یقیناً پیکٹ کھولا ہوگا سمیرا ایک خط بھی تھا اپنے مخصوص شرارتی انداز میں وہ جانتا تھا سمیرا اس کی شرارت سمجھتی تھی

''کومل'' کے حوالے سے لکھی گئی کہانی ''غم ہستی'' کا حوالہ بھی تھا۔اس سے جانے سبین نے کیا کیا کہانیاں گھڑلی ہوں گی وہ تو پہلے ہی اس سے خفا رہتی تھی اب بے شمار نئی کہانیاں اور جھگڑے اور پھر جانے سمیرا سے اس نے کیا کیا کہا ہوگا۔

اور سمیرا......

سمیرا نے کیا سوچا ہوگا وہ تو سبین کے وجود سے بے خبر تھی سب ہی کچھ رائیگاں ہے۔

جمال کی ذرا سی غلطی نے اس کے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اینٹ اینٹ کر کے جوڑی گئی عمارت کو دھڑام سے گرا دیا تھا۔وہ سبین کو جانتا تھا اس کی رگ رگ سے واقف تھا وہ یقیناً بھڑک گئی ہوگی اب بھلا کہاں اس کی بات سنے گی وہ۔

اس نے سوچا اور گھر کا نمبر ملایا۔پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھانے والی سبین تھی۔

''ہیلو عاصم چوہدری!مجھے معلوم تھا کہ آپ پھر فون کریں گے کہیے کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی۔''

''سبین اگر تمہیں یہ معلوم تھا کہ میں پھر فون کروں گا تو تم یہ بھی جانتی ہوگی کہ میں نے دوبارہ فون کیوں کیا ہے؟''

سبین کے تمسخرانہ لہجے کو برداشت کرتے ہوئے عاصم نے کہا۔

''ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ آپ کو ہماری یاد ستا رہی ہوگی۔اس لیے دوبارہ فون ضرور کریں گے اور اگر ہماری یاد نہیں ستا رہی تھی تو پھر آپ خود ہی بتا دیجیے کیوں یاد فرمایا؟''

وہ ابھی تک اسی لب و لہجے میں اسے جلائے جا رہی تھی۔

''وہ لفافہ کہاں ہے تم نے اسے اپنے پاس کیوں رکھ لیا اور اسے کیوں کھولا؟''

''سنو عاصم چوہدری۔''سبین کی غصہ میں جلتی اور قہر بھری آواز سنائی دی۔''ان کاغذات میں تمہاری زندگی کے اہم اور خوبصورت واقعات لکھے ہوئے ہیں جو ہنوز میری نظروں سے اوجھل تھے تمہارا مجھ سے شادی سے انکار کرنا اور پھر مسلسل دور رہنا۔شادی کے ابتدائی چار سالوں میں صرف چند ماہ میرے ساتھ گزارے ہیں وہ بھی لڑتے جھگڑتے اور اب اگر تین چار سال بعد چکر بھی لگاتے ہو مجھ سے ملے بغیر چلے جاتے ہو۔کیوں آخر کیوں؟کیا گناہ کیا تھا عاصم چوہدری! کیوں پل پل مار ڈالا تم نے مجھے؟''

''سبین کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی عاصم کے دل کو جیسے کسی نے مٹی میں لے ک
ڈالا۔''

''سبین...... سبین پاگل! وہ کہانیاں ہیں لفظ لفظ جھوٹ محض تخیل کی کارستانیاں اور ا
ہم دونوں زندگی نئے سرے سے شروع کر سکتے ہیں۔ سبین میں......''

''کہانیاں!'' اس نے عاصم کی بات کاٹ دی۔ ''تم باہر کے ملکوں میں گھوم گھوم کر ب
کچھ کرتے ہو عاصم چوہدری انہیں کہانیوں کا نام مت دو۔ تم ہرجائی اور بے وفا یہ ہیں تمہار
وشب اور حکایاتِ دل۔''

ٹھنڈے لوہے کی دھار جیسے الفاظ نے اس کے اُمڈے ہوئے جذبات کے گلے
دردی سے زخم لگایا اور عاصم جو ہمدردی انس اور دل میں چھپی ہوئی محبت کی چنگاری کے ا
بھڑک اٹھنے پر پگھل چکا تھا جھلا گیا۔

''دیکھو سبین! تم اچھی طرح جانتی ہو میں باہر کے ملکوں میں گھوم کر یہ سب کچھ نہیں کر
کچھ نہیں ہے جس پر مجھے کوئی شرمندگی ہو۔ بے وقوف عورت! یہ صرف کہانیاں ہیں جن میں
واحد متکلم کی تکنیک استعمال کی ہے میں نے اور نہ ہی میں خود تم سے الگ ہوا تھا۔ بلکہ یہ تم خو
جس نے مجھے ایسا روپ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تم نے شادی کے پہلے روز سے ہی جو درشت
شکی اور جھگڑالو رویہ اپنایا۔ اسے کبھی بدلنے پر تیار نہیں ہوئیں آج پندرہ سال گزرنے کے بع
نہیں تم نے میرے تمام وقت کو جو تمہارے ساتھ گزرا اپنی ان ہی عادات اور رویے کی وج
عذاب ناک کر ڈالا۔ میں اپنے راستے الگ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔''

عاصم نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بھڑک اٹھی اور اس نے زو
سے ہسٹریائی انداز میں رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔

''عاصم! تم تو ہو ہی ایسے۔ شادی سے پہلے تم نے کسی کومل سے افیئر چلایا۔ اس نے
دھوکا دیا اس میں میرا کیا قصور تھا اب تم عیاشیاں کرتے پھرتے ہو اور یہ...... یہ...... اب یہ کو
چڑیا پھانس لی ہے کون ہے یہ سمیرا احسن اور کون ہوتی ہے وہ تمہارے بارے میں اتنی فکرمند ہ
والی اور تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟ اور یہ جو خط رکھا ہے ان کاغذات کے اندر تمہارے
کی چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے تم نے مجھے تو کبھی ایسا نہیں لکھا۔''

سارے کومل اور نرمل جذبے اس آگ میں جل گئے۔

''شٹ اپ!'' عاصم حلق کے بل دھاڑا۔ ''اب ایک لفظ بھی اور کہا تو بہت برا ہوگا اب کچھ باقی نہیں رہا میرے اور تمہارے درمیان۔''

''عاصم اپنے اور سمیرا کے متعلق اتنے گھٹیا اور رکیک ریمارکس سن کر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ سبین نے اپنے شکی پن اور جھگڑالو طبیعت کی وجہ سے اس کے پندرہ سال خاک میں ملا ڈالے تھے۔''

''سبین!'' عاصم ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ ریسیور میں مما کی آواز سنائی دی وہ سبین سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ فون پر کس سے جھگڑ رہی ہے اور عاصم نے سنا وہ مما کو سمیرا اور کہانیوں کے متعلق کچھ شناپ بتا رہی تھی۔

''عاصم!'' یہ سب کیا ہے؟ مما نے اس سے پوچھا ''یہ سبین کیا کہہ رہی ہے؟''

''مما! وہ سب کہانیاں......''

''کہانیاں ہوں یا افسانے۔ وہ لڑکی کون ہے جسے تم نے یہ سب لکھ کر بھیجا ہے۔ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ کیا میں سمجھوں کہ تم سبین کے ساتھ ان ہی وجوہات کی بنا پر نباہ نہیں کر پا رہے ہو۔''

''مما پلیز! میری بات تو سنیں۔'' عاصم نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن مما سخت ناراض ہو رہی تھیں۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی عاصم! تمہیں جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر بات کرو۔ غضب خدا کا پندرہ برس ہو گئے شادی کو۔''

''مما! میں نہیں آ رہا پاکستان۔''

عاصم نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا رنج اور غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، عاصم چوہدری ٹہلتے ٹہلتے رکا ٹیبل سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر سگریٹ نکال کر سلگایا اور سوچا۔

''پتا نہیں۔ سبین نے سمیرا سے کیا کہا ہوگا اور سمیرا نے کیا سوچا ہوگا اس کے متعلق کہ اس نے کبھی سبین کے متعلق اسے نہیں بتایا۔ لیکن اسے موقع ہی کہاں ملا تھا کچھ بتانے کا ابھی تو صرف وہ ''کومل'' کا دکھ ہی کہہ سکا تھا اس سے۔ جو اس کے دل میں زندہ اور مسکراتی چاروں طرف لہراتی تھی اس کی مسکان آنکھیں بند کر کے وہ اپنے چہرے کے قریب دیکھتا تھا۔ اتنا قریب کہ چاہتا تو

ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے اس کے ہونٹوں کی نرمی کو محسوس کر سکتا تھا۔ گردشِ دوراں سے گھ تصور میں اس کی نغمہ نغمہ ہنسی سن کر خود بھی مسکرا دیتا تھا۔“

اور پھر اس نے سوچا تھا وہ اچانک سبین کے ساتھ سمیرا کے سامنے جا کر اسے سرپرائز وہ یقیناً خوش ہوگی وہ خود اسے سرابوں کے پیچھے بھاگنے سے منع کرتی تھی کومل کے متعلق جا۔ بعد جتنی بار بھی وہ ملی اس نے اسے زندگی کو منظم کرنے کا مشورہ ضرور دیا تھا وہ دل ہی دل م پڑتا کہ سمیرا کو کیا خبر تھی کہ زندگی کو منظم کرنے کی ایک کوشش اس کے مما پپا نے بھی کی تھی لیک تھا آبلہ پائی اور ناکامی۔

سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کر دوسرا سگریٹ سلگانے سے پہلے اس نے سمیرا کا اور سمیرا نے اس سے گلہ کیا۔

”تم نے مجھے سبین کے متعلق کیوں نہیں بتایا میں یوں ہی تمہارے لیے لڑکیاں دیکھت اور بے یقین کر دیا تم نے مجھے۔“

”نہیں سمیرا!! ایسی بات نہیں تھی میں بس تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا میں نے سوچا سبین کے ساتھ آؤں گا تمہاری طرف لیکن وقت کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔“

وہ بھرا ہوا تھا اس کا دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا سبین نے اپنی تلخ کلامی سے اس کے دل لگائے تھے ان میں بے تحاشا جلن تھی اس کے وجود کا ایک ایک رواں اس جلن سے دہک سب کچھ سمیرا سے کہتا چلا گیا حالانکہ اسے سبین کی سبکی منظور نہ تھی وہ ہرجائی بھی نہیں کہلوانا اس نے سوچا تھا سب اچھا ہو جائے گا، وہ سبین کو منا لے گا وہ اس کے سامنے جھک جائے گا سمیرا کو حیرت تھی کہ بچے بھی ان کے درمیان وہ پل نہیں بن سکے تھے جو اس ر خوبصورتیوں کو میلا نہ ہونے دیتے۔

”یقیناً تمہاری بھی غلطی ہوگی عاصم پہلے تم اسے دوست بناتے اس کے دل میں بسر گھر کر لینے اور پھر اپنا دل اس کے آگے کھولتے دوست بننے اور دل میں بسنے میں دن لگتے تھے تم نے جلد بازی کی۔“

اگر میں نہ کہتا تو دنیا والے کہہ دیتے آپ نہیں جانتیں سمیرا وہ سب جو وہاں تخلیق ہو

”بھلے دنیا والے جو مرضی کہتے لیکن اپنی زبان سے تم اس وقت تک کچھ نہ کہتے ج

اسے دوست نہ بنا لیتے۔“

اور سمیرا کے کہنے پر اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر پرت پرت کر کے دیکھا۔ ایک ایک لمحہ سوچا۔ جانے کتنے سگریٹ پی ڈالے گلا دُکھنے لگا لمبی اور طویل رات جیسے اور بھی طویل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پندرہ سال پہلے وہ کومل کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوا تھا کہ سب کچھ بھلا بیٹھا تھا کومل ایک جرنلسٹ تھی۔ غیر ممالک میں گھوم پھر کر رپورٹنگ کیا کرتی اس کے کالم اور مضامین بھی مختلف اخبارات میں چھپتے تھے عاصم انہیں بہت دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا اس کا طرز تحریر اسے اتنا بھا گیا تھا کہ وہ ہر وقت ان اخبارات اور میگزینز کی تلاش میں رہتا۔ جن میں اس کی تحریریں چھپتی تھیں وہ غائبانہ طور پر ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا قدرت کا ایک کہانی کو تخلیق کیا جانا مقصود تھا عاصم ان دنوں امریکہ میں قیام پذیر تھا پاکستان آتے ہوئے عمرہ کی غرض سے جدہ میں اترا اور ائیرپورٹ پر کومل کو دیکھتے ہی پہچان گیا جو کسی وفد کے ہمراہ وہاں آئی تھی کوشش کر کے اس نے چند منٹ حاصل کیے اور کومل کے ساتھ ائیرپورٹ پر ہی ریستوران میں بیٹھ کر کافی پی ایڈریس کا تبادلہ ہوا۔

”کومل حیران تھی کہ اسے اس کی تحریروں کے فقرے اور تاریخیں تک یاد تھیں۔ یہ چھوٹی سی ملاقات گہری شناسائی میں بدلی۔ وہ ایک دوسرے کو خط لکھتے فون کرتے کہ یہ شناسائی گہری محبت میں تبدیل ہو گئی۔ کم از کم عاصم تو کومل کی محبت میں سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔ اسے کومل کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا اس کی محبت اس کی رگ رگ میں لہو بن کر دوڑنے لگی تھی لیکن مقدر میں کومل کی رفاقت نہ تھی اس سے پہلے کہ وہ والدین کو لے کر کومل کے گھر جاتا کومل کسی اور کی ہو گئی وہ پاگل ہو گیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کومل! خدا کے لیے کچھ کرو یہ منگنی توڑ دو میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا میں نے تمہاری خاطر بچپن کی منگنی توڑی ہے میں نے مشکلات کے پہاڑ سر کیے ہیں تب کہیں جا کر تمہاری طرف آنے کا راستہ صاف ہوا ہے۔“

لیکن تم نے دیر کر دی ہے اور میرے والدین کبھی بھی یہ منگنی توڑنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔

اس ناکامی نے عاصم کو نیم دیوانہ کر دیا اور اس نے ملک چھوڑ دیا اس کی صبحیں کومل سے طلوع ہوتیں اور شامیں اسی کے نام پر غروب ہوتیں ماما پپا کہہ کہہ کر تھک گئے۔

"عاصم! لوٹ آؤ۔ کس بات کی سزا دے رہے ہو خود کو کیوں برباد کرنے پر تلے ہو کے گھر بناؤ۔"

وہ بڑا بیٹا تھا اور اس کی شادی کی خواہش کا پیدا ہونا فطری تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کومل کے سوا کسی کی رفاقت کا بوجھ اٹھانے پر تیار نہ تھا۔

"کومل نہیں تو کوئی نہیں۔"

یہ اس کے دل کا فیصلہ تھا لیکن پھر پپا نے اسے مجبور کر دیا ان دنوں وہ پاکستان آیا ہوا شام پپا نے اسے کمرے میں بلایا۔

"عاصم! ہم نے تمہاری شادی طے کر دی ہے سبین سے وہ بہت اچھی پیاری اور سمجھ دار لڑکی ہے۔"

"مگر پپا!" اس نے تڑپ کر اپنے والد سفیر احمد کی طرف دیکھا۔

"مجھے کہیں بھی شادی نہیں کرنا کسی سے بھی نہیں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی

"وہ لڑکی کومل جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے اس کی شادی ہو گئی ہے تو تم اپ کیوں برباد کر رہے ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ بہت ڈھیل دے دی ہم نے تمہیں کہ تم سنبھ ایک ہفتہ بعد ہم ملتان جا رہے ہیں اور وہاں تمہارا نکاح ہو گا سبین سے۔"

"نہیں پپا! میں...... خدا کے لیے پپا! ایسا مت کریں۔ مجھے سنبھلنے دیں کچھ وقت د تو.........."

اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا ابھی گلابوں کی نیم وا آنکھیں آنسوؤں سے بھ ہیں۔ ابھی تو نس نس میں زہر غم خون بن کے دوڑتا ہے۔

اسے خاموش دیکھ کر سفیر احمد نے ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"ہم شادی اور نکاح کی تاریخ طے کر چکے یہ ریوالور ہے اگر تمہیں انکار ہے تو یہ گولی یا اپنے سینے میں اتار لو۔"

سفیر احمد ایک پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن اکھڑ زمینداروں والی خوبی ان کے اندر

وہی صدیوں پرانا بلیک میلنگ کا طریقہ عاصم ہار گیا اس نے ریوالور اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔

"یہ بہت اَن فیر ہے پپا۔ دس از اموشنل بلیک میلنگ"

اس نے امید بھری نظروں سے مما کی طرف دیکھا۔ مما نے تو اس کے آنسو دیکھے تھے وہ تو اس کے دل کی کیفیات سے واقف تھیں، ماں تھیں اس کے دل میں اتر چکی تھیں۔

"سبین بہت پیاری ہے ہم نے سب سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا ہے یوں تمہارے تایا اور چچا کی بیٹیاں بھی تھیں۔"

اور اس بات سے عاصم بھی بے خبر نہ تھا تائی اماں کی شدید ترین خواہش تھی۔ کہ وہ صبغہ سے عاصم کی شادی کر دیں۔ صبغہ ان کی بڑی بیٹی تھی۔ خوش شکل اور عمدہ عادات کی مالک لیکن عاصم کا دل اپنے اختیار میں ہی کب تھا کہ وہ کہیں اور دیکھتا اور پھر مما بھی چاہتی تھیں کہ وہ خاندانی جھگڑوں سے دور رہے اس نے بہت اذیت سہی تھی۔

سفیر احمد اس کے پپا درویش صفت ایماندار اور پڑھے لکھے انسان تھے خاندان میں چھوٹے بڑے سب ان کی عزت کرتے تھے۔ عاصم کے دادا لمبی چوڑی جائیداد کا نگران انہیں ہی بنا گئے تھے جس بات کا تائی کو بہت قلق تھا کہ بڑے بھائی کا حق تھا یہ لیکن دادا شاید جانتے تھے کہ سفیر احمد جائیداد ایمانداری سے سنبھالیں گے اور سب سے احسن سلوک کریں گے اور انہوں نے سفیر احمد سے اس کا وعدہ بھی لیا تھا کہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہو گا اور سب بھائی ہمیشہ محبت سے رہیں گے اور سفیر احمد بڑے احسن طریقے سے یہ ذمہ داری نبھا رہے تھے۔

لیکن تایا اور تائی جائیداد کی تقسیم چاہتی تھیں اور انہوں نے تینوں چھوٹے بھائیوں کی بیویوں کو بھی ساتھ ملا رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً جائیداد کے بٹوارے کا مسئلہ اب کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ کومل سے ملنے کے بعد عاصم نے اپنی کزن تارا سے منگنی توڑ دینے کو کہا تھا تارا ڈاکٹر تھی اور بے حد سمجھ دار۔

منگیتر ہونے کے ناتے وہ عاصم کو پسند کرتی تھی اور جب والدین کی طرف سے مایوس ہو کر عاصم نے تارا سے کہا کہ وہ کومل سے محبت کرتا ہے اور اس کو خوش نہ رکھ سکے گا تو تارا نے خود ہی منگنی توڑ دی۔ اس بات نے جہاں ایک طرف خاندان میں دوری پیدا کی وہاں تائی اماں کی خواہش بر آئی اور انہوں نے پوری کوشش کی کہ عاصم کی شادی صبغہ سے ہو جائے نہ صرف یہ کہ عاصم ایک نرم

خوکشادہ ظرف اور محبت کرنے والا لڑکا تھا بلکہ سفیر احمد کی وراثت کی لمبی چوڑی جائداد کے
ذاتی بینک بیلنس اور جائداد بھی بے تحاشا تھی لیکن عاصم نے اگر شادی کرنا ہوتی تو وہ تارا سے
لیتا چنانچہ انکار کر دیا گیا مما نے اپنی سادگی میں تائی کو بتا دیا کہ وہ کومل سے شادی کرنا چاہتا
زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔

یوں تائی اماں نے کومل اور اس کا افیئر پورے خاندان میں پھیلا دیا بلکہ اس میں مزید ا
بھی کیا وہ ایک فلرٹ اور پلے بوائے ٹائپ لڑکا ہے اور یورپ میں جگہ جگہ گرل فرینڈز بنا
عیاشیاں کرتا ہے۔اسی لیے تارا نے بھی بچپن کی منگنی توڑی ہے عاصم ماں کے اصرار پر پا
آیا تو اپنے بارے میں ادھر ادھر سے یہ کہانیاں سن کر حیران ہوا توجہ نہیں دی کومل اس کی یاد
کے خطوط اس کے کہے لفظ اس کے کانوں میں دن رات گونجتے تھے اور اب مما پاپا نے۔

"بیٹا! یہ ضروری تھا کہ اب تمہاری شادی ہو جائے۔" پپا کے جانے کے بعد مما نے
سر سینے سے لگا لیا۔

"تمہاری تائی اماں کی باتوں کا زہر مجھے اندر سے نیلا کر رہا تھا۔میں نے تمہارے
بہترین لڑکی کا انتخاب کیا ہے واجد حسین سبین کے والد تمہارے والد کے دور کے رشتے سے
ہی لگتے ہیں بیٹا مجھے شرمندہ نہ کرنا۔"

اور جب عاصم نے مما کے سینے سے سر اٹھایا تو وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کومل کی
اپنے دل میں دفن کر دے گا اور سبین کو نہ تو اپنی نارسائی کے کرب میں حصہ دار بنائے گا او
اپنے دکھ کو رسوا کرے گا وہ اس دکھ کو جو کومل کی جدائی نے اسے بخشا تھا اپنے وجدان میں اتار
اور سبین پر اس دکھ کا سایہ تک نہ پڑنے دے گا۔

مما سے وعدہ کر کے وہ اٹھا تو اس کا دل نارسائی کی اذیت سے پھٹ جانے کو تھا۔
سنبھالتا ہوا آنٹی شہلا کی طرف چلا گیا۔ڈاکٹر شہلا اس کی خالہ تھیں اور ان کے شوہر بھی ڈا
بہت دوست قسم کے تھے عاصم کی ان سے بہت دوستی تھی۔

"آنٹی! آپ نے بھی مما سے نہیں کہا پاپا کو نہیں سمجھایا۔"

"بیٹا! یہ ضروری تھا۔"

"مگر مجھے کچھ اور وقت دیا ہوتا۔" وہ گلہ کر بیٹھا۔

"گزرتا وقت تمہارے زخموں کو مندمل کرنے کے بجائے گہرا کر رہا تھا اور پھر یہاں جو
کہانیاں بن رہی تھیں وہ ناقابل برداشت ہو چکی تھیں اور سب کا منہ بند کرنے کے لیے......اب
جبکہ محمود اور جواد بھی شادی شدہ ہو چکے ہیں اور کتنا انتظار کیا جا سکتا تھا۔"

اور آنٹی شہلا سے تائی اماں کی پھیلائی کہانیاں سن کر وہ تپ اٹھا۔

"مجھے ان سب کی پروا نہیں ہے۔"

"تو کون کہہ رہا ہے تم سے پروا کرنے کو سبین اچھی لڑکی ہے میری جان! بہت جلد کومل کے
دیے زخم مندمل ہو جائیں گے۔"

آنٹی شہلا نے بھی اسے سمجھایا تو اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا وقت شاید
سب سے بڑا مرہم ہے ایک دن شاید سبین کی رفاقت اور محبت سارے زخموں کو مندمل کر دے گی۔

اس نے بھی خوش دلی سے سوچا تھا۔

نکاح ہو گیا تھا اور گھر میں چاروں بہنوں اور بھابیوں نے رونق لگا رکھی تھی۔اس کی کزنز
اکثر عاصم سے ہنسی مذاق میں کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتی تھیں جس میں ڈھکے چھپے الفاظ میں کومل
کا حوالہ موجود ہوتا۔

یا پھر اس سے یورپ کی حسیناؤں کا حال پوچھا جاتا۔عاصم حیران تھا کہ تائی اماں نے یہ
سب کام کیسے کر لیا ہے اور کتنی عمدگی سے یہ کہانیاں پھیلائی ہیں عاصم کے نکاح کی خبر نے انہیں
خاصا دھچکا لگایا تھا۔ان کی پوری کوشش تھی کہ یہ نکاح ٹوٹ جائے انہوں نے عاصم کے خاندان
کے خلاف ایک نہ نظر آنے والا محاذ قائم کر لیا تھا۔عاصم نے محسوس کیا تھا کہ ان کی پوری کوشش ہے
کہ عاصم کی شادی قائم نہ رہ سکے اور ناکام ہو جائے ان کے پاس کومل اور اس کے افیئر کا بہترین
ہتھیار موجود تھا جسے وہ موقع بے موقع استعمال کر رہی تھیں کبھی شکر میں لپیٹ کر۔

کبھی ہمدردی کے پیرائے میں اور کبھی طنز کے پتھروں میں باندھ کر۔

عاصم سب سمجھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ سبین کے اس گھر میں آنے کی دیر ہے تائی اماں یہ سارا
زہر سیاق وسباق کے ساتھ اس کے گوش گزار کر دیں گی سو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود ہی سبین کو
سب بتا دے گا بجائے اس کے کہ وہ ادھر ادھر سے سنے اور بد دل ہو۔

حالانکہ وہ سبین کے دل کو اس دکھ سے بچانا چاہتا تھا وہ کومل کی محبت کو رسوا بھی نہیں کرنا چاہتا

تھا وہ اپنی زندگی کے ان تین برسوں کو سبین سے نکاح کے بعد اپنے دل میں دفن کر چکا تھا اور یقین تھا کہ ایک دن سبین کی رفاقت میں اس درد کی کسک بھی باقی نہ رہے گی لیکن وہ نہیں جا کہ خاندان کی کوئی اور خاتون سبین کو اس کے متعلق پھیلائی گئی الفت لیلوی داستان سنائے نے پہلی رات ہی سبین کو کومل سے متعلق سب کچھ کہہ دیا۔

”یہ میرا ماضی تھا سبین! اور آج کے دن یہ ختم ہو گیا میری کم عمری کی نوخیز سی چاہت تھی میرا سب کچھ تم ہو میری زندگی اور میرے وجود کی مالک ہو میں نے سارے اختیار تمہیں د آنے والا ہر لمحہ تمہارا ہے میں سرتاپا تمہارا ہوں۔“

میرا دل آج کے بعد سے صرف تمہارے لیے دھڑکے گا۔ اس میں اور کوئی نقش نہیں سکے گا تمہارا نقش آخری ہے۔

تم کسی کی باتوں پر یقین مت کرنا سبین! ۔ لوگ بہت زہریلے ہیں انہوں نے اپنی آ میں خنجر چھپا رکھے ہیں اور جب موقع ملتا ہے سینوں میں اتار دیتے ہیں میں آج کے دن یہ سے نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے ان آستینوں میں چھپے خنجروں سے خوف آ گیا ہے میں تمہیں ہر اذیت سے بچانا چاہتا ہوں آج سے تم وہ ہو جو کوئی بھی نہیں۔“

سبین نے اس کے خلوص کی لپک محسوس ہی نہ کی۔

”جب آپ کا دل خائن تھا تو آپ کو مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”سبین پلیز مجھے غلط نہ سمجھو۔ بعض جذبے خود بخود دل میں در آتے ہیں کومل بھی ایک جذبہ تھا لیکن تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو ہر نقش پارینہ کو مٹا دے۔“

لیکن سبین پر عاصم کی کسی بات کا اثر نہیں ہوا تھا۔

ولیمے والے دن ہی اس نے اپنی والدہ کو رو رو کر ساری حقیقت بتا دی جسے تائی اماں ان کو بتا چکی تھیں۔ یہی نہیں شزا اور شمائلہ نے جو تارا اور صبغہ کی کزنز تھیں نہ صرف یہ کہ نمک لگا کر کومل کا قصہ اسے سنایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ تارا نے اسی لیے عاصم سے شادی سے انکار کرد

”یہ سچ نہیں ہے سبین! میں نے تارا سے درخواست کی تھی کہ وہ انکار کر دے کہ ان د کومل سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سچ صرف اتنا ہی ہے میں جانتا تھا کہ تمہیں یہ سب بتایا جا لیے میں نے خود ہی تم سے یہ سب کہہ دیا تھا مگر سبین! میں نے یہ عہد بھی تو کیا ہے کہ اب

پور تمہارا ہوں میری محبتیں اور میری شامیں میرے دن اور میری راتیں سب تمہاری ہیں تم میرے شب و روز کی مالک ہو۔“

”اور دل؟“ سبین نے نظریں اٹھائیں شکوہ شکایت۔

عاصم کا جی چاہا وہ ان خوب صورت دلکش آنکھوں کو چوم لے ان کی گہرائیوں میں ڈوب جائے یہ ایک ہی رات میں کیا ہو گیا تھا یہ کیسی جادوگر لڑکی ہے کیسی ساحرہ ہے کومل کا سحر ختم کیے جاتی ہے شاید یہ سنجوگ ہی ایسا حسین ہے دلکش ہے۔

”اس میں تو کومل ہی کومل ہے۔“

”نہیں میری جان تم ہو تم نے اپنی جگہ سنبھال لی ہے آ کر۔“ وہ جذباتی ہونے لگا۔

”سوری عاصم چوہدری! فی الحال میں اپنے احساسات تمہاری طرف مائل نہیں کر پا رہی ہوں میرے دل پر بہت گہری ضرب لگی ہے مجھے کچھ وقت دو۔“ اور وہ دوسرے بیڈروم میں منتقل ہو گئی۔

عاصم زبردستی نہیں چاہتا تھا ٹھیک ہے شاید کچھ وقت لگے سنبھلنے میں کاش یہ عزیز رشتہ دار نہ ہوتے تو وہ سبین کے دل کو اس درد سے آشنا نہ ہوتے دیتا وہ اپنے وجود کو اس کے گرد ایسی ڈھال بنا تا کہ کسی دکھ کی لپک اس کے دل تک نہ پہنچ پاتی وہ اپنا آپ مٹا دیتا۔

فرسٹ فلور پر تین بیڈ ڈرائنگ ڈائننگ کچن اٹیچڈ باتھ سب تھا اور مما پاپا نے اسے عاصم کے لیے آراستہ کر دیا تھا۔ یوں کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ وہ دونوں الگ الگ بیڈرومز میں رہ رہے ۔ عاصم فطرتاً نرم دل تھا اور پھر اتنے عرصہ یورپ میں رہا تھا وہ شخصی آزادی کا قائل تھا وہ کسی بھی ت کے لیے سبین کو مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ دونوں پورے خلوص اور صاف ا سے ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس کا دل صاف اور کشادہ تھا سبین اپنی تمام تر خوب رتیوں کے ساتھ اس کے دل میں براجمان ہو چکی تھی اور برابر والے بیڈروم میں سوئی وہ اس کی ہ تابیوں کو آزماتی تھی۔ کروٹ بدل بدل کر وہ سوچتا پور پور بجی سبین اس کی تھی۔

اس کی کوملتا اس کی خوب صورتیاں اس کی راتیں اس کی تھیں۔

وہ اس کے قرب کی حدت پا کر پگھل جانا چاہتا تھا اس کے اتنے قریب رہنا چاہتا تھا کہ ی مٹ جائے وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا۔

سیبن سمجھ نہیں پا رہی تھی جو گرہ لگ گئی تھی وہ کھلتی ہی نہ تھی سب کے سامنے وہ بالکل ٹھیک تھی لیکن تنہائی ملتے ہی اس کے ہونٹ زہر میں بھیگ جاتے۔

"خدا کے لیے بھول جاؤ سیبن سب۔" وہ سمجھاتا وہ ماضی تھا۔

لیکن اس نے اپنا دل پتھر کرلیا تھا شاید پیچھے سے کوئی اسے فیڈ کر رہا تھا شاید تائی اما کوئی اور وہ خود اتنی پتھر نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ تو اتنی نرمل اتنی نرم مزاج اور شائستہ تھی اس کی ساری درشتیاں صرف اس کے۔

شاید اس کی دوری اس محبت کو جلا بخشے جس کا چراغ ابھی اس کے دل میں جلا نہیں تھا۔

شاید اس کے جانے کے بعد وہ اب سب باتوں پر غور کرے جو وہ اس سے کہتا رہا تھ کر اس نے رخت سفر باندھا حالانکہ ابھی چھٹی باقی تھی۔

قریب رہ کر دور رہنے کی سزا کی اذیت وہی جانتے ہیں جو کبھی اس سے گزرے ہوں

"بیٹا! سیبن کو بھی جلدی بلوالینا اپنے پاس۔"

مما نے کئی بار کی کہی ہوئی بات دہرائی پپا نے بھی سمجھایا۔

"وہاں ہی رہنے کا ارادہ ہے تو سیبن کو بھی ساتھ لے جاؤ یہاں آنا چاہتے ہو تو و سلسلہ ختم کر کے آجاؤ۔"

وہ کب جانا چاہتا تھا وہ تو اپنے شام وسحر اس کی بانہوں میں مقید رکھنا چاہتا تھا لیکن تک اپنے احساسات اس کی طرف مائل نہ کر پائی تھی ان کے درمیان تلخ کلامی شروع عاصم نہیں چاہتا تھا کہ ان جھگڑوں کی بھنک مما پپا تک پہنچے اور وہ سوچیں کہ چونکہ عاصم ش کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے زیادتی یقیناً اس کی ہوگی چنانچہ وہ ایک اچھے اور خوب صورت دل میں واپس امریکہ چلا آیا۔ لیکن وہ اسے بلاناغہ فون کرتا خط لکھتا کہ شاید اس کی کوئی بات ا کوئی محبت بھرا لفظ سیبن کے دل کے قفل کھول دے وہ اپنے دروازے وا کر دے۔

یہی نہیں وہ اسے بے شمار اشیاء بھجواتا کاسمیٹکس ملبوسات۔

اس کا کام ایسا تھا کہ اکثر اسے دوسرے ممالک میں بھی جانا پڑتا۔ جہاں جاتا و اسے وش کارڈز بھجواتا۔ گفٹ لیتا اس کے لیے لیکن سیبن کا پتھر دل موم نہ ہوا نہ وہ اس۔ جواب دیتی نہ فون پر کوئی نرم بات کرتی۔ بلکہ اکثر ان کی گفتگو شدت اختیار کر جاتی اور فو

ملام دعا کے بند ہوجاتا۔

"آخر کیوں سیبن نہیں پگھلتی؟ عورت تو مرد کے ایک محبت بھرے جملے سے پگھل جاتی ہے جب وہ بیوی بھی ہو پھر کیا ہے جو اس کی اتنی شدید محبتیں بھی سیبن کے دل کو موم نہیں کر پا رہی تھیں۔

عاصم سوچتا اور کچھ نہ سمجھ پاتا کہ اصل محرک تائی اماں ہیں۔ جنہوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی سیبن کے بھائی فرحان سے کردی تھی اور اب مسلسل سیبن اور اس کے والدین کی برین واشنگ کر رہی تھیں اور سیبن انجانے میں وہی کچھ کر رہی تھی جو تائی اماں چاہتی تھیں۔

☆☆☆

آنٹی شہلا اور انکل وحید الزمان امریکہ آئے تو حسب معمول اس کے پاس ٹھہرے۔

"تمہیں سیبن کو یہاں بلوانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔" آنٹی شہلا نے اسے سمجھایا۔"

اب وہ انہیں کیسے بتاتا کہ ان کے درمیان ابھی وہ رشتہ ہی نہیں بن سکا تھا جو وہ ایسی کوئی کوشش کرتا۔

"وہاں تمہاری تائی اماں نے تمہارے خلاف ایک محاذ کھول رکھا ہے سننے میں آیا ہے کہ انہوں نے سیبن کے والدین کو اس بات کے لیے تیار کیا ہے کہ وہ تمہارے نام کی جائداد سیبن کے نام لکھوائیں اور یہ کہ تم اس کے لیے الگ گھر خریدو۔ کیونکہ انہیں تم پر اعتبار نہیں ہے سیبن کے دل میں تمہارے لیے نفرت پیدا کی جا رہی ہے عاصم فی الحال تو معاملہ تمہارے آنے تک ٹل گیا ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔" عاصم کو یقین تھا کہ ایک سال کی دوری نے سیبن کو بدل دیا ہوگا اس کے خطوط نے اس کے دل میں طوفان اٹھائے ہوں گے وہ ابھی اس کے لیے اتنی ہی بے تاب ہوگی اتنا کہ وہ خود تھا۔

ساری بے چینیاں دل میں سمیٹے وہ گھر آیا سیبن ویسی ہی خوب صورت اور نازک تھی۔

اس کا سراپا۔

اس کے وجود کی خوب صورتیاں اسے اسیر کر رہی تھیں لیکن اس نے ابھی تک سیبن سے کچھ نہیں کہا تھا گھر میں بڑی بہنیں اس کے آنے کی خوشی میں جمع تھیں۔

چھوٹا بھائی محمود جو ایس ایس پی تھا۔ اس کی بیوی زرتاشی جو ایک بہت اچھے خاندان کی تھی

سب سے چھوٹا جواد چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ تھا اور اس کی بیوی عارفہ جو اس کی خالہ زاد بھی تھی ب
معصوم سیرت۔ بھولی بھالی خدمت گزار اور خوش طبع دن بھر سب اسے گھیرے رہتے ہنسی مذ
چھیڑ چھاڑ سبین مسلسل اس کی نگاہوں کے حصار میں رہتی رات حسب معمول وہ اپنے بیڈروم
بند ہو کر لاک کر لیتی ایک دوبار دونوں کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوگئی۔

عاصم چاہتا تھا کہ ایک بار وہ کھل کر سبین سے بات کر لے یہ مسلسل جھگڑے کسی اچھے مستق
کی پیش گوئی نہیں کر رہے تھے۔

سبین پڑھی لکھی تھی خوب صورت تھی بات کرنے میں دھیما پن تھا خوش مزاج تھی انٹلکچوئل
خاندان بھر میں خوب صورت اور خوب سیرت مشہور تھی۔

اٹھنے بیٹھنے اور بول چال میں وقار تھا۔

لیکن عاصم کے سامنے اس کا دھیما پن رکھ رکھاؤ سب ختم ہو جاتا۔ زبان پر کانٹے اُگ آ
عاصم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیوں سبین اسے اپنی طرف بڑھنے نہیں دیتی کیوں اس
کوشش ناکام کیے دے رہی ہے۔ کیوں اس سے خواہ مخواہ جھگڑا کرتی ہے وہ ایک سال بعد آ
اور ابھی تک وہ وہاں ہی کھڑی ہے جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

اس کی آمد پر اکٹھے ہونے والے مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ وہ ان کے جانے کے بع
سے بات کرنے کے ارادے سے اوپر آیا وہ سامنے ہی لاؤنج میں کپڑے استری کر رہی تھی گ
رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس پاؤں میں سبک سے سینڈل دوپٹہ ایک طرف رکھا ہوا تھا شر
سلور کلر کی کڑھائی بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے کو چومتی ہوئی رخسار پر اٹھکیلیاں کر رہی تھ
پل کلر کی لپ اسٹک اور میچنگ نیل پالش سفید چاندی رنگت کی گداز کلائیوں میں سونے کی نا
چوڑیاں متناسب چھریرا بدن۔

عاصم ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گیا۔

وہ نگاہوں کے راستے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ سبین کو اچانک کسی احساس نے چو
اس نے مڑ کر دیکھا۔ عاصم دروازے کے قریب کھڑا اسے گہری نگاہوں سے تک رہا تھا یوں
اس کا سراپا اور شبیہہ تصور میں محفوظ کر رہا ہو۔ نگاہوں کی تپش اور یہ والہانہ پن سبین کو گھائل ک
لگا عاصم کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی طرف تھیں ہر پل ہر لمحہ۔

میرا دل ہے سیپ سمندر
میں قطرہ قطرہ برسوں
تیرے پیار کو پھر بھی ترسوں
میرا دل ہے سیپ سمندر

دروازے سے ٹیک لگائے وہ اسے دیکھتا ہوا ہولے ہولے گنگنا رہا تھا اس کی بھاری آواز
اور نگاہوں کی تپش سے اردگرد کا تمام موسم لو دے اٹھا تھا اس نے محسوس کیا جیسے سبین گھبرا رہی ہو وہ
ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کے اسے چھو سکتا تھا پرفیوم کی
مہک سبین کے گرد آنے لگی۔ وہ بے خود سی ہوگئی لہرانے لگی عاصم کو لگا جیسے وہ قطرہ قطرہ پگھل رہا ہو
وہ وہاں سے ہٹ گیا وہ وہاں ہی کھڑی اس کے سگریٹ اور پرفیوم کی خوشبو کو محسوس کرتی رہی لرز
تے ہاتھوں سے اس نے بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا۔ آنکھیں یکدم آنسوؤں سے بھر گئی تھیں کیا تھا
اگر عاصم رک جاتا اسے تھام لیتا۔

اس نے کپڑے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ کچھ کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ پتہ نہیں عاصم
کہاں چلا جا رہا تھا واپس نیچے چلا گیا تھا نیچے ڈنر کرنے وہ بھی کسی کے ساتھ ڈنر کے لیے نیچے آ گئی
اہاں سب ہی مما پپا جواد اور اس کی بیگم عارفہ لیکن عاصم نہ تھا اس کا پتا نہیں کیوں جی نہ لگا اور وہ
ند لقمے کھا کر اٹھ آئی۔

کافی دیر کے بعد عاصم آیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے آہستہ سیٹی پر کسی نغمے کی دھن بجا رہا
تھا۔ اس نے اپنے بیڈروم سے سنا وہ اسے پکار کر کہہ رہا تھا۔

"اگر ایک کپ کافی مل سکے تو میں ڈائننگ میں بیٹھا ہوں۔"

سبین نے کچھ دیر سوچا اور پھر اٹھ کر ڈائننگ میں آئی اور کافی میکر میں کافی بنانے لگی عاصم
ارڈلیس فون اٹھائے کسی سے گفتگو میں مصروف تھا دونوں کف کھول کر شرٹ کے بازو اوپر
ھائے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا گریبان کا ایک بٹن ہمیشہ کی طرح کھلا تھا
اس کی نظریں ایک لمحہ کو عاصم پر ٹک گئیں بٹن تھا ہی نہیں۔

یہ شخص اس کا ہے کتنا گہرا رشتہ ہے اور کتنا خوب صورت تعلق لیکن وہ اس کی طرف سے کتنی

لاپرواہ اسے یہ تک خبر نہیں کہ اس کی شرٹ پر بٹن تک نہیں ہے اور وہ اس کی ناراضگیوں ا خفگیوں کے باوجود اس کا کتنا دھیان رکھتا ہے جبکہ وہ۔

اپنے ہی خیالات پر حیران سی ہو کر سبین نے اس پر سے نظریں ہٹائیں اور کافی بنا کر ا سامنے آئی۔

عاصم نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس کی نظر اٹھی کی اٹھی رہ گئی حیرت اور تعریف ا چہرے پر جادوئی حروف کی طرح ابھری۔

ڈارک براؤن شلوار قمیص پر سفید کارڈیگن جس پر موتیوں کا بہت خوب صورت کام کیا ڈارک ٹین کلر کی ہلکی لپ لائننگ اور ہلکی فل اپ میچنگ نیل پالش بال پونی سٹائل میں بن ہوئے ٹینڈرا پوائزن کی بھینی بھینی مہک جو سبین کے وجود کی مہک سے مل کر انوکھا سا احسا کر رہی تھی گداز کلائیوں میں ڈھیر ساری براؤن اور گولڈن چوڑیاں بائیں کلائی میں نفیس گ واچ۔

عاصم نے بھرپور نظر اس پر ڈالی۔

یہ اہتمام یہ تیاریاں وہ یہ کارڈیگن فرانس سے لایا تھا اور رسٹ واچ سوئٹزرلینڈ

”گل بدنی گل بدنی۔“

یہ گنگنایا۔

یہ سب اہتمام تمہارے لیے ہے عاصم چوہدری!۔

”ابھی کچھ دیر پہلے وہ گھرے کپڑوں میں تھی۔ تب بھی دل میں اتری جا رہی تھی۔ ا اب تو۔

”کافی۔“ سبین کی آواز اسے دور سے آتی محسوس ہوئی وہ چونکا سبین کے لبوں پ مسکان تھی۔

”اوہ ہاں تھینک یو۔“

عاصم نے کپ پکڑ لیا اور حیران سا اس کی مسکان کو دیکھے گیا۔ آج کہیں شاید کوئی مہ اس کی زندگی میں در آیا ہے یہ بناوٹ نہیں ہے یہ حسن یہ اہتمام یہ تیاریاں۔

عاصم اس کے حسن اور بدن کے سحر میں ڈوب سا گیا سبین کے دل میں بہت انو

احساس انڈر رہے تھے۔

عاصم کی بہکتی نظروں کے تاثرات اس کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکے تھے۔ جب یہ بر بن مو احساس بنے اور نگران ہو جائے جب آنکھیں پڑھنا سیکھیں اور جب کشش بے وزنی پیدا کرے تو غرور نفسانی سے اس کی رنگت اور چمک گئی۔

وہ عاصم کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ ہزاروں لاکھوں تو کیا کروڑوں میں ایک تھی۔ عاصم بے خود ہوا جاتا تھا۔ کارڈلیس فون سے ہیلو ہیلو کی آوازیں متواتر آ رہی تھیں دوسری طرف اس کا دوست جمال تھا وہ اس کے اچانک یوں خاموش ہو جانے پر حیران تھا۔

”کل فون کروں گا۔“

اس نے فون بند کر کے میز پر پٹخ دیا۔

تخت تیرہ شی۔

بس اٹلنے کو ہے۔

آج کی شب کوئی۔

روشنی بن کے۔

دل میں اترنے کو ہے۔

اس نے زیرلب کہا اور بے اختیار ہو کر سیٹی بجانے لگا۔ اور La Traviata کی دھن ہوا میں بکھرنے لگی کافی کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ آہستہ سے اٹھا اور سبین کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور جھک کر اس کی زلفوں کی مہک لیتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”تم سینٹ اینڈ کی سپر انو مارین سے بھی زیادہ حسین اور دلکش ہو۔“

عاصم کو اٹالین Place of fastival کے اوپیرا کی ایک بے حد حسین گلوکارہ یاد آ گئی جسے پورے سیشن میں وہ بے خود اور بے اختیار ہو کر دیکھتا رہا تھا۔

”کیا کول سے بھی زیادہ حسین ہوں؟“

اندر کہیں کوئی چنگاری بھڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے کے احساسات کو جلا کر خاکستر کر گئی تھی اس کی جلتی ہوئی آواز نے جیسے عاصم کے سارے لطیف احساسات کو جھلسا کر بادِ سموم میں تبدیل کر دیا تھا

حلق تک بھر گئی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے عاصم اس کے قریب میز کے اوپر ٹک گیا اور دونوں ہاتھ
سے اس کے شانے تھام کر نرمی سے کہنے لگا۔

''سبین! میں سوچ رہا تھا کہ جب تم میرے پاس بیٹھو گی تو میں تم سے کیا بات کروں گا
دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے تم مجھ سے بھاگتی پھر رہی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں
بات شروع کروں گا۔ لیکن اب جبکہ تم نے خود بات شروع کر دی ہے تو سبین! میں پوری دیا
داری سے کوشش کروں گا کہ تمہیں اپنے احساسات اور سوچوں سے آگاہ کر دوں۔''

''میں آپ کی سوچوں سے بہت اچھی طرح آگاہ ہوں یہ بتائیں کون سی نئی سوچ اتری
جو اس قدر اہتمام سے مجھے بات کرنے کے لیے بلوایا ہے۔''

سبین نے ایک بار پھر اپنی زبان کے نشتر سے زخم لگایا اور عاصم نے تحمل سے اسے س
اور زبردستی مسکرایا۔

''نہیں یار! سوچ تو پرانی ہے لیکن شاید میں اپنی سوچ تمہیں اچھی طرح mmunicate
نہیں کر سکا یا پھر تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی کیوں نہ ایک بار اور کوشش کر دیکھیں۔''

سبین خاموش ہی رہی۔

''دیکھو سبین! میں نے شادی کی پہلی رات کھل کر خود ہی تمہیں کومل کے متعلق اس لیے
تھا کہ دوسروں کی زبان سے جو کہانی تم تک پہنچتی۔ وہ حقیقت سے دور ہوتی میں نے تم سے
کہ کومل ایک گزری کہانی ہے ہاں میں اب تک اس کی یاد سے چھٹکارا نہ پا سکا اس لیے میں
کے لیے تیار نہ تھا۔ تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا۔ چلو آؤ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔ تم
محبتوں اور خوب صورتیوں سے میرے دل سے کومل کی یاد مٹا دو۔ تم مجھ پر مہربان ہو جاؤ او
محبت کناں رہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ تمہارا ساتھ نبھاؤں گا صرف تمہارا ہی رہوں گا۔
سے میری سوچ اور محبت کا محور صرف تم ہو گی۔ چاہے یہ سب کرنے کے لیے مجھے بڑی
قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ لیکن تم نے میرے پھیلے ہوئے سوالیہ ہاتھوں کو بے درد
دھتکارا ہے۔ تمہیں سب کچھ سچ بتا دینا کیا میری نیک نیتی کا ثبوت نہ تھا۔ لیکن تم مجھے
اپنے طعنوں اور اپنے رویے سے پیچھے دھکیل رہی ہو تم نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔
میں فون کرتا تم جھگڑنے لگتیں۔

''تم نے میری ہر پیش قدمی کو ٹھکرا دیا جو میں نے تمہارا دل جیتنے کے لیے کی۔ مجھے کس با
کی سزا دے رہی ہو۔ میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے سبین! تمہارے رویے سے میرے اعصاب
ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں یہ اتنی شدید توڑ پھوڑ بلاقصور ہی میرا مقدر کیوں کر دی ہے تم نے۔ میں
تہی دامن تھا تمہارا دامن اتنا بھی دراز نہیں کہ میرے دکھی دل کو ڈھانپ سکے۔''

عاصم نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا۔ سبین نے اپنی جھکی ہوئی
آنکھیں اٹھائیں۔ عاصم کے ہاتھوں میں سگریٹ تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ جب سے
وہ آیا تھا سو نہیں سکا تھا صحیح طرح سے۔ اور یہ اس قدر اسمارٹ اور چارمنگ شخص اس کا تھا۔ عاصم کا
یوں لگا جیسے اس کی نگاہوں میں اس کے لیے جذبوں کا ایک جہان بسا ہے اس کی آنکھیں کہہ رہی
ہوں کہ عاصم چوہدری میرا دامن تمہاری توقع سے زیادہ دراز ہے میں اس میں تمہیں تمہارے وجود
سمیت ہمیشہ کے لیے چھپا کر رکھ سکتی ہوں۔

لیکن پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی شاید وہ سب جو تائی اماں نے اس
سے کہا تھا ایک بار پھر اس نے نظریں اٹھائیں۔

''آپ نے کسی کومل سے محبت کی تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی؟۔ اتنے ہی مجبور تھے آپ تو
مجھ سے کہا ہوتا میں انکار کر دیتی۔''

اس کا لہجہ سرد تھا اور جملے کاٹ دار۔

''لیکن آپ مجبور نہیں تھے حقیقت یہ تھی کہ کومل کا فسانہ عام ہو جانے کی وجہ سے کوئی آپ
سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تارا نے بھی شادی سے انکار کر دیا تھا میں وہ
سب بھی جانتی ہوں جو آپ نے مجھے نہیں بتایا۔ تائی اماں نے شادی سے اگلے روز ہی سب بتا دیا
تھا۔ امریکہ اور یورپ میں آپ کی ڈھیروں فرینڈز ہیں اگر آپ ایک پلے بوائے ہیں تو آپ کو
یورپ میں ہی رہنا چاہیے تھا میری زندگی برباد کرنے کیوں آئے ہیں؟''

''سبین!'' عاصم نے اپنے غصہ پر بمشکل قابو پایا۔

''ایسا نہیں ہے تائی اماں نے جو بھی کچھ تم سے کہا ہے غلط ہے تارا نے مجھ سے شادی سے
انکار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی کیونکہ میں کومل سے شادی کرنا چاہتا تھا اور تم
سے شادی کرنے میں میری مجبوری میرے والدین تھے۔ لیکن جب میں نے سرینڈر کر دیا تو تمام

تر چاہتوں اور پورے خلوص کے ساتھ تمہاری زندگی میں داخل ہوا تھا خدا کے لیے سبین مجھے سمجھ
کوشش کرو۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں میری طرف سے جو میل آ گیا ہے ا
اپنی محبتوں اور وفاداریوں سے دور کر دوں۔ لیکن تم مجھے اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ تو دو مجھے
سمجھ کر اپنی نفرت سے کچھ عرصہ کے لیے ہی سہی آزاد تو کر دو۔ میں تمہیں کسی فیصلہ پر مجبور تو نہیں
رہا لیکن میری فرد جرم کے لیے مجھے صفائی میں کچھ کرنے یا کہنے کا موقع تو دو۔''

عاصم نے سبین کا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں تھامتے ہوئے التجا کی۔ لیکن سبین ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہوئی۔

''اچھا چلو صلح اور اچھے دنوں کی طرف پہلا قدم بڑھائیں خوب صورت لمحات کو تلاش۔''

عاصم نے آخری کوشش کے طور پر اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اس کے چہر۔ جما کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''ملاؤ ہاتھ جو مجھے یاد تھا سب بھول چکا۔ جو تمہیں یاد ہے سب بھول جاؤ۔''

وہ بڑی پر امید نظروں سے ہاتھ بڑھائے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لو تھام لو پگلی! ساری خوب صورتیاں اور خوشیاں تمہاری ملکیت ہو جائیں گی۔''

وہ جیسے سبین کے دل میں جھانک رہا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سبین نے اپنے دل میں ا
والی اس خواہش کو مسل دیا اور وہ بولی تو اس کا لہجہ پہلے جیسا سرد تھا۔

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا عاصم کہ تم کومل کو بھول جاؤ۔ اس لیے کہ اگر واقعی تمہیں کومل سے محبت
تو وہ کبھی دل سے نہیں نکلتی نہ نکالی جا سکتی ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے پہلو میں
کر تم کسی اور عورت کو سوچو۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل کو تمہاری طرف مائل نہیں کر سکی
تائی اماں کی بات تو ممکن ہے وہ غلط ہوں لیکن شیزا اور شمائلہ نے بھی مجھے وہی بتایا ہے جو تائی ا
نے کہا کیا سارا زمانہ جھوٹ بولتا ہے۔''

سبین نے بڑے مستحکم لہجے میں تارا کی کزنوں کا حوالہ بھی دے ڈالا۔

''عاصم چوہدری آپ کو کوئی حق نہ تھا میری زندگی برباد کرنے کا'' اس کی آنکھیں آنسو سے بھر گئیں۔

''یہ ورق آپ اپنی کتاب سے پھاڑ ڈالیں کہ سبین آپ پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر

گی...... نہیں۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ آپ بھی خوش نہیں رہ پائیں گے میں آپ کو بھی برباد کر دوں گی اور خود کو بھی برباد کر لوں گی۔

اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو عاصم نے اٹھ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔

''اس طرح مت جاؤ سبین! جو ہوا اس میں میرا کسی اور کا کوئی دوش نہیں ہے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو مت ٹھکراؤ پلیز سبین! دیکھو تم اس طرح اپنی اور میری دونوں کی زندگیوں سے کھیلو گی''

سبین نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گئی عاصم خفت اور افسردگی کے عالم میں ہلتے پردے کو دیکھتا رہ گیا۔

''اور تائی اماں'' عاصم نے غصے اور بے چارگی سے اپنی مٹھیوں کو کھولا اور بند کیا کاش! آپ یہ آگ نہ لگاتیں تو شاید میری بے قرار زندگی کو بھی سکون مل جاتا۔ زندگی کیوں مجھ سے اتنی ناراض ہے جس خوشی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں کانٹوں والے جھاڑ کی طرح ہاتھ اور روح سب کچھ زخمی کر دیتی ہے۔

عاصم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا باہر شدید سرد رات تھی ہر چیز دھند میں لپٹ رہی تھی صحن کی لاب لائٹ روشن تھی اس کی تھکی تھکی سی روشنی اسے اپنی زندگی کی طرح ہی لگی۔ سبین حسب معمول اپنے بیڈ روم میں بند ہو چکی تھی اس نے ایک نظر اس کے بیڈ روم کے بند دروازے پر ڈالی۔

یہ اماوس کتنی طویل ہے اور نہ جانے ابھی کتنے قرنوں کا کشٹ بھگتنا ہے۔

''واپس کمرے میں جا کر اس نے گرم چادر اور کار کی چابیاں اٹھائیں اور کچھ سوچ کر جمال کو فون کیا۔''

''کیا کل ہو گئی'' جمال نے اس کی آواز سن کر کہا کمال آدمی ہو کچھ بتائے بغیر کل فون کروں کہہ کر فون بند کر دیا خیریت تھی نا میں اور تمہاری بھابھی تب سے پریشان ہو رہے ہیں۔

''بالکل خیریت اور تم مزے کرو بیوی کے ہاتھ کے پکے کھانے کھاؤ سر پر چپی کرواؤ تمہیں الہ دینا مورکھ دنیا سے۔''

جمال ہنس پڑا۔

''یار! ایسا کرو تم بھی آجاؤ۔ بھابھی کو بھی ساتھ لے آؤ ہم کافی پی رہے ہیں کاجو کھا رہے ہیں اور Willis Bruse کی Die herd 2 دیکھنے لگے ہیں۔''

"اکٹھے دیکھتے ہیں آ جاؤ دونوں بیگمات کچھ چغلیاں کرلیں گی اور ہم فلم دیکھیں گے۔"

"یار! تمہاری بھابی تو سو چکیں۔ہاں میں آ رہا ہوں۔"

عاصم نے فون بند کرکے سبین کے بیڈروم کی طرف افسردگی سے دیکھا لائٹ جل ر
لیکن دروازہ لاک تھا وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"نیچے لاؤنج میں داخل ہوا تو مما فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ریسیور رکھ کر انہو
حیرانی سے عاصم کی طرف دیکھا۔"

"یہ چادر لپیٹ کر اتنی رات گئے کہاں جا رہے ہو؟"

"مما! جمال کے ہاں جا رہا ہوں ایک گھنٹے تک آ جاؤں گا۔" عاصم کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا

"بیٹا!" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں عاصم کا چہرہ لے کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"میں جانتی ہوں۔تم پریشان ہو تم اور سبین اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہو میں سوچ ر
شاید خود ہی حالات بدل جائیں لیکن۔"

ماں کا دل بیٹے کے اندر تک جھانک آیا تھا۔

"میں بات کرتی ہوں سبین سے تم جلدی آ جانا۔"

"نہیں مما! اس کا کوئی فائدہ نہیں میں ہر کوشش کر چکا ہوں۔وہ کسی بھی طرح کسی
کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے۔آپ کو میری شادی کی جلدی تھی میں نے کہا تھا۔کہ یہ بیل
نہیں چڑھے گی بہرحال آپ پریشان نہ ہوں آرام کریں جا کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

عاصم نے محبت سے ماں کے ہاتھ تھپتھپائے۔وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا
روگ تھا سبین نے آج اسے بہت مایوس کیا تھا لیکن پھر بھی دل میں اندر کہیں کسی بہتری
موجود تھی۔

"فائدہ کیوں نہیں ہے بیٹا! تمہاری شادی کی ہے ہم نے عذاب تو مول لے کر نہیں
کون سا طریقہ ہے گھریلو زندگی کرنے کا۔کیسے پریشان نہ ہوں۔"

"مما پلیز۔"

"عاصم!" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جمال کی طرف جاؤ لیکن گھنٹہ بھر سے زیادہ مت ٹھہرنا اور ہاں جمال کی طرف

ہوئے سنگتروں کا ٹوکرا بھی لے جانا۔تمہارے پپا آج باغ سے لائے ہیں۔"

"پپا آ گئے؟" عاصم نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں لیکن وہ سو رہے ہیں۔اب صبح ہی ملنا۔"

انہوں نے سرفراز کو آواز دی تاکہ وہ سنگتروں کا ٹوکرا گاڑی میں رکھوا دے جمال عاصم کا دوست تھا لیکن مما اسے اور اس کی بیوی کو اپنے بچوں کی طرح ہی چاہتی تھیں اور ان کے بچے مما کو دادی جان کہتے تھے اس کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی تھی اور وہ ہمیشہ ہر موقع پر اسے یاد رکھتی تھیں۔

"میری مما کا دل کتنا کشادہ اور خوب صورت ہے۔"

عاصم نے عقیدت اور محبت سے ان کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! انسان صرف ایک چیز دنیا میں ہر ایک کو دے سکتا ہے اور وہ ہے محبت اور اپنا پن اس میں کبھی کمی نہیں ہوتی یہ ہمیشہ بڑھتی ہے اور اس سے افضل کوئی عبادت نہیں۔" مما نے شاید اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔اب تم جاؤ لیکن جلدی آنا۔

مما سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

عاصم لحہ بھر وہیں کھڑا رہا اس کی آنکھیں مما کے دل کی ان بے پایاں وسعتوں پر نم ہو گئی تھیں اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتا وہ گیٹ کی طرف بڑھا مگر پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔

"پتا نہیں مما سبین سے کیا بات کریں گی اور سبین کس طرح مما کو ڈیل کرے گی نہیں جو کچھ ن دونوں کے درمیان ہے وہ ان ہی کے درمیان رہنا چاہیے وہ بعد میں مما کو بلالے گا کہ سب ٹھیک ہو گیا اور سبین وہ یقیناً مما کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گی اور وہ پہلے ہی اپ سیٹ ہے وہ مرد ہو کر اعصابی شکستگی کا شکار ہو رہا ہے تھا تو وہ تو پھر ایک عورت تھی نازک اور کومل۔"

اور آج تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جب وہ اپنے بیڈروم میں جا رہی تھی مجھے اس وقت ہی ہونا چاہیے سبین کے پاس کہیں جھگڑا بڑھ نہ جائے۔

میرا دل ہے سیپ سمندر
میں قطرہ قطرہ برسوں
تیرے پیار کو پھر بھی ترسوں

میرا دل ہے سیپ سمندر

اپنا پسندیدہ گیت گنگناتا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔سبین نے اس کی گنگناہٹ سنی کمرے سے باہر نکل آئی اور لاؤنج میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

"عاصم! جلدی آیئے مما آئی ہیں۔" اس کی آواز میں ہلکی لرزش تھی۔

عاصم نے ایک نظر اسے دیکھا وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

"اچھا مما آئی ہیں۔"

عاصم نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور اندر سبین کے بیڈروم میں داخل ہو گیا مما ابھی کھڑی تھیں۔

"مما! آپ بیٹھیں پلیز کھڑی کیوں ہیں۔"

اور پھر اس نے دروازے کے قریب جا کر کہا۔

"سبین! میرے اور مما کے لیے اچھی سی کافی لے آؤ۔"

اور اپنے بیڈروم کے دروازے کے باہر کھڑی سبین جی اچھا" کہہ کر فوراً ہی ڈائننگ طرف بڑھ گئی۔"

"بیٹا! تم تو جمال کی طرف جا رہے تھے؟" مما نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ مما! دراصل جمال نے موبائل پر بتایا کہ وہ کہیں باہر جا رہے ہیں دونوں اکثر ہا کے لیے چلے جاتے ہیں مجھے بھی اصرار کر کے بلا رہے تھے لیکن میں نے مناسب نہیں سمج واپس آ گیا۔"

بات مکمل کر کے اس نے سبین کی طرف دیکھا جو ٹرالی میں کافی اور دوسرے لوازما لے آئی تھی۔وہ ابھی بھی گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھی۔

"بیٹا! میں تو اس وقت کافی نہیں پیوں گی۔"

"وہ مما! آپ کے لیے دودھ میں اوولٹین ڈال کر لائی ہوں کافی تو ہم دونوں پئیں۔"

تب ہی عاصم کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی جو سبین کے بیڈ سائیڈ دراز میں رکھا ہوا تھ رات کو اپنے گھر بات چیت کرنے کے لیے موبائل اپنے پاس رکھ لیتی تھی فون پر گفتگو کر یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی اور ایکسٹینشن پر سن نہ لے۔

مما نے دراز کھول کر موبائل نکالا اور آن کر کے ہیلو کہا دوسری طرف جمال تھا۔جس کا خیال تھا کہ عاصم راستے میں ہوگا اس لیے اس نے موبائل پر کال کیا تھا کہ اتنی دیر کیوں لگا دی۔

"بیٹا! عاصم تمہاری طرف نہیں آ سکا سبین کو اور اسے کہیں جانا پڑ گیا ہے اب وہ صبح آئے گا"

موبائل آف کر کے انہوں نے عاصم کی طرف دیکھا تو عاصم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

بیٹا باہر جاؤ تو موبائل ساتھ لے جایا کرو مما کے ہونٹوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"جی مما!" عاصم نے آہستگی سے کہا اور سبین کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری وہ سٹپٹا گئی۔

"تم کافی پیو دونوں میں چلتی ہوں لیکن جانے سے پہلے میں تم دونوں کو نصیحت کرنا چاہتی ہوں سبین؟" انہوں نے سبین کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! تم ہرگز بارگاہ خداوندی میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکو گی۔اگر تمہارا شوہر تم سے خوش نہ ہوا اور تم عاصم بدلہ لینے والے سے معاف کر دینے والا زیادہ معتبر اور بڑا ہوتا ہے۔اور زندگی خدا تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے جسے کما حقہ ادا کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو بندہ خدا کا مجرم ہوتا ہے میاں بیوی کے درمیان جو لطف وانس ہوتا ہے تم دونوں ابھی اس سے آگاہ نہیں ہو لیکن سبین بیٹا! عاصم نے تمہارے لیے جھوٹ بولا مجھے اچھا لگا۔یہ وہ انس اور لگاؤ ہے جس کے لیے اسے جھوٹ بولنا پڑا میں ناراض تھی لیکن میری ناراضگی ختم ہو گئی۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے لیے کہا ہے کہ وہ تمہارا اور تم اس کا لباس ہو اسے سمجھو اور زندگی کے وہ دن جو سب سے خوبصورت ہیں انہیں ضائع کرو گے تو بڑھاپا ایک پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن پھر جاتے جاتے رکیں۔

"گھر میں سناٹا سا رہتا ہے کوئی شور شرابا ہلچل ہو تو ہمارا بڑھاپا بھی بہل جائے۔"

"مما! سوری میں نے جھوٹ بولا۔عاصم ان کے ساتھ ہی باہر نکلا اور سیڑھیوں تک انہیں چھوڑنے آیا۔"

مما ہنس پڑیں شادی شدہ زندگی میں مرد بہت زیادہ جھوٹ بولا کرتے ہیں ابھی تو ابتدا ہے۔

عاصم بھی کھسیانا سا ہو کر مسکرانے لگا مما کو چھوڑ کر واپس پلٹا تو سبین اپنے بیڈروم میں بند ہو کر دروازہ لاک کر چکی تھی۔تھوڑی دیر وہ اس کے بیڈروم کے باہر کھڑا رہا کئی بار دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر نیچے کر لیا۔

سین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میری باتوں کا اثر نہیں ہوا تھا تو مما کے کہے کا ہی بھرم ر
وہ غصے میں جلتا ہوا اپنے بیڈروم میں چلا گیا اور نیند کی ٹیبلٹ لے کر سونے کی کوشش
لگا مگر جب تک نیند نہ آئی بار بار اس کا دھیان سین کی طرف چلا جاتا شاید وہ منتظر ہو۔
شاید اس نے اسے سوچا ہو اور اس کی ایک ہی دستک پر...... اور یونہی سوچتے سوچ
صبح اٹھا تو سین ابھی تک سو رہی تھی اسے ضروری کام سے اسلام آباد جانا تھا وہ عارفہ کو بتا
اس نے سین کو نہیں جگایا۔

"جانے رات کب سوئی ہوگی۔"

"آپ کے حوصلے بھی دیکھتے ہیں سین بیگم کب تک۔" وہ مسکرایا اور عارفہ سے
کرتا اسلام آباد کے لیے نکل کھڑا ہوا اس کی عدم موجودگی میں تایا تائی تینوں چچا اور چچیار
کے والدین ان کے گھر میں جمع ہوئے جس کے متعلق تفصیل اسے بعد میں پتا چلی۔

سین نے صبح ہوتے ہی فون کر کے اپنی والدہ کو عاصم کے ساتھ اور مما کے ساتھ
گفتگو بتادی تھی۔ نتیجتاً وہ سب یہاں موجود تھے۔ تایا نے جائداد کے بٹوارے کے سلس
کا آغاز کیا سفیر احمد نہیں چاہتے تھے کہ جائداد تقسیم ہو اور وہ عہد جو انہوں نے اپنے وال
ٹوٹ جائے لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ سب کی شدید خواہش ہے اور جائداد تقسیم نہ
جھگڑے بڑھنے کا امکان ہے سو انہوں نے مما کے کہنے پر جائداد کی تقسیم کا فیصلہ کرلیا۔

"ٹھیک ہے اگر سب کا یہی خیال ہے تو۔"

"جائداد تو خیر تقسیم ہو جائے گی لیکن میری بچی میں کیا خرابی تھی جو عاصم کے
انکار کر دیا تھا؟"

تائی اماں کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

"آپا! جوان اولاد کی مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں کیا جاسکتا۔"

"مرضی تو خیر سنا ہے سین کے ساتھ بھی نہیں تھی کومل تھی کوئی لڑکی جہاں وہ شادی
بے چاری سین پر ترس آتا ہے۔ اس کا مستقبل کیا ہوگا عاصم جیسا شخص تو ایک پرقاعدہ
کومل کے ہاں سے انکار ہوا تارا نے بھی انکار کر دیا آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے
دیس میں گھومتا پھرتا ہے وہاں بھی اس کے بہت ساری عورتوں کے ساتھ دوستانے ہ

کو کون اپنی بیٹی بیاہ سکتا ہے۔ ہماری تو قسمت اچھی تھی لیکن بے چاری سین۔"

"بس کیجیے آپا؟" مما لرزنے لگیں۔ "عاصم کو میں آپ سے بہتر جانتی ہوں وہ میرا بیٹا ہے
اس جیسا لڑکا پورے خاندان میں نہیں رہی کومل تو کسی لڑکی سے شادی کی خواہش کرنا کوئی جرم نہیں
اور اس طرح کی باتیں آپ کو سین کے سامنے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھیں۔"

سین روتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس کی والدہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی
گئیں تو سین کے والد واجد حسین نے کہا۔

"جائداد کا معاملہ تو بنٹ گیا اب ذرا میرا بیٹی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"آپ کی بیٹی کا کیا مسئلہ ہے اور کس بیٹی کا۔" سفیر احمد کو حیرت ہوئی۔

"سین کا اور کس کا۔" تائی اماں نے واجد حسین کے بجائے جواب دیا۔

"آپا! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" سفیر احمد کو ابھی تک حیرت تھی۔

"آپ بچے تو نہیں ہیں کہ یہاں اتنے لوگوں میں بات دہرائی جائے۔" واجد حسین غصے
سے بولے دونوں کے درمیان ایک سال سے جھگڑے چل رہے ہیں اور آپ بے خبر ہیں عاصم
پہلے تو امریکہ چلا گیا اور فون پر بھی جھگڑے اور اب آیا ہے تو تب بھی ایک دن بھی نہیں بنی دونوں
میں بھائی صاحب! شادی کے وقت آپ نے ہمیں عاصم کے معاشقوں کے متعلق نہیں بتایا جب
کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابھی بھی وہ یہی کچھ کرتا رہتا ہے اسے بیوی کی بالکل پروا نہیں ہے سین کا
مستقبل محفوظ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ آپ عاصم کے حصے کی جائداد سین کے نام کر دیں۔

سفیر احمد نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم جانتے ہو واجد حسین! تم کیا کہہ رہے ہو بچوں کے درمیان اگر کوئی معمولی تو تو میں میں
ہوئی ہے تو تم نے سین کا مستقبل ہی غیر محفوظ کر دیا۔ میں اور عاصم کی والدہ سین کو بیٹیوں کی طرح
سمجھتے ہیں چاہتے ہیں۔"

"میں بیٹی کا باپ ہوں سفیر احمد! کیا گارنٹی ہے کہ کل عاصم کی زندگی میں کوئی اور عورت آ گئی
تو" سین کی والدہ جو اسی اثناء میں اوپر سے آ چکی تھیں روتے ہوئے بولیں۔

"براہ کرم آپ ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"بہن! میں نے تو کبھی دونوں کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا معمولی رنجش تو ہو ہی جاتی ہے

پھر اگر میں آپ کی بات کو سچ بھی سمجھ لوں تو کیا جائداد سبین کے نام کرنے سے اس کا مستقبل
ہو جائے گا۔ اگر گھر بسنے ہوں تو واجد حسین جائداد کے بغیر بھی بس جاتے ہیں اور اگر نہیں
جائداد کے ساتھ بھی نہیں بستے۔"

"پھر بھی۔" تائی اماں نے ان کا ساتھ دیا۔ جائداد سبین کے نام ہو جائے تو عاصم سبین
نے یا دوسری شادی کا نہیں سوچے گا اور اگر اس نے ایسا کر بھی لیا تو سبین اپنے بچوں کی پر
سکے گی۔ تائی اماں کے بولتے ہی چچیاں بھی ان کی حمایت میں بولنے لگیں۔

تو یہ سب اجتماع اس لیے تھا مما جو سبین کے والدہ اور والد کی سب کے ساتھ آمد پ
تھیں ساری حقیقت جان گئیں۔

"یہ عاصم اور اس کی بیوی کا معاملہ ہے وہ اسلام آباد سے کل آ جائے گا تو اس
جائداد ہمیں اولاد کی خوشیوں سے زیادہ پیاری نہیں ہے لیکن ایک بات آپ بھی سن لیں آپ
انہوں نے تائی اماں کو تنبیہہ کی۔

"سبین ہماری بہو ہماری بیٹی اور ہماری عزت ہے عاصم اسے کبھی نہیں چھوڑے گا
جو چاہتی ہیں وہ کبھی نہیں ہو سکتا میرے گھر کی اگر ایک ایک اینٹ بھی بک جائے تو
عاصم کا گھر برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

ان کا ضبط جواب دے گیا تھا تائی اماں غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں
کے اپنے اپنے ٹھکانوں پر جانے کے بعد وہ اوپر فرسٹ فلور پر آئیں۔ تا کہ سبین کو دلا
اور سمجھائیں یقیناً تائی اماں کی باتوں نے اسے مزید بھڑکا دیا ہوگا لیکن سبین نے ان کے
ازہ کھٹکھٹانے کے باوجود نہیں کھولا تو وہ افسردہ سی نیچے آ گئیں۔ جانے ان کے گھر کو کس
گئی تھیں۔

☆☆☆

اگلا دن بہت مصروف تھا سفیر احمد سارا دن اپنے بھائیوں کے ساتھ تحصیل اور
مصروف رہے اور یوں کچھ حد تک جائداد کی تقسیم کا کام ہو گیا فیکٹریوں وغیرہ کی تقسیم
کی فروخت کے بعد ہونا تھی۔ شام کو سب خوشگوار موڈ میں چائے پی رہے تھے کہ عاصم
سے واپس آیا اور گھر میں یہ گیدرنگ دیکھ کر حیران ہوا اور سب سے سلام دعا کے بعد

کے اوپر چلا گیا۔ کینیڈین ایمبیسی میں کچھ کاغذات جمع کروانے تھے مختلف دفتروں میں چکر لگا لگا کر
تھک چکا تھا۔ غسل کر کے چائے کا کپ بنایا۔ اور ابھی کپ لے کر اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ
ملازم نے آ کر بتایا کہ سفیر احمد اسے بلا رہے ہیں۔

"یقیناً کوئی جدید فساد ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔"
اس نے سوچا اور چائے کا کپ یونہی ہاتھ میں پکڑے پکڑے نیچے آ گیا۔

"جی پپا۔" وہ ان کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"بیٹا! میں جانتا ہوں تم سفر سے آئے ہو اور یقیناً تھکے ہوئے بھی ہو گے لیکن ایک اہم مسئلے
میں تمہاری رائے درکار ہے۔"

پھر وہ عاصم کی مما کی طرف مڑے۔

"تم بتا دو عاصم کو سب۔"

"میں۔" مما نے ان کی طرف دیکھا۔ "آپ ہر مشکل کام مجھ پر کیوں ڈال دیتے ہیں۔"
انہوں نے شکوہ کیا تو زرتاشی نے عاصم کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے عاصم بھائی کہ سبین کے والدین اس کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے آپ کے
حصے کی جائداد اس کے نام کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرے خدا زرتاشی! ذرا آرام سے صبر سے بات کرنے دیتیں۔" مما نے پریشانی سے
پہلے عاصم کو اور پھر زرتاشی کو دیکھا۔

"مما! ہیر پھیر کی کیا ضرورت ہے آگے پیچھے بات تو کرنا ہی ہے کیا ہوا ہے سبین کے مستقبل
کو۔" عاصم یکدم بھڑک اٹھا۔ "اور یہ بات آپ لوگوں کو کس نے سمجھا دی ہے کہ جائداد سبین کے
نام لکھ دینے سے اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا میں نے اسے آج تک کانٹے جتنی تکلیف بھی
نہیں ہونے دی۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض نہیں ایمان سمجھا ہے۔"

"اللہ! عاصم بھائی! یہ بات آپ محمود کو بھی سمجھا دیں نا وہ ہماری ہر خواہش ایمان سمجھ کر نہیں
ار سمجھ کر ہی پوری کر دیا کریں۔"

زرتاشی نے شرارت سے عاصم کی طرف دیکھا تو عارفہ بھی شوخ ہو گئی۔

"اور وہ جو آپ رین بو گولڈ کا لاکٹ لائے ہیں سبین کے لیے وہ اس کی خواہش تھی یا آپ

کے ایمان کی پختگی۔“

سب ہنس پڑے یوں ماحول میں جو ایک تناؤ سا تھا کچھ کم ہو گیا۔

”بلیو چپ کرو۔“ عاصم نے مصنوعی غصے سے ان کی طرف دیکھا۔ جو ہنس رہی تھیں حسین جو بے حد سنجیدہ بیٹھے تھے انہوں نے عاصم کی طرف دیکھا۔

”میاں عاصم! آج اس بات کا فیصلہ ہو جائے کہ تم سبین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو یا ہی یورپ گھوم پھر کر عمر گزار دو گے وہ کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے کہ کھونٹے سے باندھ دیا او ڈال دیا بیوی ہے تمہاری اور جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں وہ اتنی غیر مطمئن کر دینے والی ہیں چاہتے ہیں کہ تم اپنے حصے کی جائداد سبین کے نام کر دو تا کہ کل کلاں۔“

”کل کلاں؟ کیا ہو گا کل کلاں؟“ عاصم نے ان کی بات کاٹ دی۔

”آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں میں نے کچھ ایسا نہیں کیا جس پر اپنے یا کسی کے شرمندگی ہو۔ سبین کو میں نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے یہ یقین دلانے کی کوشش کی دونوں کے درمیان کوئی دیوار کوئی حد فاصل یا کوئی دوسری عورت کبھی نہیں آئے گی نہ آ میں نے ہر طرح سے اس کے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی ہے اس کا پرابلم اس کے وہم ہیں تو اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اور کچھ لوگوں کے پیدا کردہ لیکن نہ تو وہ میری بات مانے اسے میری پرواہ ہے۔ میں دو دن بعد گھر آیا ہوں اپنے کپڑے خود نکالے ہیں چائے میں خ لایا ہوں۔ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے آج کی بات نہیں ہے صرف اسے اگر مجھ پر یقین نہیں میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے مستقبل کے بارے میں کسی چیز کا خطرہ ہے یہ اس ہے میرا نہیں پپا!“ اس کی آواز میں غصے کی لپک تھی سبین کے نام جائداد لکھنا یا نہ لکھنا مرضی ہے اس سلسلے میں، میں آپ کو dictate نہیں کر سکتا نہ میری ایسی کوئی ضرورت۔ خواہش بہتر ہے کہ اس بات کو یہاں ہی ختم کر دیا جائے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹا! کہاں چل دیئے بات تو پوری کر لو اور ہمیں کس نتیجے پر پہنچا دو۔“ مما نے اسے

”مما! بہتر یہ ہے کہ مجھے اور سبین کو اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جا۔ افراد کی دخل اندازی سے مسائل حل ہونے کے بجائے مزید الجھ رہے ہیں۔“

وہ حتمی بات کہہ کر مڑا تو سبین کی والدہ رونے لگیں۔

”میری بچی کی تو قسمت ہی خراب ہے۔“

”قسمت نہیں دماغ خراب ہے۔“ عاصم بھڑک گیا جانے یہ لوگ اس بات پر واویلا کیوں کر رہے تھے جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

”دماغ اس کا نہیں تمہارا خراب ہے۔“ واجد حسین تلملا اٹھے۔

”تم بیوی کے حقوق ادا کرنے کے بجائے فرار حاصل کر رہے ہو جب سے ہم نے اس کی شادی کی ہے پریشان ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”میں آپ کی پریشانی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہوں۔“

عاصم آگ بگولہ ہو گیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

سبین اس کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی عاصم نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑی اور جھٹکے سے اسے اٹھایا۔

”جوتا پہنو اور میرے ساتھ چلو اپنے والدین کے پاس۔“

نیچے سفیر احمد یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”واجد حسین! تم نے اس شخص کو شدید ناراض کر دیا ہے جو ناراضگی کے معنی تک نہیں جانتا تھا ب وہ کیا کرے گا تم جانو یا وہ میں صورت حال سنبھالنے کے قابل نہیں۔“

”آپ کہاں چل دیے؟“ مما نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

”جوان خون ہے کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھا تو اپنی زندگی بھی برباد کرے گا اور ہمارا بڑھاپا ی رسوا ہو گا او پر چل کر اسے سمجھائیں۔“

”کل سے اس کے کردار پر حملے کیے جا رہے ہیں اب تم یہ چاہتی ہو کہ وہ میرے سامنے کھڑا کر میری بات ماننے سے انکار کر دے میں یہ بے عزتی کیوں جھیلوں۔“

سفیر احمد ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے مما پریشان سی بیٹھی تھیں کہ عاصم سبین کو کلائی سے ے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

”چچا جان! یہ رہی آپ کی پریشانی اسے ساتھ ہی لے جایئے اور قصہ ختم کیجئے۔“

”عاصم بیٹا!“ تائی اماں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے تو عاصم غرایا۔

”سب لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرے معاملات میں۔ اگر کسی نے مداخلت کی تو کاٹ کر

پھینک دوں گا۔"

"عاصم پر جنون ساطاری ہو گیا تھا اس کے کردار پر پے در پے حملے کیے گئے۔ لیکن وہ سے برداشت کرتا رہا لیکن یہ کہنا کہ وہ بیوی کے حقوق ادا کرنے سے فرار حاصل کر رہا ہے ا جیسے کسی نے اسے بہت غلیظ گالی دے دی ہو یا بھرے بازار میں اس پر کیچڑ پھینک دی ہو۔

سب یکدم خاموش ہو گئے تھے صرف سبین کی ہچکیاں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں ع ایک قہر بھری نظر اس پر ڈالتا اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا عارفہ نے اسے یوں سرخ آنکھوں ساتھ اوپر جاتے دیکھا تو شہلا آنٹی کو فون کر دیا وہ جانتی تھی کہ عاصم کی اپنی اس خالہ کے ساتھ دوستی ہے اور وہ ہی اب صورت حال کو سنبھال سکتی ہیں۔

ساری بات سن کر شہلا آنٹی نے کہا کہ وہ آ رہی ہیں ادھر واجد حسین عجیب مشکل میں گئے تھے اگر بیٹی کو ساتھ نہ لے جاتے تو بے عزتی اور سبکی تھی لے جاتے تو اس کا گھر تباہ ہوتا ان کی پریشانی محسوس کی۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں اس کا غصہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے ابھی موڈ ٹھیک ہو گا نیچے آ جائے گا۔"

سبین یکدم روتے روتے اٹھی اور اوپر چل دی۔ شاید کوئی چھپا ہوا عزم کوئی انا کی بھاؤ عاصم بالکونی سے باہر جھانکتے ہوئے کارڈلیس پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس کی بھاری اور شکستہ تھی اور وہ امریکہ کے لیے سیٹ کنفرم کروا رہا تھا۔ سیاہ پتلون اور سفید شرٹ جس بازو اوپر کو مڑے ہوئے تھے اور سب بٹن کھلے تھے وہ ننگے پاؤں کھڑا تھا۔

بات ختم کر کے وہ مڑا تو سبین نے دیکھا اس کی آنکھیں نم اور سرخ تھیں آنکھوں سیاہ حلقے واضح تھے۔ بال بکھرے سے تھے اور رنگت جیسے جھلس سی گئی تھی اس کے دائیں ہا سگریٹ سلگ رہا تھا ایک لحہ کو سبین کی نظریں اس کی نظروں سے الجھیں اور پھر وہ بیڈ کے اپنا اٹیچی نکال کر اس میں سامان رکھنے لگی۔ عاصم دیکھ رہا تھا کہ اس نے صرف وہی کپڑے جو اس نے خود بنوائے تھے عاصم اس کے لیے بے شمار کپڑے لاتا رہتا تھا لیکن اس نے وہ ک پہنے حالانکہ اس کی ناراضیوں کے باوجود کتنی بار عاصم نے اس سے کہا تھا۔

"لگا ہے سب رنگ اور ڈریسز تمہارے لیے ہی بنے ہیں سبین! تم جب بھی کوئی رنگ

تن کرتی ہو موسم بدل دیتی ہو۔"

عاصم دیوار سے ٹیک لگائے اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا اس نے اپنے جہیز کی جیولری رکھی اور پھر مڑ کر عاصم کی بیڈ سائیڈ سے چابیاں نکالیں اور اس کی الماری کے والٹ سے ڈائمنڈ ہارٹ کا وہ لاکٹ نکالا جو عاصم نے پہلی رات اسے دیا تھا اور مٹھی میں بھینچ لیا اس کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں اور وہ شدت گریہ سے کانپ رہی تھی ایک بار وہ فرش پر پھسل کر گر پڑی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خود عاصم کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"شہزادی! اپنا درد مجھے دے دو۔ کچھ ایسا کرو کہ تمہاری ساری تکالیف میری روح میں اتر آئیں کاش! میں تمہیں کبھی روتے نہ دیکھوں تم ہمیشہ ہنستی رہو۔"

پھر اس نے اس کے گال کے ننھے سے تل کو انگلی سے چھوا تھا۔

نجال ہندوش بخشم۔ سمر قند و بخارا را اور وہ جذبات کی ان امڈتی گھٹاؤں سے بچ کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی تھی اور وہ ہمیشہ ہی ایسا کرتی تھی وہ ذرا بھی جذباتی ہونے لگتا تو وہ ادھر ادھر ہو جاتی شاید وہ پگھلنے سے ڈرتی تھی عاصم جانتا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا جاتی ہے ایک دن ......ایک دن تم ضرور ہار جاؤ گی۔ وہ مسکرا دیتا آخر کب تک لڑو گی خود سے مجھ سے۔

وہ خاموش کھڑا اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے لگا جیسے سبین کی نظریں اس سے کہہ رہی ہوں۔

"تم مجھے روک کیوں نہیں لیتے عاصم۔ کیا میرے سمر قند و بخارا میں اب بہاریں نہیں اترتیں میرے گال کا تل اپنی آب و تاب کھو بیٹھا ہے۔"

اسے لگا جیسے سبین کہہ رہی ہو۔

"مت دیکھو ایسے مجھے تم میرے ارادے ڈھا دیتے ہو اور میری فصیل دل میں نقب زنی کر رہے ہو۔"

یکا یک سبین نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف مڑی عاصم کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا ڈریسنگ ٹیبل پر سبین کا سامان سجا تھا اس کا میک اپ اس کی لری وہ چونکا سبین اس کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ پر لیٹی تھی اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کا سامان سجا تھا تو کیا؟ تو کیا؟ آج شب روشنی بن کے کوئی دل میں اترنے کو تھا۔

کیا آج ہی وہ رات تھی جس کا وہ ایک سال سے منتظر تھا۔ وہ ارمانوں بھرا دن جس
ایک سال کے ہر دن میں اس نے اسے خط لکھے تھے اور فون کیے تھے کیا آج خوشیاں بن
اس کے آنگن میں اترنے والی تھیں۔ اس نے غور ہی نہیں کیا کہ سبین اس کے بیڈ پر لیٹی تھی
بے اختیار سبین کی طرف بڑھا۔

”کیا تم واقعی جا رہی ہو سبین؟“ سبین نے چونک کر اسے دیکھا۔

”مت جاؤ جو ہوا اچھا نہیں ہوا مجھے بہت افسوس ہے میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا تھ
نے کبھی ایسا نہیں چاہا میں تم سے اتنا مخلص اور اٹیچ ہوں کہ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے گالی دی
نے کبھی تمہارے حقوق غصب کرنے کے متعلق نہیں سوچا دیکھو۔ تم مت جاؤ میں تمہیں ر
ہوں۔“

سبین کے آنسو اور سسکیاں تیز ہو گئیں۔ لیکن وہ نگاہیں جھکائے پیک کرتی رہی و
طرف نہیں دیکھ رہی تھی شاید وہ جانتی تھی کہ اس نے عاصم کی طرف دیکھا تو اس کے اراد
جائیں گے وہ حسن کی تعریف کرنا اور دل کو مسخر کرنا جانتا تھا۔

وہ جانتی تھی اس روز سے جب اس کا نکاح ہوا تھا کہ وہ ایسا جادوگر ہے جس
نہیں وہ ڈیڑھ سال سے خود سے جنگ کرتے کرتے نڈھال ہو رہی تھی اور جب سے ا
لمحے اسے لگتا جیسے وہ اس کے جادو کے سامنے ہار جائے گی خدا کے لیے عاصم کچھ مت ک
مجھے اس نے سر اٹھایا۔

آنکھوں سے آنسو رواں تھے کاجل پھیل گیا تھا زلفیں بکھری سی گئی تھیں آنکھیں اور
رونے سے متورم ہو رہا تھا عاصم کے دل پر چوٹ سی پڑی۔

یہ نازک اور کومل لڑکی جس کے چہرے کی صبح میں ملاحت کی شبنم ہے یہ سرو قد ا
بدن چھریرا ہے اور آنکھیں بھنورا سی اس کی ہنسی کتنی ترنم خیز ہے اور اس کی چال میں صبا
بدن کے لوچ میں انگڑائی کا نقش۔ اس کی موجودگی تو میں ہزاروں میل دور رہ کر بھی محـ
ہوں یہ میں نے کیا کر دیا غصہ میں آ کر خود اپنا ہی گریبان چاک کر بیٹھا ہوں ریشم ا
سنگریزوں کے دریا میں ڈبو دیا اپنے ہی روز و شب کو خود اپنے ہاتھوں منقطع کر دیا۔

وہ بے شک اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے لیکن وہ اس کی بیوی تھی باوجود ا

جھگڑنے کے عاصم نے کبھی سخت لہجہ میں اس سے بات نہ کی تھی عاصم نے کبھی بے وقت اس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو جائے اور بڑے تحمل سے اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس کا حق اتنا تسلیم کرتا تھا کہ وہ چاہے تو اس کی جان لے لے وہ سمجھتا تھا کہ اس کی باتیں اس کی سرگوشیاں اس کا چلبلا پن اور بے قراریاں ایک روز سبین کا غصہ اور ناراضگی ختم کر دیں گی لیکن وہ جا رہی تھی اور اس کی مہک کے بغیر میں تو مرجھا کر بکھر جاؤں گا۔

وہ تو کب سے اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا لیکن وہ ابھی تک بے خبر تھی۔ کومل تو ایک لمحہ خواب تھا اور وہ حقیقت جانے کب وہ دل کے تخت پر تخت نشین ہو چکی تھی۔ اپنی مسند سنبھالے اس کے دل میں براجمان ہر لمحہ مسکراتی رہتی۔

”دیکھو رک جاؤ سبین! میں واش روم میں جا رہا ہوں۔ تم نیچے چلو میں آ کر تمہارے والدین سے معذرت کر لیتا ہوں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں سبین میری جان ہے میرے روز و شب کی مالکہ اسے مت لے کر جائیں سبین! میں وعدہ کرتا ہوں کہ جتنی درشتی سے تمہیں جانے کو کہا ہے اس سے زیادہ احترام سے تمہیں روک لوں گا میں دروازے میں کھڑا ہو جاؤں گا تمہارا راستہ روک کر تم لد میں مجھ سے بدلہ لے لینا جتنا جی چاہے جھگڑ لینا لیکن ابھی مت جاؤ سبین تمہارے بغیر میں بکھر ہاؤں گا میرا یقین کرو میں سرتاپا تمہارا ہوں اس روز سے جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو۔“

اس نے یکدم آگے بڑھ کر سبین کو بازو سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میری بات سن رہی ہو نا سبین!۔ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔“

چاندی تو شاید کب سے بکھرنے کو تھی لہریں ساحل کو رواں تھیں وہ تو مٹی ہوتے ارادے اور دل کے ساتھ بند ہوتی آنکھوں سے ٹھنڈک کی طرح اترتی باتوں کی شبنم میں بھیگ چکی تھی، عاصم نے اس کا بازو ہلکا سا کھینچا اور وہ اس کے سینے سے آ لگی۔ برسوں کی پیاسی دھرتی اب ہو رہی تھی محبت ایک انہونی کا نام ہے شاید اور وہ انہونی ہو چکی تھی عاصم نے مسکرا کر اسے ارمی سے اس کے لبوں کو چھوا۔

”اوکے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

اور سبین وہیں کارپٹ پر کھلے اٹیچی کیس کے پاس مدہوش سی بیٹھ گئی سبین کو اوپر آئے کافی دیر

ہو چکی تھی سبین کی والدہ تائی اماں کے اکسانے پر کہ سبین نے اتنی دیر کیوں کر دی گھبرا کر اوپر آ
تو عارفہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

"بھابی!" عارفہ نے کمرے میں آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا

"ہاں؟" اس نے نیم غنودہ سی کیفیت میں کہا۔ الجھے بال سرخ آنکھیں بھاری پپوٹے۔

"ہائے میری بچی!" سبین کی والدہ نے واویلا کیا۔

"عارفہ! پانی لاؤ کہیں میری بچی نے کچھ کھا تو نہیں لیا۔"

عارفہ بھاگ کر پانی لائی اور سبین کے ہونٹوں سے گلاس لگا دیا جسے سبین نے پی لیا او
عارفہ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

"چلو میری بچی! نیچے چلو۔" عاصم واش روم سے سن رہا تھا۔

"آخر سبین بولتی کیوں نہیں۔ شاید وہ عالم خواب میں تھی کسی انہونی کے نشے نے ا
ل بلب کر دیا تھا عاصم واش روم سے باہر نکلا تو سبین نیچے جا چکی تھی اور نیچے شور مچا تھا۔"

"ڈاکٹر کو بلاؤ ڈاکٹر کو بچی نے کچھ کھا لیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کھایا میں ٹھیک ہوں چھوڑو مجھے کیا مذاق ہے۔"

سبین آہستہ آہستہ احتجاج کر رہی تھی لیکن اسے زبردستی صوفے پر لٹا دیا گیا تب
انٹی نیچے لاؤنج میں داخل ہوئیں اور انہوں نے گھبرا کر فوراً اسے چیک کیا۔

"کچھ نہیں ہے صرف جذباتی دباؤ اور ٹینشن ہے چند گھنٹوں میں نارمل ہو جائے گی۔

"شکر ہے میں نے تو سمجھا تھا بچی نے زہر وغیرہ نہ کھا لیا ہو۔"

اپنے بیڈروم میں بیٹھا ہوا عاصم نیچے کی آوازیں سن رہا تھا سر یکدم بہت بھاری بھار
تھا وہ اٹھا اور اپنے لیے کافی بنائی۔

کاش! اے کاش میں تم سے نہ ملا ہوتا کومل۔ تم نے جبین زندگی پر اتنی گہری خراشیں
ہیں کہ ان کے نشان ایک جہان الٹ پلٹ کیے دیتے ہیں تمہیں خبر بھی نہ ہو گی کہ اس ایک
کیا کیا بیت گئی جو کبھی تمہیں اپنا سمجھ کر ایک دنیا کی بادشاہت اپنی مٹھی میں لیے بیٹھا تھا۔

وہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم تھا کہ شہلا آنٹی دستک دے کر اندر چلی آ

"ارے آپ!" وہ انہیں اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی آیئے۔ آپ

افریقہ کی کافی پلواتا ہوں۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ ہنگامہ کیا کر رکھا ہے؟"

"میں نے۔" عاصم نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تم نے مجھے عارفہ نے فون پر بتایا ہے کہ تم نے سبین کو گھر سے نکل جانے کو کہا ہے تم پڑھے لکھے آدمی ہو دنیا گھوم چکے ہو لٹھ مار گنواروں جیسی حرکت کیوں کی اور چلو نیچے۔" انہوں نے اس کا کان پکڑا۔

"تمہارے خالو نیچے تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔"

"آپ ڈاکٹر صاحب کو ساتھ کیوں لائیں۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے؟" آنٹی شہلا نے اسے غصے میں دیکھا تو فوراً پینترا بدلا۔

"پہلے تو اپنی ساؤتھ افریقہ کی کافی پلاؤ اور پھر سارا چکر بتاؤ۔"

عاصم نے مختصراً انہیں سب حقیقت بتائی۔

"خیر جو بھی ہے اب جاؤ اسے روک لو۔ وہ تمہاری عزت اور غیرت ہے لوگوں کو کہانیاں
نے میں کتنی دیر لگتی ہے تم کس کس کی زبان روکو گے اور کوئی وجہ بھی ہو تم نے یہ زیادتی کی ان پڑھ جاہلوں والی حرکت کی تم نے سبین بہت اچھی لڑکی ہے وہ اس سلوک کی اہل نہیں جو تم نے کیا
م تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

"قسم سے آنٹی! میں نے اسے روکا تھا اور شاید وہ رک بھی جاتی۔"

ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ اس کی بانہوں میں پگھل رہی تھی بے خود ہوئی جا رہی تھی اس کے
ں کی نرم حدت کا لمس ابھی تک اس کے ہونٹوں پر زندہ تھا پھر پتا نہیں میں واش روم میں تھا
کی والدہ اور عارفہ آئیں تو اسے نیچے لے گئیں اور میں تو اس کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو بیوقوف کہ وہ تمہارے دو زبانی جملوں سے پگھل جاتی جبکہ تم اسے بازو سے
کر کھینچتے ہوئے نیچے لے گئے تھے۔ یہ اس کی بے عزتی تھی عاصم! تم تو عورت کا احترام اور اس
زت کرنے والے ہو پھر۔"

آنٹی شہلا نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ ایک دن کی بات نہیں ہے آنٹی! یہ ہمارا معاملہ تو پچھلے ڈیڑھ برس سے چل رہا ہے سبین

کے والد کومل والے واقعے کو بنیاد بنا کر ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پپا میر
حصے کی جائیداد سبین کے نام لکھ دیں آنٹی! مجھے سبین سے پیار ہے میری جان ہے وہ میں اسے کا
چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتا حالانکہ جب سے شادی ہوئی ہے اس نے مجھے کوئی سکھ نہیں دیا
اپنی ماں اور تائی اماں کی باتوں پر میری نسبت زیادہ یقین رکھتی ہے۔"

"عاصم! یہ سب صحیح سہی لیکن تم اس وقت جس طرح بھی ممکن ہوا سے روک لو وہ معصوم اور تائی اماں کی باتوں میں آ گئی ہے جو تمہارا گھر آباد نہیں ہونے دینا چاہتیں لیکن میری جان سبین کو اس کے بھولپن اور معصومیت کی اتنی بڑی سزا مت دو۔"

"بخدا آنٹی! میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ غصہ میں کہہ دیا میں نے جانے کو اگر وہ رک جائے تو میں ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہوں لیکن اب مسئلہ انا کا ہے کیا خبر سبین ماں باپ عزت کی خاطر رکنے سے انکار کر دے اور میری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی اگر وہ میر روکنے پر بھی چلی گئی تو پھر شاید ہم دونوں کبھی اکٹھے نہ ہو سکیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے کوئی راستہ نکالتے ہیں اور تم آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ اور خبر بغیر سبین کے مت آنا نہیں تو لارڈ تمہاری پتلون پھاڑ دے گا۔"

"ہاں یہ صحیح ہے دونوں رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں۔"

ڈاکٹر زمان عین اسی وقت اوپر آ گئے اور پھر عاصم سے مل کر شہلا کو ساتھ لے کر نیچے گئے اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چند منٹ بعد وہ نیچے آیا تو ڈرائنگ روم میں سب تھے پپا کا چہرہ تمتما رہا تھا واجد حسین غصے میں تھے آنٹی شہلا اور مما سبین کی والدہ کو سمجھا رہی عاصم کو آتے دیکھ کر ساتھ ہی واجد حسین بھی جانے کے لیے تیار کھڑے ہو گئے وہ کسی صورت سبین کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھے۔

"چچا جان۔" عاصم آگے بڑھا یہاں سب نے غصہ میں ایک دوسرے کو جو جی میں آ بخدا میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ سبین اس طرح یہاں سے جائے میں معذرت خواہ ہوں آپ گزر سے کام لیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں کیونکہ میں غصہ میں تھا میرا مقصد ہرگز تکلیف دینا نہ تھا۔ نہ ہی کسی کا دل دکھانا مقصد تھا میری درخواست پر اس جھگڑے کو یہاں کر دیں۔ سبین آپ کے ساتھ چلی گئی تو فاصلے بڑھ جائیں گے۔ اور یقیناً آپ کا مقصد فا

کرنا ہے بڑھانا نہیں۔

آؤ سبین یہ کہہ کر عاصم نے سبین کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا جو جانے کے لیے لائی تھی،
"آؤ۔" دوسرے ہاتھ سے اس نے سبین کا بازو پکڑا اور جانے کے لیے مڑا۔

"ٹھہرو میاں!" واجد حسین نے غصے سے اسے روکا۔ اتنی جلدی فیصلہ کر کے خود ہی بدل ڈالا برخوردار! بات اب تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں ہے آج تو سبین کم از کم یہاں نہیں ٹھہرے گی ہم اسے ساتھ لے جا رہے ہیں اگر جی چاہے تو ہمارے ہاں آ جانا اور اگر سبین تمہارے ساتھ آنے پر رضامند ہو تو لے آنا۔

سبین نے عاصم سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور واجد حسین کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ سے بولی۔

"چلیے ابو!"

پھر وہ مما کے پاس آئی سلام کیا سفیر احمد کے پاس جا کر انہیں خدا حافظ کہا۔

سفیر احمد نے پرس نکالا اور جتنے پیسے ہاتھ آئے اسے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! ماں باپ کے گھر رہ کر جلدی آنا میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گا۔"

انہوں نے اس کے سر پر پیار کیا سبین کی سسکی نکل گئی۔ اور پھر وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر اتنا روئی۔ کہ اس کی چیخیں نکل گئیں اس کی والدہ نے اسے بازو سے پکڑا۔ اور وہ تینوں باہر نکل گئے جاتے......جاتے۔

سبین نے عاصم کی طرف دیکھا ایسی نظریں جن میں امید انتظار اور یقین تھا جو کہہ رہی تھیں مجھے لینے آنا میں تمہارا انتظار کروں گی لیکن عاصم تو اپنا مان ٹوٹنے پر حیران کھڑا تھا۔

جانے کیوں اسے یقین تھا کہ سبین اس کا مان رکھ لے گی اور اپنا گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی لیکن بھرم ٹوٹ گیا تھا کچھ دیر وہ یونہی پتھر بنا کھڑا رہا پھر اپنے بکھرے وجود کو سمیٹتا اوپر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

کیا تھا سبین آج تم نہ جاتیں میں دیوی بنا کر تمہاری پوجا کرتا میں تمہیں اتنا پیار دیتا اتنی محبت دیتا کہ ان ڈیڑھ سال کی تلخیوں کو تم بھول جاتیں۔ لیکن سبین تم نے مجھے۔

بہت اذیت ناک رات تھی اتنی اذیت ناک رات تو وہ بھی نہ تھی جب کومل اس سے چھن گئی

تھی آج کومل کا دکھ پھر جاگ اٹھا تھا دونوں دکھوں نے اسے رات بھر جگایا صبح ناشتے پر اس نے
اور مما کو رات کی فلائیٹ سے واپس جانے کی اطلاع دی۔

''بیٹا! جلدی آنا'' مما نے اسے تاکید کی بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''کیا ٹھیک ہو جائے گا؟''

وہ قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا لیکن مما پاپا کی مسلسل کوششوں اور جھگڑوں کے بعد اس
حصے کی جائداد سبین کے نام لکھ دی گئی اسے علیحدہ گھر لے دیا گیا جو اس کے نام تھا اور عاصم کی طر
سے ماہانہ خرچ کے لیے رقم مقرر کی گئی اور یوں سبین ہر شرط منوا کر مما پپا کے ساتھ واپس عاصم
گھر آ گئی عاصم کو مما نے مجبور کیا کہ وہ فوراً آئے وہ مما کے مجبور کرنے پر لوٹ آیا۔

اور مسلسل تین سال تک سال میں تین چار چکر پاکستان کے لگاتا رہا۔لیکن سبین نے تو ا
زبان پر انگارے رکھ لیے تھے۔اس کے ہونٹ زہر میں بھیگے رہتے اور وہ کبھی کومل کے حوالے
طنز کرتی کبھی یورپین لڑکیوں کے حوالے سے اور کبھی تارا کا قصہ لے بیٹھتی۔

ہر چھٹی کا اختتام لڑائی جھگڑے پر ہوتا اس دوران اولاد بھی ہوگئی۔

''سبین!'' وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا بھول جاؤ سب میں اتنی دور سے تمہاری خاطر آ
ہوں اور تم ان لمحوں کو اپنے رویوں کی بدصورتی سے زہرناک بنا دیتی ہو سنو مجھے اپنا لو میں پور
تمہارا ہوں لیکن سبین نے اسے کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔

سبین کا دل کبھی اس کی طرف سے صاف نہیں ہوا وہ چند لمحوں کے لیے خوش بھی ہوتی تو
ویسی ہی ہو جاتی زبان پر کانٹے اگ آتے۔

اس تک جانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی جاتی تھی ان کے درمیان پیدا شدہ خلیج گہری ہوتی گئی۔

تھک کر عاصم نے سال بہ سال گھر آنا چھوڑ دیا۔سبین اپنے علیحدہ گھر میں جو اس
والدین کے گھر کے قریب ہی تھا۔بچوں سمیت منتقل ہوگئی اگرچہ ان کے درمیان باقاعدہ علیحد
نہ ہو سکی کہ یہ مما اور پپا کی خواہش تھی۔انہوں نے عاصم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ سبین کو کبھی بھی ا
زندگی سے الگ نہیں کرے گا۔

خاص طور پر اب جبکہ تین بچے بھی تھے عاصم نے وعدہ کر لیا تھا لیکن اس نے پاکستان
چھوڑ دیا تھا تین چار سال بعد چکر لگاتا بھی تو مما پپا سے مل کر واپس چلا جاتا۔کیا کچھ نہیں کیا تھا

سبین نے کہا چاہا دیا جائداد علیحدہ گھر ہر خوشی پوری کی آسائشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔اپنے دل کے
دروازے کھول دیئے لیکن سبین نے اس کا وہ ایک جرم معاف نہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر
نے سے پہلے کسی کومل سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

''کیا واقعی یہ اتنا بڑا جرم تھا؟'' وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھتا تھا۔

یوں اس نے شادی شدہ زندگی کے پندرہ سال گزار دیئے تھے لیکن پندرہ سالوں میں خوشی
اور رفاقت کے لمحے کتنے مختصر تھے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

وہ پندرہ سالوں سے شدید دھوپ میں آبلہ پا جل رہا تھا۔وہ چاہتا تو کہیں کسی شجر سایہ دار
تلے بیٹھ جاتا اگر وہ اشارہ بھی کرتا کہیں تو اس کے لیے کئی دامن وا ہو سکتے تھے لیکن اس نے دل
کے دروازوں پر تالے لگا دیئے تھے اور پیا چلا جا رہا تھا اب تو تھکن سی رگ رگ میں اترنے لگی تھی
ایک گھر ایک مکمل پرسکون گھر کی چاہ کبھی کبھی دل میں بھالے مارتی کیا تھا کیا تھا سبین اگر تم معاف
کر دیتیں کیا تھا اگر تم تائی اماں کی باتوں میں نہ آتیں تو آج ہم دونوں کی زندگی ناکام نہ ہوتی تم
نے مجھے تو برباد کیا ہی تھا خود کو بھی برباد کر ڈالا ہے کیا تنہائیاں تمہیں بھی میری طرح ڈستی نہ ہوں گی۔

کیا تم بھی اکثر راتوں کو کروٹیں بدل بدل کر صبح نہیں کرتی ہوگی۔

کیا تین بچوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے تمہارے جی میں میری رفاقت کی خواہش نہ مچلتی ہوگی۔

ان دنوں وہ بہت شدت سے اسے سوچنے لگا تھا ایسے میں سمیرا سے اچانک ملاقات اور کومل
کی کہانی سمیرا سے کہہ دینے کے بعد جیسے ایک بار پھر دل میں سوئی آرزوئیں بیدار ہوگئی تھیں۔

''سمیرا اسے شادی پر اکساتی تو سبین اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ اس کے دل میں
اتر آتی۔''

وہ بچوں کی باتیں کرتی تو اس کے سامنے تینوں آ جاتے وہ دل میں پھول بوٹے اور اگانے
اور جالے اور دھواں صاف کرنے کی بات کرتی تو سبین پھولوں سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے تصور
میں آ جاتی لیکن شاید اسے خالی دامن ہی رہنا ہے ہمیشہ اور ہر لحظہ دھوئیں سے جلنا ہے اور ساری عمر
اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلنا ہے ایک بار پھر سبین نے اپنی طرف آنے کا ہر راستہ بند
کر دیا تھا۔

اس کی تیز طنزیہ آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے اس نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں صبح کے چار بج رہے تھے اور اس کے سامنے رکھا ایش ٹرے بھر چکا تھا۔اس نے ہاتھ میں سلگتا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا تب ہی فون کی بیل بج اٹھی دوسری طرف جواد تھا۔

”خیریت ہے نا؟“ عاصم کا دل کانپ اٹھا۔

”مما کی طبیعت خراب ہے بھائی! انہیں ہسپتال میں ایڈمٹ کرادیا ہے تھوڑی دیر پہلے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ عاصم کو یقین نہیں آرہا تھا۔ابھی تین چار گھنٹے پہلے تو وہ مجھ سے بات کر رہی تھیں۔

”ہاں اچانک ہی سانس کی تکلیف ہوئی جو بڑھتی گئی میں ہاسپٹل لے گیا آکسیجن لگائی ہے وہ ایمرجنسی میں ہیں بھائی۔“ وہ یکدم رو پڑا مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔

”حوصلہ کرو جواد۔“ عاصم نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

”اور یہ سارا کیا دھرا سبین بھابی کا ہے وہ جب بھی آتی ہیں مما کی طبیعت خراب ہو جاتی اور آج تو انہوں نے بہت جھگڑا کیا اور مما کے منع کرنے کے باوجود اڑھائی بجے رات ا ڈرائیو کرتی ہوئی ملتان چلی گئیں اور ان کے جانے کے بعد مما بہت ڈیپریس ہو گئیں اور۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”جواد! حوصلہ کرو۔محمود اور زرتاشی کو اطلاع دو باجی اور بھائی جان کو اطلاع دی تم نے؟ پہلی فلائیٹ سے آرہا ہوں خود کو سنبھالو۔“

اسے حوصلہ دے کر عاصم نے فون بند کیا تو خود اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا آنسو کہ امڈتے ہی چلے آتے تھے اس نے اٹھ کر وضو کیا اور خدا کے حضور سر بہ سجود ہو گیا۔جو ہستی کے لیے تپتی حیات میں امرت تھی پریشانیوں کی دھوپ میں سایہ تھی ابر رحمت تھی جو متاع سے زیادہ عزیز تھی جو ماں ہی نہیں دوست مہربان اور نگہبان بھی تھی۔

اب اس وقت ہاسپٹل کے آئی سی یو میں بے ہوش پڑی تھی اور انجانے میں وہ اس کا بنا تھا اور راو سبین۔

”اے میرے رب“ اس نے سجدے میں پڑے پڑے دعا کی میں جانتا ہوں تو ماں کی

کی کتنی لاج رکھتا ہے ایک ماں کی پریشانی دیکھی تو صفا و مروہ کو رکن حج بنا دیا۔تو نے حضرت موسیٰ پر ہمیشہ کرم فرمایا جب وہ کوہ طور پر آتے اور ان کی ماں فریاد کناں ہوتی رب العالمین تو نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے۔تو رحمان اور رحیم ہے اپنے ایک عاجز بندے کی فریاد سن لے۔تجھے اس محبت کا واسطہ جو تجھ میں اور ایک ماں میں مشترک ہے۔

جانے کتنی دیر تک عاصم دعا مانگتا رہا۔پھر جیسے دل کو سکون سا ملا ایک یقین سا کہ اس کی دعا بارگاہ رب العزت میں مستجاب ہوئی وہ اٹھا اس نے گیارہ بجے کی فلائیٹ سے سیٹ بک کروائی اور آنکھیں بند کر کے کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے زیر لب پھر دعائیں مانگنے لگا۔

☆☆☆

لاہور ائیر پورٹ سے سیدھا وہ شیخ زاید ہسپتال پہنچا تھا۔ابھی ان کی طبیعت ٹھیک طرح سے سنبھلی نہ تھی لیکن انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا عاصم کو دیکھا تو ان کی حالت پھر سیریس ہو گئی ڈاکٹروں کی بھرپور کوششوں سے اللہ نے کرم کیا۔دل کے دو والو بند تھے۔سرجری ناممکن تھی کہ وہ شوگر کی مریض تھیں۔پہلے انجیو پلاسٹی اور پھر بیلونگ کے ذریعے والو کو ممکنہ حد تک کھولا گیا دس دن تک عاصم جواد اور عارفہ نے آنکھ تک نہ جھپکی۔محمود اور زرتاشی بھی آگئے تھے بارھویں دن انہیں عارضی طور پر ہاسپٹل سے فارغ کیا گیا تو گھر پہنچ کر مما نے عاصم کو اپنے کمرے میں بلایا اور کتنی ہی دیر تک اس کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر دعا کی۔

”خدایا! میرے اس بچے کی بھی سن لے اسے بھی گھر گرہستی کا سکھ نصیب کر۔“

آخر ایسا کیا ہو گیا ہے مما اچھا بھلا ہوں گھر ہے بچے ہیں عاصم نے مسکرا کر ان کا ہاتھ چوما۔

”یہ بچی سمیرا کون ہے؟“ بالآخر مما نے وہ بات پوچھ ہی لی۔

”عاصم ہنس پڑا مما وہ ایک بہت اچھی خاتون ہیں ایک محفل میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی انہوں نے میرے کچھ آرٹیکل ماحولیات کے متعلق پڑھ رکھے تھے میری تحریر ان کو بھائی تو انہوں نے مجھے کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیا اور میں نے ان کے ہی مشورہ پر وہ کہانیاں لکھی تھیں شاید میں بھی رائٹر بن جاتا اگر۔“

وہ پھر خوامخواہ ہنسا۔

"سبین میری بیماری کا سن کر بھی نہیں آئی۔"

انہوں نے آنکھیں بند کیں لیکن ان کی بند آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہہ نکلے عاصم ان کے آنسو پونچھے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"مما! آپ فکر نہ کیا کریں میں ایسے ہی خوش ہوں اسی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔"

اس نے انہیں اچھی طرح کمبل اڑھایا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔

"یہ کیسا درد ہے جو ہر آن اس کی آنکھوں سے بہہ نکلنے کو تیار رہتا ہے ایسا سم قاتل جس تریاق نہیں۔"

ایسی خزاں جس کا اختتام نہیں وہ تڑپا دینے والی سوچوں میں گھرا سیڑھیوں کی طرف سامنے عارفہ کھڑی تھی اس نے خاموشی سے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا یہ وہی لفافہ تھا جو نے سمیرا کو بھیجا تھا اور جسے عارف نے سمیرا کے بیگ سے جاتے سمے نکال لیا تھا۔

"بھائی!" عارفہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"پگلی!" عاصم نے آہستہ سے اس کے بالوں پر شفقت سے تھپکی دی مت روؤ اور مجھے سی چائے پلوا دو۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

اور تمہیں کیا خبر سبین کہ ایک تمہارے رویوں نے کتنے دلوں کو زخمی کیا ہوا ہے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عاصم نے سوچا۔

چند لمحے وہ اپنے بیڈروم میں کھڑا کسی نامحسوس خوشبو کو اپنے اندر اتارتا رہا جیسے اتنے س بعد بھی سبین کی خوشبو یہاں موجود تھی بلکہ ابھی کچھ روز قبل جب وہ یہاں آئی تھی تو یقیناً یہا ٹھہری ہو گی۔ اس بیڈروم نے اس کی ساری خوب صورتیوں اور نزاکتوں کو دیکھا ہو گا۔

عاصم دل کی گھٹن سے گھبرا کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا میں کس کی ہتھیلی پر اپنی خوشیوں تلاش کروں۔ کس کی پیشانی پر محبت کا ستارہ طلوع ہوتے دیکھوں۔

کوئل جو اسے ایک نہ ختم ہونے والا درد بخش گئی تھی اور سبین جس نے ہر آن اس در اضافہ کیا جس نے اور بہت سارے درد اس کے دل پر رقم کر دیے تھے۔

"اور میں وقت کی ناانصافیوں کے پنجرے میں قید ہوں۔" عاصم نے بالکونی کی

سے جھک کر نیچے دیکھا۔

"میں اس کی سلاخوں سے سر ٹکراتا ادھر ادھر پھڑ پھڑاتا ہوں۔ میرا ہر انگ زخمی ہے میں چور چور ہوں منزلوں کے سرابوں کے پیچھے بھاگنے کی ظالم تھکن ہے۔ میرا کوئی لمحہ میرے تابع نہیں میری کوئی سوچ میرے تابع نہیں رہی۔ میں اپنی تنہائیوں کا تاج ور ہوں میری سلطنت میں تمام عمر کے رت جگے ہیں میرے ہمراہ میری رسوائیاں اور اندھیرے ہیں۔ میرا انتظار اور میری آس لامحدود ہے اور میری سعی بے نشان۔" آنکھوں کے کونوں میں اکٹھے ہو جانے والے آنسوؤں کو عاصم نے ہتھیلی کی پشت سے پونچھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"بھائی!" عارفہ نے اسے اس کے بیڈروم سے پکارا وہ اس کے لیے چائے لائی تھی۔ وہ بیڈ روم میں آ گیا۔

"تھینک یو گڑیا۔" اس نے چائے کا کپ لے لیا عارفہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"بھائی! آپ صبح چلے جائیں گے۔"

"ہاں۔"

"کچھ دن اور رک جاتے مما کی طبیعت اور بہتر ہو جاتی تو۔"

"جانا تو ہے ہی آج نہیں تو کل۔"

"بھائی! اس نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔"

"مما آپ کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔"

آپ کی ناکام زندگی کا دکھ انہیں کھائے جا رہا ہے آپ نے آنے کا کہا تو وہ اتنی خوش ہوئیں تا نہیں کیا کیا سوچ ڈالا انہوں نے سبین کو بھی اطلاع کر دی بچوں کو بھی بتا دیا کہ تمہارے پپا آ ہے ہیں اور پھر جب سبین بھابی ادھر آئیں تو مما کی خوشی دیکھی نہیں جاتی تھی کتنی بار انہوں نے ھ سے چپکے چپکے کہا۔

"سبین کی آنکھوں میں عاصم کے انتظار کے دیے جل رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اب کی بار یرے بیٹے کو کوئی ابدی خوشی ملے گی۔ وہ بھی ہنسے گا میری کتنی دیرینہ آرزو ہے کہ اسے بھی اپنے گھر یں اپنے بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھوں شاید میری آرزو اس بار پوری ہو جائے۔"

اس نے بھی تو یہی سوچا تھا لیکن بھول گیا تھا کہ وہ تو صحرا کا مسافر ہے اور سرابوں کے سائے

اس کے بریدہ پیرہن سے لپٹے ہیں۔اس نے بھی تو ایک بار پھر سبین کی زلفوں کی مہک لینے کی کرڈالی تھی۔

اس کی کوملتا کو پالینا چاہا تھا۔

اس کی محبتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آنکھیں موند کر سونے کی تمنا کر بیٹھا تھا لیکن رت اس کی تقدیر تھے شاید اس کی محبتیں ہمیشہ گم گشتہ اور شامیں اداس رہنا تھیں۔

اس کے لیے دور دور تک طویل اور ظلمت پاش شبیں تھیں ابر بس۔

"بھائی!" عارفہ نے اسے خاموش دیکھ کر پھر پکارا۔

"سبین بھابی بھی بہت بدلی بدلی لگ رہی تھیں مسکراہٹ ان کے ہونٹوں اور آنکھوں بیک وقت کھلتی تھی۔مجھے بھی لگتا تھا جیسے اب کی بار آپ آئے تو......لیکن پھر......پھر جمال نے وہ پیکٹ بھجوادیا اور سب راکھ میں مل گیا۔"

ہاں سب راکھ میں مل گیا۔عاصم نے آہستگی سے کہا اور چائے کے ہلکے ہلکے سپ لینے

"کاش! سبین اتنی شکی اور جھگڑالو نہ ہوتی بلاشبہ شک بڑی سے بڑی اور مضبوط سے م محبت کو پارہ پارہ کردیتا ہے کاش ہمارے درمیان کبھی اعتبار کا رشتہ قائم ہوسکتا۔"

"بھائی! آپ نہ جائیں۔" عارفہ نے التجا کی سبین بھابی کو منالیں۔

"کیا میں نے کبھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی اور میں تو اب بھی اپنی ساری انا ئیر کر ایک بار پھر اس کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس نے بیچ راہ میں ہی روک دیا۔"

عاصم نے اداس نظروں سے عارفہ کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کچھ کہے بغیر نگاہیں جھکا لیں

"بھائی! ہمارے لیے مما کی خاطر ٹیپو کنزیٰ اور عنیزہ کے لیے ایک بار پھر آپ بھا طرف جا کر دیکھیں انہیں منانے کی کوشش کریں عارفہ نے التجا کی۔"

"اس کے دل میں کسی نے چٹکی لی۔"

"اس نے تڑپ کر عارفہ کی طرف دیکھا۔"

اور پتا نہیں مجرم کون ہے اور سزا کسے مل رہی ہے اس سارے سیٹ اپ میں زیادہ قصو ہے اس کا سبین کا یا تائی اماں کا۔

"اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔"

لیکن قصوروار کوئی بھی ہو اس کا گھر تو نہیں بن سکا تھا زندگی کے پندرہ برس ہاتھوں سے پھسل گئے تھے اور وہ خالی ہاتھ تہی داماں کھڑا تھا اور کوئی نہیں تھا جو اسے بتاتا کہ اصل قصوروار کون تھا؟

"آپ کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر مما کی آدھی بیماری ختم ہوجائے گی۔"

"کیا تم سبین کو نہیں جانتی ہو گڑیا؟ اس کا دل تو پتھروں سے زیادہ سخت ہے اس میں کسی نرمی کی گنجائش نہیں اگر ایسا ہوتا تو وہ ایک بار تو آواز دیتی پکارتی مجھے ہر بار میں ہی اس کی طرف آیا وہ تو ایک بار بھی میری طرف نہیں آئی۔"

"لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے ایک آخری کوشش۔"

"ہاں ایک آخری کوشش۔"

"اس نے خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔"

"مما کی خاطر بچوں کے لیے۔"

وہ عارفہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا زخمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں ابھری اور معدوم ہوگئی۔

"اوکے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو عارفہ کی آنکھیں بے اختیار نم ہوگئیں اور وہ عاصم سے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے جلدی سے خالی کپ اٹھا کر باہر نکل گئی اور آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے اس کے لبوں پر بے اختیار ایک بھولا بسرا نغمہ آ گیا۔

میرا دل ہے سیپ سمندر
میں قطرہ قطرہ برسوں
تیرے پیار کو پھر بھی ترسوں
کب رات ڈھلے دن آئے
کب میل ہو تیرا میرا
کب دل سے دل مل جائے
کب سیپ سے موتی نکلے

"وہ گنگنا رہا تھا اور دل میں امید کا ایک ننھا سا دیا پوری آب و تاب سے جل اٹھا تھا۔"

''اللہ کرے مر جائے وہ موت بھی تو نہیں آتی اسے۔''

''خدا نہ کرے بڑی آپا ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالیں۔''

زوباریہ نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تجھے نہیں پتا زوبی اس لڑکے نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔'' ان کی آنکھیں تھل ہونے لگیں۔

''بچہ ہی تو ہے نا بڑی آپا۔ اور بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آپ یوں ہی جذبا جاتی ہیں۔''

زوباریہ کو بڑی آپا پر غصہ آ رہا تھا جو یوں منہ بھر بھر کے اُسے بددعائیں دے رہی تھیں اس کی کوئی اتنی بڑی خطا بھی نہیں تھی اس عمر میں بچے ایسی حرکتیں کرتے ہی ہیں وہ تو لڑکا تھا اس نے ذرا اونچی آواز میں ٹی۔وی ہی تو لگایا تھا نا ایک وہ تھی زینب لڑکی ہو کر یونہی آواز میں چلاتی تھی کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ بس بھاگ ہی جائے کہیں مگر اس نے اونچی بڑی آپا کی اسے بددعائیں کبھی نہیں دی تھیں۔

''باپ کے بجائے اسے موت آ جاتی مگر میرے نصیب۔''

بڑی آپا ابھی تک اُسے کوس رہی تھیں۔

''پلیز بڑی آپا۔''

اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''کوئی لمحہ شنید بھی ہوتا ہے۔''

''مگر میری تو خدا نہیں سنتا۔''

ان کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ ساری جان سے کانپ گئی ایک ذرا سے بچے سے نفرت اس نے مڑ کر شاہ رُخ کو دیکھا جو ایک طرف کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا بارہ سالہ سا شاہ رُخ ماں کی ڈانٹ کھا کر اُداس سا بیٹھا تھا۔ ابھی تو اس کی عمر سنورنے اور بننے کی تھی محبت سے نرمی سے جس رُخ چاہے موڑا جا سکتا تھا مگر بڑی آپا کا رویہ اس کی سمجھ میں

''شاہ رُخ بیٹے اِدھر آؤ۔''

''جی!'' وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''بیٹے امی کو ناراض کیوں کرتے ہو؟ امی کو پریشان نہ کیا کرو جان۔''

''سوری آنٹی!'' وہ بہت شرمندہ لگ رہا تھا۔

''چلو! معافی مانگو ممی سے۔''

زوباریہ نے نرمی سے کہا۔

''سوری ممی آئندہ اونچی آواز میں ٹی۔وی نہیں لگاؤں گا۔''

''بڑی آپا! شاہ رُخ آپ سے سوری کر رہا ہے۔''

زوباریہ نے خاموش بیٹھی بڑی آپا کو مخاطب کیا۔

''تجھے نہیں پتا زوبی! یہ روز ہی معافیاں مانگتا ہے اور روز ہی بھول جاتا ہے ایک وہ ہے میرا بیٹا جہاں زیب کبھی جو اس سے مجھے شکایت ہوئی ہو ہر بات مانتا ہے میری۔'' زوباریہ نے دیکھا بارہ سالہ شاہ رُخ کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کو بدل سا گیا تھا۔

''نہیں آپا! یہ بھی بہت اچھا بچہ ہے آپ چلیں پیار کریں اُسے۔''

''ماما پلیز!''

وہ ان کے پاس ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا زوباریہ نے محسوس کیا کہ انہوں نے بڑی بے دلی سے اس کی پیشانی چومی تھی اسے جانے کیوں دُکھ سا ہوا۔

''اچھا جاؤ بیٹے شاباش اب آئندہ ممی کو تنگ نہیں کرنا زینی گڑیا بھائی کو ساتھ لے جاؤ۔''

نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والی زینب...... اُسے آ کر ساتھ لے گئی تو اس نے بڑی آپا کی طرف دیکھا جن کی پیشانی پر ابھی تک شکنیں پڑی ہوئی تھیں بڑی آپا اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں کہو!''

''بڑی آپا! آپ کا شاہ رُخ کے ساتھ جو رویہ ہے نا وہ کچھ ٹھیک نہیں ہے اس طرح تو بچے بگڑ جاتے ہیں آپ نرمی سے محبت سے اُسے سمجھایا کریں۔''

''میں کوئی دشمن تو نہیں ہوں ماں ہوں اس کی مگر تجھے نہیں پتا زوبی یہ لڑکا مجھے کتنا تنگ کرتا

ہے اس کی معصوم شکل پر نہ جاؤ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آپا مگر ابھی تو بچہ ہے سنبھل جائے گا۔"

"سنبھل چکا یہ وہ زیب اس سے پورے دو برس چھوٹا ہے مگر اتنا سمجھ دار ہے کہ۔"

"بڑی آپا! آپ اس بات کا بھی خیال رکھا کریں کہ اس کے سامنے زیب کی اتنی تعریف کیا کریں اس طرح منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں بچے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت کمتر ہے بھائیو میں بھی نفرت پیدا ہو جائے گی محض آپ کی اس بے جا تعریف کی وجہ سے سب بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے نا! آپ اس کی بھی تعریف کیا کریں۔"

"رہنے دے زوبی تُو اپنی فلاسفی پتا ہے مجھے تُو نے نفسیات پڑھی ہے۔"

بڑی آپا کو غصہ آ گیا تھا۔

"مگر تُو اسے نہیں جانتی دادی اور پھپھو کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔"

"لیکن بڑی آپا اس کی دادی کو مرے تو تین چار سال...... ہو گئے اور وہ اس کی پھپھو کویت نہیں چلی گئی شادی کے بعد۔"

"ہاں مگر اسے تو بگاڑ گئی نا۔"

اس کا دل تو چاہا کہ کہے...... "کیسے؟" مگر پھر بڑی آپا کے غصہ کو خیال کر کے وہ چپ یوں بھی وہ اتنے سالوں بعد امریکہ سے آئی تھی اور مہمان تھی پھر بڑی آپا اتنی دُکھی تھیں اس عم بیوگی کا دُکھ سہا تھا منیر بھائی جیسے شوہر کی ناگہانی موت نے انہیں چڑچڑا کر دیا تھا۔ رونے بیٹھ گھنٹوں روئے چلی جاتی تھیں۔

پچھلے سال منیر بھائی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور وہ لمحوں میں چٹ پٹ ہو گئے تب سے وہ پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہی تھی مگر کچھ گرین کارڈ کے چکر میں وقت لگ گیا تھ اب وہ زینب کو لے کر سیدھی بڑی آپا کے پاس ہی آئی تھی جب اس کی شادی ہوئی تھی تو شا ایک سال کا تھا اور اس کی تو جان اٹکی ہوئی تھی شاہ رُخ میں تھا بھی وہ اتنا پیارا شادی کے بع جب کبھی اسے شاہ رُخ کی یاد آتی تو وہ سہیل سے چھپ چھپ کر روتی تھی پھر زینب آ گئی لیکن رخ کے لیے اس کے دل میں جو جگہ تھی وہ کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ وقت نکال کر مہینے دو مہینے بعد ضرور کراچی جاتی تھی صرف شاہ رُخ کے لیے مگر پھر

نے اسے امریکہ بلا لیا تھا اور اب پورے چھ سال بعد وہ امریکہ سے آئی تھی۔ مگر شاہ رُخ کے ساتھ بڑی آپا کا رویہ دیکھ کر اس کا دل بہت دُکھا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ بڑی آپا اکثر اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں۔

جہاز زیب سے...... وہ بہت پیار کرتی تھیں اس کی بڑی بڑی شرارتوں کو اگنور نظر انداز کر دیتی تھیں جب کہ شاہ رُخ کی ذرا سی غلطی پر اسے اتنا ڈانٹتیں اتنی بددعائیں دیتیں کہ وہ کانپ اُٹھتی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں؟ دونوں ہی ان کے جگر گوشے تھے پھر دونوں کے ساتھ ان کے رویے میں تضاد کیوں تھا؟ ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی کہ شاہ رخ بدصورت یا بدہیت تھا بلکہ وہ تو بہت ہی پیارا بچہ تھا جہاں زیب سے بھی کہیں زیادہ پیارا۔

"پھر؟" اور اس پھر کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا وہ بڑے غور سے بڑی گہری نظروں سے بڑی آپا کا مطالعہ کرتی رہی اور جوں جوں اسے احساس ہوتا گیا کہ بڑی آپا کے دل میں شاہ رُخ کی محبت اتنی نہیں ہے جتنی کہ جہاں زیب کی اُتنا ہی زیادہ وہ شاہ رُخ کا خیال کرنے لگی اور شاہ رُخ بھی اس کے ارد گرد ہی گھومتا رہتا بچے تو پیار و محبت کے دیوانے ہوتے ہیں ذرا محبت سے پیش آؤ تو اُسی کے ہو جاتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں بڑی آپا ایسا نہیں کرتی تھیں بلکہ جب بھی موقع ملتا شکوہ ہی کرتی رہتیں حالانکہ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی زیادہ سے زیادہ بارہ سال...... اس روز بھی وہ زینب اور شاہ رُخ کو پاس بٹھائے کوئی بہت دلچسپ قصہ سنا رہی تھی کہ بڑی آپا نے آ کر اس کی اسکول رپورٹ اس کے سامنے پھینک دی۔

"یہ دیکھو! اپنے لاڈلے کے کرتوت دو مضامین میں فیل ہے۔"

اس نے رپورٹ اُٹھاتے ہوئے ایک نظر شاہ رُخ کو دیکھا جس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا تھا اور وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مسل رہا تھا۔

"پھر کہتی ہو تم میں جہاں زیب کی تعریف کیوں کرتی ہوں وہ ہے ہی ایسا تھرڈ پوزیشن لی ہے کلاس میں اور ایک یہ صاحبزادے ہیں بڑے ہیں دو سال اس سے اور!" انہوں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

"خدا جانے کیا گل کھلائے گا بڑے ہو کر۔"

"بچہ ہے ابھی آپا! سنبھل جائے گا ماشاءاللہ! بہت ذہین ہے باپ کی ناگہانی موت سے

اپ سیٹ ہوا ہے کچھ خود ہی دلچسپی لے گا پڑھائی میں۔''

''لے چکا دلچسپی لوگ تو مجھے ہی جوتیاں ماریں گے نا کہ باپ نہیں تھا اور میں نے بگاڑ دیا حالانکہ میں نے ٹیوٹر بھی لگا رکھا ہے اور زیب ہے میرا اُسے تو ٹیوٹر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

شاہ رُخ ایک دم ہی اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کا دل دُکھ سا گیا ابھی چند لمحے پہلے وہ کتنا خوش بیٹھا تھا اس کے پاس بڑی آپا کو اس طرح اس کے اور زینب کے سامنے اس کی رپورٹ نہیں پھینکنی چاہیے تھی کس قدر شرمندگی ہوئی ہوگی اُسے بچہ ہے تو کیا ہوا اس کی بھی تو عزت نفس ہوگی نا بڑی آپا بھی بس!۔

اس نے ایک نظر بڑی آپا کو دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر انہیں پاس ہی بٹھا لیا۔

''یہ بچپن میں تو شاہ رُخ بڑا لائق ہوا کرتا تھا مجھے یاد ہے کے جی میں تھا تب یہ اور اس نے اوّل......پوزیشن لی تھی اور اب۔''

''بتایا تھا نا تجھے زوبی دادی نے بگاڑ دیا اسے اور پھر منیر بھی...... بہت لاڈ کرتے تھے اس کے ساتھ بے جا ضدیں پوری کرنا۔''

''محبتیں بگاڑتی تو نہیں سنوارتی ہیں۔''

اس نے دبے لفظوں میں کہا مگر شاید بڑی آپا نے سُنا نہیں وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔

''میں تو ذرا کچھ کہتی تھی تو دادی لٹھ لے کے کھڑی ہو جاتی تھیں کہ کچھ نہ کہو اسے ذرا سے بچے کی جان کی دشمن بنی ہو۔''

''ہوں! اس نے ایک گہرا سانس لیا۔''

تو اصل بات یہ تھی بڑی آپا شاہ رُخ سے کیوں محبت نہ کر سکی تھیں اس نے محسوس کیا تھا کہ اکثر گھروں میں جن بچوں کے ساتھ ددھیال والے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ وہ بچے والدین کی محبتوں سے محروم ہو جاتے ہیں خاص طور پر ماں اسے انا کا مسئلہ بنا لیتی ہے شاہ رُخ کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی مسئلہ تھا لیکن! شاہ رُخ صرف آٹھ سال کا تھا جب اس کی دادی مر گئی تھیں پھر کیا چار سالوں میں بڑی آپا کی محبت نہیں جاگ سکی تھی مگر شاید اب وہ چاہیں بھی تو اس سے وہ محبت نہیں کر سکتی تھیں جو وہ جہاں زیب سے کرتی تھیں مگر نہیں! وہ ماں ہیں بھلا کیسے اپنے بچے سے نفرت کر سکتی ہیں؟ بس شاید یہ محبت کہیں اندر چھپی ہوئی ہے فاروق کی ممی کی طرح۔

فاروق اس کی روم میٹ کا کزن تھا جن دنوں وہ لاہور ہوسٹل میں تھی تو اس کی روم میٹ کے اس کزن نے خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی تھی وہ ایف۔ ایس۔سی کا سٹوڈنٹ تھا۔ ماریہ اس کی روم میٹ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت ذہین اور حساس تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گھر میں سب بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی سے بہت پیار کرتے تھے وہ درمیان میں تھا اور محسوس کرتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ماریہ نے بتایا تھا کہ کئی بار اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ گھر میں فاروق کے ساتھ اکثر زیادتی ہوتی ہے بڑے بھائی کو جو چیز ناپسند ہوتی وہ فاروق کو دے دی جاتی تھی فاروق بہت چڑتا تھا اس بات پر یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے دل میں اکٹھی ہوتی رہیں اور پھر اس نے ایک دن خود کو آگ لگا لی اور اب آنٹی روتی ہیں اسے یاد کر کے اور پچھتاتی ہیں اور کہیں بڑی آپا کو بھی فاروق کی ممی کی طرح پچھتانا نہ پڑے اس نے بڑے کرب سے سوچا لیکن نہیں میں بڑی آپا کو سمجھاؤں گی۔

''یہ چلا کہاں گیا؟ ذرا بلاؤ تو زینی اسے۔''

بڑی آپا نے رپورٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں پوچھوں تو سہی اس سے کہ اسکول میں اور ٹیوٹر سے وہ پڑھتا کیا ہے۔''

''رہنے دیں آپا! میں اس سے بات کرتی ہوں ہو سکتا ہے کوئی مسئلہ ہو اس کے ساتھ۔''

کیا مسئلہ ہونا ہے زوبا بس اس نے تو میرا جی جلانا ہے مر جاتا تو میں بھی سُکھ کا سانس لیتی۔

''بڑی آپا پلیز!'' اس کے دل میں جیسے کسی نے بھالا اُتار دیا ہو۔

''کم از کم میرے سامنے تو اسے بددعا نہ دیا کریں۔''

''دل جلاتا ہے میرا تو اندر سے خود بخود بددعائیں نکلتی ہیں خود مر گئے میرے لیے عذاب چھوڑ گئے۔''

بڑی آپا رونے لگیں تو وہ چپکے سے وہاں سے اُٹھ آئی شاہ رخ اپنے کمرے میں تکیے میں منہ چھپائے چپکے چپکے رو رہا تھا۔

''شاہ رُخ بیٹے کیا ہوا؟''

زوباریہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے تکیہ اس کے چہرے سے ہٹایا۔

''ارے تم رو رہے ہو؟ کوئی بات نہیں بیٹا کبھی کبھی ہو جاتا ہے ایسا لیکن آئندہ تم محنت کرنا

اور دیکھنا اس سے زیادہ نمبر لینا مگر بیٹے ایک بات تو بتاؤ کیا میتھس اور انگلش آپ کی سمجھ میں نہیں آتی آخر کیوں اتنے کم نمبر لیے ہیں آپ نے؟''

''میتھس تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے آنٹی۔'' وہ آنسو پونچھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

''اور انگلش میں تو میں اپنی کلاس میں سب سے اچھا ہوں۔''

''پھر!''

''بس ایسے ہی آنٹی میرا پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

''مگر کیوں بیٹے؟''

''بس یونہی آنٹی۔''

''کوئی بات تو ہوگی نا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو شاہ رُخ۔''

''ڈیڈی جو مر گئے ہیں تو میرا دل۔''

''دیکھو چاند آدمی اللہ سے تو نہیں جھگڑ سکتا نا اور پھر اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ڈیڈی کو تم لے لیا ہے تو تمہاری ممی ہیں تمہارے پاس ان بچوں کے بارے میں سوچو جن کے ماں با دونوں نہیں ہوتے وہ فریال بھی تو ہے نا اس کے ممی ڈیڈی دونوں نہیں ہیں مگر اس نے تمہاری ط پڑھائی تو نہیں چھوڑی نا ہمیشہ اوّل آتی ہے۔''

''اس کے تو انکل اور آنٹی اس سے اتنی محبت کرتے ہیں اور مجھ سے تو کوئی محبت نہیں کرتا

''کیوں محبت نہیں کرتا تم سے کوئی؟''

''ممی صرف جہاں زیب سے محبت کرتی ہیں مجھ سے نہیں وہ صرف زیب کی تعریف کرتی

اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''نہیں میری جان! یہ تم سے کس نے کہا کہ ممی تم سے محبت نہیں کرتیں۔''

زوباریہ نے اسے گلے سے لگالیا۔

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہوتی ہے آنٹی یہ تو خود بخود پتا چل جاتا ہے۔''

اس نے بڑے کرب سے کہا۔

''شاہ رُخ بیٹا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اسے دلاسا دے تسلی دے اور اسے سمجھائے کہ ماں کبھی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتی اور تمہاری ممی بھی تم سے محبت کرتی ہیں لیکن خود انہیں احساس نہیں ہے اس بات کا۔

اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بہت پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔

''بات یہ ہے بیٹا! کہ ممی تم سے بہت محبت کرتی ہیں بہت زیادہ اور جن سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے انہیں آدمی بہت اچھا دیکھنا چاہتا ہے اور تمہاری ممی بھی تمہیں بہت اچھا دیکھنا چاہتی ہیں اسی لیے جب تم کوئی غلط حرکت کرتے ہو نا تو انہیں...... غصہ آتا ہے اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ وہ تم سے نفرت کرتی ہیں نہیں میری جان وہ تم سے اور زیب سے ایک جیسی محبت کرتی ہیں اب دیکھو نا ان کا غصہ بے جا تو نہیں ہے نا! تمہارا رزلٹ دیکھ کر انہیں رنج پہنچا تب ہی وہ تمہیں ڈانٹ رہی تھیں نا اگر تم بہت اچھے نمبر لیتے تو کیا وہ پھر بھی تمہیں ڈانٹتیں؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر وعدہ کرو کہ آئندہ دل لگا کر پڑھو گے۔''

''جی!'' اس نے وعدہ کیا۔

''میں ممی سے سوری کر لیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں ان سے جا کر اب کبھی فیل نہیں ہوں گا۔''

وہ بھاگتا ہوا باہر چلا گیا تو زوباریہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی بچے بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں اس نے بڑی آپا کو بہت سمجھایا۔ اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ اسے بددعائیں نہیں دیا کریں گی اور لوگوں کے سامنے اس کا اور جہاں زیب کا مقابلہ موازنہ نہیں کیا کریں گی ممکن ہے وہ جہاں زیب جتنا ذہین نہ ہو لیکن پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں نا وہ جیسا بھی ہے ان کا بیٹا ہے اور آپا نے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن پھر بھی جتنے دن وہ وہاں رہی اُسے آپا کا رویہ دُکھ دیتا رہا۔

کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ آپا سے کہے اگر آپ کو شاہ رُخ اتنا ہی بُرا لگتا ہے تو اسے مجھے دے دیں۔ میں اسے اپنا بیٹا بنا لیتی ہوں میرا بیٹے کے وجود سے خالی گھر اس کے دم سے دمک اٹھے گا مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ بڑی آپا سے اتنی بُری بات کہے آخر کو شوہر کی موت کے بعد دونوں ہی ان کا سہارا تھے یہ تو بڑی آپا کی عادت ہے شاید بددعائیں دینے کی وہ شاہ رُخ کو

بہت سارا پیار کر کے اور سمجھا کر امریکہ چلی آئی۔

☆☆☆

''ممی!''

زینب نے بالوں میں برش کرتے کرتے اچانک مڑ کر زوباریہ کی طرف دیکھا۔

''ممی! اگر میں آپ کی اکلوتی بیٹی نہ ہوتی اور ہم دو یا تین بہن بھائی ہوتے تو کیا آپ..... ہم سب بہن بھائیوں سے ایک جیسا پیار کرتیں؟''

''ہاں بیٹے! ماں باپ کے لیے تو ساری اولاد ایک جیسی ہوتی ہے۔''

''مگر ممی!''

وہ برش ہاتھ میں لیے لیے اس کے قریب چلی آئی۔

''بعض گھروں میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ماں باپ کسی سے زیادہ محبت کرتے ہیں کسی بچے سے کم؟ یہ تو زیادتی ہوئی نا امی!''

''ہاں بیٹا!''

زوباریہ کو ایک دم شاہ رُخ کا خیال آ گیا چھ برس ہونے والے تھے اس سے بچھڑے ہوئے پتا نہیں بڑی آپا اب بھی اسے بددعائیں دیتی ہوں گی اور اب بھی سب کے سامنے جہاں زینب کی تعریف اور اس کی برائی کرتی ہوں گی یا پھر یا پھر اب ان کا رویہ بدل گیا ہو گا اور اب تو شاہ رُخ بڑا ہو گیا ہو گا سمجھ دار اور باشعور پچھلے ایک سال سے وہ پاکستان جانے کا پروگرام بنا رہی تھی لیکن بس کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا اور پروگرام فائنل نہ ہو سکتا۔

''ممی وہ میرا کلاس فیلو ہے نا نوید!''

''ہاں!'' اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ممی وہ بہت اچھا ہے لیکن ممی اس کی ممی اس سے ذرا بھی پیار نہیں کرتیں بلکہ اس کے بڑے بھائی سے پیار کرتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ اس سے پیار نہیں کرتیں اور اس کے پپا بھی اس کی نسبت بڑے بھائی سے زیادہ پیار کرتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ممی۔''

''پتا نہیں بیٹا۔''

زوباریہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''ہر ایک کا اپنا مسئلہ ہوتا ہے مختلف وجوہات ہوتی ہیں کہیں کسی بچے کو اس لیے کم پیار ملتا ہے کہ وہ دوسرے بہن بھائیوں کے مقابلے میں کم صورت یا کم ذہین ہوتا ہے کہیں یہ ہوتا ہے کہ جو بچہ ددھیال والوں کا لاڈلا ہوتا ہے اس سے ماں الرجک ہوتی ہے اور کہیں....''

''ممی نوید کہتا ہے وہ کسی دن زہر کھا لے گا اس سے اپنے ممی پپا کا رویہ برداشت نہیں ہوتا۔''

''اوہ نہیں!'' وہ ساری جان سے کانپ گئی۔

''تم نوید کو کسی دن گھر لانا اور دیکھو تم اس سے محبت سے نرمی سے پیش آیا کرو اس طرح شاید اس کے منفی رجحان ختم ہو جائیں۔''

''یس ممی!'' زینب ایک دم خوش ہو گئی اور برش اُٹھائے اُٹھائے پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''یہ بالکل میرے جیسی ہے نرم دل اور حساس اور حساس لوگوں کے لیے زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔''

ایک بار مس ضیاء نے کہا تھا اور اس نے اپنے حساس دل کی وجہ سے اتنے دُکھ جھیلے تھے کہ اُسے مس ضیاء کی یہ بات یاد آئی تھی اور خُدا نہ کرے کبھی میری زینی کو کوئی دُکھ جھیلنا پڑے۔

اس نے سچے دل سے دعا کی۔

''خُدا کرے یہ یونہی چہکتی رہے ہنستی رہے اگلے روز وہ نوید کو ساتھ لے آئی۔''

دبلا پتلا سانولا سا نوید سہما سہما لگ رہا تھا۔

''نوید یہ میری ممی ہیں۔''

زینب نے اسے متعارف کروایا اور اس نے سوچا محبتیں بچوں میں کتنا اعتماد پیدا کر دیتی ہیں ا میں جو اعتماد ہے وہ اس بچے میں نہیں ہے تب اس نے بڑی محبت اور نرمی سے اُسے پاس ا اور بہت دیر تک اس سے اس کی دلچسپی کی باتیں کرتی رہی اور اسے شاہ رُخ بے طرح یاد آتا

''بیٹے جب تمہارا دل چاہے تم آ جایا کرو۔ زینب کو اپنی بہن ہی سمجھو۔ اور مجھے اپنی ماں کی ھو۔''

''تھینک یو آنٹی۔'' وہ بہت خوش ہو گیا تھا۔

پھر وہ اکثر آنے لگا اور اس سے محبت سے پیش آ کر اسے یوں لگتا جیسے وہ شاہ رُخ سے محبت سے پیش آ رہی ہو اور اس کی محرومیوں کا ازالہ کر رہی ہو پھر ان ہی دنوں اچانک اس کا پاکستان آنے کا پروگرام بن گیا۔ زینب کو...... وہاں اس کے چچا کے گھر چھوڑ کر سہیل اور وہ ایک ماہ کے لیے پاکستان چلے آئے چند دن میکے اور چند دن سسرال رہ کر وہ آپا سے ملنے کراچی چلی آئی شاہ رخ اب سترہ اٹھارہ سال کا خوبصورت جوان تھا دیکھنے میں سنجیدہ سا لگتا۔

"ارے شاہ رُخ! تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔"

"آپ کو پتا ہے آپ پورے چھ سال بعد آئی ہیں" وہ مسکرایا۔

اس نے بے اختیار جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"تمہیں دیکھ کر میں سوچتی ہوں میرا اگر کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بالکل تمہارے جیسا ہوتا۔"

"خدا نہ کرے کہ آپ کا بیٹا میرے جیسا ہوتا اُسے تو جہاں زیب جیسا ہونا چاہیے تھا۔"

"کیوں تمہارے جیسا کیوں نہیں؟"

"اس نے کنکھیوں سے بڑی آپا کی طرف دیکھا۔"

"ممی سے پوچھیں۔"

"دنیا کی ہر خوبی جہاں زیب میں موجود ہے اور ہر برائی مجھ میں۔"

"جہاں زیب میں خوبیاں ہیں تو تم کیوں جلتے ہو؟"

"میں کیوں جلوں گا میں تو آنٹی کو حقیقت بتا رہا تھا۔"

وہ حیرت سے شاہ رخ اور بڑی آپا کو دیکھ رہی تھی کیا اب بھی بڑی آپا جہاں زیب کو اس پر ترجیح دیتی ہیں۔ اور یوں واضح الفاظ میں اب وہ بچہ تو نہیں ہے۔

زوباریہ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی محرومی ملال اور دُکھ تھا۔

"آنٹی یہاں رہیں گی تو انہیں خود ہی حقیقت پتا چل جائے گی۔"

"میں نے سوچا ممکن ہے نہ پتا چلے تو میں خود ہی بتا دوں خواہ مخواہ انہیں غلط فہمی نہ ہو جا"

اس کے لہجے میں طنز اُتر آیا اور آنکھوں میں سے بھی تلخی جھانکنے لگی۔

"شاہ رُخ!" اس نے بڑے کرب سے اسے دیکھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں ابھی آئی ہوں کچھ مجھ سے میرا حال پوچھو کچھ مجھے ا

دسناؤ کیا کر رہے ہو؟ کون سی کلاس میں ہو؟ اور یہ زیب کہاں ہے؟"

"سوری آنٹی" اس نے فوراً معذرت کر لی۔

"زینب کیسی ہے؟ اسے آپ ساتھ کیوں نہیں لائیں۔"

"اس کی پڑھائی کا حرج ہوتا انشاءاللہ اگلی بار ہم ہمیشہ کے لیے آ جائیں گے۔"

"سچ!"

"ہاں!"

"ارے سچ زوبی!" بڑی آپا بھی خوش ہو گئیں۔

"ہاں آپا! سہیل کہتے ہیں کہ دو چار سال اور رہ لیں۔ اس کے بعد یہاں ہی سیٹل ہو جائیں گے۔"

"تم نے اچھا کیا اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے!"

"ہاں شاہ رُخ! تم نے بتایا نہیں کون سی کلاس میں ہو۔"

"سیکنڈ ایر میں ہوں۔"

"آرٹس یا سائنس؟"

"سائنس کہاں؟ آرٹس لے رکھی ہے اس نے وہ اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"اُس کے بجائے بڑی آپا بول پڑیں مشکل سے تو میٹرک پاس کیا ہے قسطوں میں گھومنے پھرنے سے فرصت ملے تو تب نا۔"

اس نے دیکھا شاہ رخ کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئی تھیں اور اس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ رکھا تھا۔

"شاہ رخ!" زوباریہ نے اسے دُکھ سے دیکھا۔

"یہ میں کیا سُن رہی ہوں چاند!"

"ارے اس سے کیا پوچھتی ہو میں تمہیں بتاؤں گی اس کی آوارہ گردیوں کی کہانیاں اس نے تو مجھے چھلنی کر دیا ہے اور اگر جہاں زیب نہ ہوتا میں تو مر ہی جاتی۔"

"ممی! آنٹی سفر کر کے آئی ہیں۔"

شاہ رخ نے دبے لہجے میں کہا تو زوباریہ نے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو رہی

تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود پر بہت جبر کر رہا ہو۔

"جاؤ بیٹا! جہاں زیب کو بلا لاؤ۔"

اُس نے بڑی آپا کا دھیان بٹانے کے لیے شاہ رُخ کو وہاں سے ہٹا دیا اور خود بڑی آپا باتیں کرنے لگی۔

اسے آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے لیکن شاہ رخ سے تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی صبح ن پر اور رات کھانے پر ہی دکھائی دیتا تھا نہ جانے کالج سے آ کر کہاں چلا جاتا تھا بڑی آپا رخ کے متعلق اتنی باتیں کی تھیں کہ زوباریہ نے سوچا تھا کہ کسی دن اُسے پاس بٹھا کر آرام محبت سے سمجھائے گی کہ وہ کیوں اپنے آپ کو اس طرح ضائع کر رہا ہے مگر وہ ملتا ہی نہیں ناشتے پر اس نے شاہ رخ سے گلہ کیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں رہتا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج و سے آ کر کہیں نہیں جائے گا چنانچہ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں چلی آئی وہ جہاں کو گریبان سے پکڑے جھنجوڑ رہا تھا اور اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔

"مت آیا کرو میرے کمرے میں شکایتی بلے نفرت ہے مجھے تم سے۔"

اس نے جہاں زیب کو دھکا دیا۔

"شاہ رخ بیٹا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ بھائی سے لڑ رہے ہو۔"

"آنٹی!" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"یہ میری چیزیں چھیڑتا ہے اور صبح اس نے ممی سے میری جھوٹی شکایت لگائی ہے۔"

"جھوٹی شکایت تھی وہ؟"

جہاں زیب نے اُسے گھورا۔

"کیا تم منزہ آنٹی کے ہاں نہیں گئے تھے۔"

"گیا تھا اور اچھا کیا تھا دس بار جاؤں گا بلکہ ہزار بار جاؤں گا تم جو دل چاہے کر لو اور آیندہ اگر تم میرے کمرے میں آئے تو قتل کر دوں گا تمھیں۔"

"اور وہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہی۔ وہ جو بچپن میں اتنا شائستہ اتنا سلجھا ہوا ہو وقت کیسے جاہلوں کی طرح باتیں کر رہا ہے۔ تم بڑے ہو شاہ رخ بیٹے کبھی بڑے بھائی بھی بھائیوں سے لڑتے ہیں اور تمھیں تو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"ممی جو ہیں ہر وقت اس کا خیال رکھنے والی اور مجھے نفرت ہے اس سے میرا بس چلے تو!"

"شاہ رخ بیٹے! یہ رشتے بازاروں میں نہیں ملا کرتے میری جان! اتنے پیارے رشتوں سے اتنی نفرت۔"

"میرا اس میں قصور نہیں ہے آنٹی یہ نفرت ممی نے پیدا کی ہے ہر وقت اس کی تعریف کر کر کے اور میری برائی کر کے پہلے وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اسے ذرا سی تکلیف ہوتی تھی تو میں بے چین ہو جاتا تھا اسکول میں کھیلتے ہوئے وہ گر جاتا تو میں رو پڑتا تھا مگر اب میں آپ کو کیا بتاؤں آنٹی! آپ نہیں سمجھ سکیں گی میرے کرب کو چلیں کوئی اور بات کریں۔"

"میں سمجھ رہی ہوں شاہ رُخ تمھارے دل میں جو کچھ ہے بیٹا وہ مجھ سے کہو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو جو کچھ تم سوچتے ہو مجھے بتاؤ مجھے اپنا دوست سمجھو۔"

"آنٹی!" وہ آزردہ سا ہو گیا۔

"ہم دونوں بھائی ایک دوسرے کے دوست تھے مگر ممی نے ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پیدا کر دی ہے وہ میری شکایتیں لگاتا ہے ممی سے میں مانتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ ذہین ہے زیادہ پڑھاکو ہے سب انسان ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے نا! اور ممی چاہتی ہیں میں بھی اس جیسا ہو جاؤں وہ فرسٹ آتا تھا تو سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوتی تھی لیکن اب میں جلتا ہوں اس سے اور کہتا ہوں کہ نہ وہ اتنا لائق ہوتا اور نہ ممی میرا اس سے مقابلہ کرتیں اور...... Now I hate him (اب میں اس سے نفرت کرتا ہوں)"

"نہیں بیٹا! وہ تمھارا بھائی ہے تم اس سے نفرت نہیں کر سکتے تمھیں اس سے نفرت نہیں ہے یہ محض غصہ ہے اور تم سمجھتے ہو نفرت ہے۔"

"ممی سمجھتی ہیں میں نالائق ہوں میں کچھ کر نہیں سکتا آپ کو پتا ہے آنٹی میں جان بوجھ کر پیپر میں دو دو سوال چھوڑ آتا ہوں تا کہ ممی چیخیں چلائیں مجھے گالیاں دیں ڈانٹیں مجھے سائنس پسند نہیں ہے میں مصور بننا چاہتا ہوں مگر ممی بضد ہیں کہ وہ مجھے ڈاکٹر بنائیں گی ظاہر ہے جب مجھے دلچسپی ہی نہیں تھی تو میں نے فیل ہی ہونا تھا۔"

"تم وہ سب کچھ کیوں نہیں کرتے شاہ رخ جو ممی چاہتی ہیں؟"

"میں شاید ممی کی خاطر وہ سب کچھ کر ہی لیتا مگر آنٹی ممی نے مجھ سے کبھی پیار سے محبت سے

کہا ہوتا تو تب وہ تو ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ کر بات کرتی ہیں مجھے یاد نہیں کبھی ممی نے پیار سے مجھ۔ کوئی بات کہی ہو انھیں ہمیشہ یہ یاد رہتا ہے کہ جہاں زیب کو کیا کیا پسند ہے۔ لیکن انھوں نے میہ پسند کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ میں کتنا ہی بیمار ہو جاؤں ممی نے اس طرح میری تیمارداری کبھی نہیں جیسے زیب کی کرتی ہیں میری ذراسی غلطی پر وہ گھنٹوں بولتی ہیں اور زیب کی بڑی سے بڑی غلط اگنور کر دیتی ہیں کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو شوٹ کرلوں۔"

"نہیں! نہیں میری جان۔"

وہ ساری جان سے کانپ گئی۔

"ایسی غلط بات نہیں سوچتے یہ زندگی ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور ہمیں یہ حق نہیں دیا گیا کہ ہم اس میں خیانت کریں۔"

"مگر میں...... میں کیا کروں آنٹی! ممی مجھ سے محبت نہیں کرتیں جب میں یہ سوچتا ہوں'

اُس کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں بیٹا!" زوباریہ نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"ممی تم سے محبت کرتی ہیں وہ تمھاری ماں ہیں بیٹا! اور ماں اولاد سے محبت کرنے ہوتی ہے کوئی ماں اولاد سے نفرت نہیں کر سکتی ممکن ہے وہ تم سے اتنی زیادہ محبت نہ کرتی ہ زیب سے کرتی ہیں لیکن تم سے وہ محبت کرتی ہیں اتنا یقین رکھو اور غلط باتیں مت سوچا کرو

"مگر آنٹی!"

"میری بات کا یقین کرو شاہ رُخ! اگر انھیں تم سے محبت نہ ہوتی تو وہ تمھارے لیے نہ ہوتیں۔ آدمی جن سے محبت کرتا ہے انھی کے مستقبل کے لیے فکرمند ہوتا ہے انھی کے۔ا کا خواہاں ہوتا ہے۔"

"جی!"

"تو پھر بیٹا ممی کو تنگ نہ کیا کرو جو وہ کہتی ہیں ایسا ہی کیا کرو اِدھر اُدھر بیکار مت پھ زیب کے ساتھ پیار سے محبت سے بات کیا کرو اور ہاں یہ منزہ آنٹی کون ہیں؟"

"میرے ایک دوست کی ممی ہیں اتنی اچھی ہیں وہ کہ میں آپ کو کیا بتاؤں مجھے سگے طرح چاہتی ہیں۔ گھر میں کوئی خاص چیز پکائیں تو میرے لیے ضرور رکھتی ہیں۔ اور ممی

کیوں ان سے اتنی چڑ ہے اگر میں ان کے گھر چلا جاؤں تو بس یونہی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہیں اور میں پھر جان بوجھ کر ادھر جاتا ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے آنٹی آدمی محبتوں کا بھوکا ہوتا ہے مجھے جہاں سے محبت ملے گی میں وہاں ہی جاؤں گا ممی خواہ کچھ بھی کہیں مجھے گھر سے ہی کیوں نہ نکال دیں میں منزہ آنٹی کے گھر جانا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مگر بڑی آپا کیوں چڑتی ہیں تمھارے وہاں جانے سے؟"

"وہ دراصل۔"

اس کے رخسار سُرخ ہو گئے۔

"ممی کی سوچ بڑی غلط ہے اُن کی ایک ہی بیٹی ہے بی اے میں پڑھتی ہے یقین کریں آنٹی میں نے آج تک اُسے دیکھا بھی نہیں ہے پھر وہ عمر میں مجھ سے بڑی ہو گی اور ممی سمجھتی ہیں کہ میں اس کے لیے اُدھر جاتا ہوں۔"

"اوہ نہیں!" زوباریہ کو دکھ ہوا۔

"یہ بڑی آپا کی سوچ اتنی غلط کیوں ہے؟ وہ ابھی بچہ ہے اور اس کی عمر ان باتوں کی تو نہیں ہے یہ تو ذہن کو جان بوجھ کر خراب کرنے والی بات ہے۔"

"اور یہی بات جب اس نے بڑی آپا سے کی تو انھوں نے یوں اُسے دیکھا جیسے وہ کوئی کم عمر سمجھ لڑکی ہو۔"

"تجھے نہیں پتا زوباریہ کتنا بگڑ چکا ہے تو اس کی معصوم صورت پر نہ جا تجھے میں اب کیا کیا اؤں؟ تم چند دنوں کے لیے آئی ہو کتنے زخم دکھاؤں تمھیں اتنا رلایا ہے مجھے اس نے کہ اس کے پ کی موت پر بھی میں اتنا نہیں روئی تھی میرے ساتھ اس طرح بات کرتا ہے جیسے میں اس کی ں نہیں ہوں نوکر ہوں ہر وقت بھائی سے لڑنا جھگڑنا فضول خرچیاں کرنا میرا زیبی تو ایک پیسہ بھی نول خرچ نہیں کرتا سارا سارا دن باہر رہتا ہے مجھے کیا پتا کہاں کہاں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے ارے دوست آوارہ اور نکمّے ہیں اور یہ منزہ اس نے تو جادو کر دیا ہے میرے بیٹے پر! ہر وقت اسی کلمہ پڑھتا رہتا ہے جانے کیا دلچسپی ہے اس کے گھر میں اس کی۔"

"بچے پیار و محبت کے دیوانے ہوتے ہیں وہ محبت کرتی ہیں اس سے۔"

"تو نہیں جانتی زوبا! تُو نہیں جانتی تُو اپنے دل پر جاتی ہے یہاں لوگ بڑے دوغلے ہیں

اوپر سے کچھ اندر سے کچھ۔ ان کی محبتیں بھی جھوٹی اور ان کی ہمدردیاں بھی جھوٹ بنا مطلب۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا کبھی سوئیٹر بنا کر دے رہی ہیں کبھی سوٹ لا رہی ہیں میرا تو دل چا ہے کسی دن ان منزہ بی بی کی جا کر خوب خبر لوں۔"

"چھوڑیں آپا!"

وہ بیزار سی ہوگئی۔

پتا نہیں کیوں اسے آپا کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"دعا کرو زوبا میرا بیٹا سدھر جائے سیدھے راستے پر چلے۔"

اس کا دل چاہا کہ وہ ان سے کہے کہ صرف دعا تو کچھ نہیں کرتی اور اگر آپ برا نہ مانیں کہوں کہ اس کے بگڑنے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے لیکن وہ بڑی آپا کے غصے سے ڈرتی تھی اس چپ رہی اور بڑی آپا کی بات ہمیشہ کی طرح آنسوؤں پر آ کر ٹوٹی اور وہ چپ بیٹھی انھیں رو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

"ہیلو!"

"ہیلو!"

زینب نے مڑ کر دیکھا چمکتی سیاہ آنکھوں والا خوب صورت سالڑکا اس کے پیچھے کھڑا

"آپ کی تعریف!"

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میں زیب ہوں اور آپ شاید شاہ رخ بھائی ہیں۔"

"جی! آپ نے صحیح پہچانا مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے رشتوں سے ہے آپ مجھے صرف شاہ رخ کہہ سکتی ہیں۔"

"آل رائٹ"

اُس نے ہولے سے سر کو خم دیا اور اس کے لانبے براؤن بال ایک دم چہرے پر آ نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کیا اور اس کی طرف دیکھا وہ بڑی دلچسپی سے اُسے دیکھ

"آپ لوگ کب آئے؟"

"یہی کوئی ایک مہینہ پہلے"

"اوہ!" اس نے تاسف نے اُسے دیکھا۔

"مجھے خبر تک نہ ہوئی ورنہ میں جلد آنے کی کوشش کرتا آنٹی کدھر ہیں؟"

"وہ پاپا کے ساتھ گھر دیکھنے گئی ہیں ہم لوگ اب یہاں سیٹل ہو رہے ہیں۔"

"ویری گڈ۔"

"وہ وہیں ایک طرف میز کے کونے پر ٹک گیا۔"

"آنٹی کیسی ہیں؟"

"فائن!" وہ مسکرائی۔

"ممی آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں اور آپ کے لیے پریشان ہو رہی تھیں آپ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ آنٹی کو بھی نہیں پتا تھا۔"

"آپ نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے ہیں۔"

اس کی نگاہیں اب بھی زینب کے چہرے پر تھیں۔

"میں بھی آنٹی کو بہت یاد کرتا تھا اکثر جب بھی۔" اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے دھواں دھواں سی ہوئیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

"اور میں مری گیا ہوا تھا ایک نمائش تھی وہاں تصویروں کی وہ دیکھنے اور پھر وہاں سے ہی ہم کچھ دوست سوات چلے گئے سوات سے واپسی پر میں کچھ دن کے لیے لاہور چلا گیا ایک انٹرویو تھا وہاں نوکری کے سلسلے میں۔"

"پھر کیا ہوا نوکری ملی؟"

"نہیں!" اس نے قہقہہ لگایا۔

"نوکری بھی قسمت والوں کو ملا کرتی ہے اور ہم ازلی بدنصیب!"

"خدا نہ کرے۔"

زینب نے ہمدردی سے اُسے دیکھا زوباریہ سے شاہ رخ کے متعلق اسے کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا اور وہ اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتی تھی۔

"آپ کی کوالیفیکشنز کیا ہیں؟"

"کیا کریں گی میری کوالیفیکشینز جان کر ایک ماہ میں ممی نے آپ کو مجھ سے بہت اچھی طرح متعارف کروا دیا ہوگا۔"

"آنٹی نے تو کچھ نہیں کہا آپ کے متعلق۔"

"اچھا!"

اس نے اپنی آنکھوں کو حیرت سے پھیلایا۔

"کمال ہے۔"

"زینی، زینی، بھئی تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔"

"جہاں زیب اسے پکارتا ہوا اندر آ گیا پھر شاہ رخ کو دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ اوہ تو آ تشریف لے آئے۔"

"جی! آپ کو کوئی اعتراض۔"

"جی نہیں مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بائی داوے آپ تھے کہاں اتنے دنوں سے"

"تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور تمھیں مجھ سے باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

شاہ رخ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں اور آنکھوں میں انجانا سا غصہ اور نفرت بل کھ لگی تھی لمحہ بھر وہ جہاں زیب کو غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر باہر نکل گیا۔

"زیب! تمھیں اس طرح بڑے بھائی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"لیو اٹ زینی! خواہ مخواہ موڈ خراب ہو گیا چلو دیر ہو جائے گی۔"

پتا نہیں کیوں اب زینی کا دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو مگر جہاں زیب اس کی وجہ سے سے چھٹی کر کے آیا تھا اور وہ اس کی خوشی غارت کرنا نہیں چاہتی تھی پتا نہیں کیوں ایک دم ا کے دل پر بوجھ سا آ گرا تھا۔

"زینی! یہ جو شاہ رخ ہے نا اس سے ذرا بچ کر رہنا۔"

جہاں زیب نے اسے تنبیہہ کی۔

"ہے تو میرا بھائی! لیکن بڑا فلرٹ ٹائپ لڑکا ہے اب میں تمھیں کیا بتاؤں سینکڑوں کی گرل فرینڈز ہیں۔"

"یہ تعداد کچھ کم نہیں ہو سکتی زیب بھائی۔" وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے داب کر مسکرائی

"میری مراد سینکڑوں سے بے شمار ہے۔"

"اچھا!"

وہ اس کے وضاحت کرنے پر کھل کر ہنس دی۔

جہاں زیب بعض اوقات بالکل سادہ اور معصوم سا لگتا تھا یقین نہیں آتا تھا کہ اس لڑکے نے کمپیوٹر انجینئرنگ میں ٹاپ کیا ہوگا۔

"یقین کرو زینی! یہ جب میٹرک میں تھا تب بھی اس کی چھ سات گرل فرینڈز تھیں اور یہ سب کو یقین دلایا کرتا تھا کہ بس وہی صرف اس کی فرینڈ ہے۔"

"اور تمھاری کتنی گرل فرینڈز ہیں زیب۔"

"میری!" اس کی کان کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔

بلیوز می مجھے...... مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ زینب دلچسپی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا تمھارا کیا خیال ہے زیب کہ شاہ رخ مجھ سے بھی فلرٹ کرنے کی جرات کر سکتا ہے"

"پتا نہیں...... میں نے تو بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔"

"دیکھو زیب۔"

زینب سنجیدہ ہو گئی۔

"تمھیں مجھ سے اس کے بارے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی بہر حال میں کوئی کم عمر یا ان امیچور لڑکی نہیں ہوں میں نے اپنی عمر کے بیس سال امریکہ جیسے ملک میں گزارے ہیں اور میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کس طرح کے لوگوں سے کیسے ٹریٹ کرنا ہے اور وہ میرا سگا خالہ زاد ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمھاری یا آنٹی کی نظر میں کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو رشتوں کا احترام کرنا جانتا ہوگا۔"

"سوری زینی تمھیں شاید بُرا لگا۔"

"جہاں زیب نے فوراً معذرت کر لی۔"

"مگر تم یہاں رہو گی نا تو خود ہی سب کچھ جان لو گی۔"

اور جب وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے شاہ رخ کے کمرے کے پاس سے گزرے تو اچانک ہی زینب کی نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی تھی شاہ رخ ادھر ہی دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں ...نا غصہ

اتنی نفرت اتنی تلخی بھری تھی اس کی آنکھوں میں کہ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں اور زیب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اور جب وہ واپس آئی تو وہ زوباریہ کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا اور زوباریہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"زینی تم آ گئیں بیٹا! میرے بیٹے سے ملیں یہ شاہ رخ ہے۔"

"جی ممی!"

وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی شاہ رخ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اس نے ایک قہر آلودہ نظر جہاں زیب پر ڈالی اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"زیب بیٹا! بیٹھ جاؤ تم بھی کھڑے کیوں ہو؟"

"نہیں آنٹی! اب ذرا آرام کروں گا بہت تھک گیا ہوں ساحل سمندر پر لیکن جتنا لطف آج آیا ہے کبھی نہیں آیا تھا۔"

"اچھا! زینی تم بھی خوش ہوئیں سمندر پر جا کر۔"

"جی ممی!"

اس نے کن اکھیوں سے دیکھا شاہ رخ کی پیشانی پر لکیروں کا جال بنا ہوا تھا اور وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔

"اچھا آنٹی! اب رات کھانے پر ہی ملاقات ہو گی۔"

جہاں زیب نے ایک مسکراتی ہوئی نگاہ شاہ رُخ پر ڈالی اور وہاں سے چلا گیا۔

"بیٹے! یہ زینی سے پوچھو میں تمھیں وہاں کتنا یاد کرتی تھی ہم ماں بیٹی اکثر تمھاری باتیں کرتی تھیں میں اسے تمھارے بچپن کی باتیں بتایا کرتی تھی۔"

"تھینک یو آنٹی!"

وہ بہت سنجیدہ اور کم گو لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا! تم بہت چُپ چُپ سے ہو اتنی دیر سے تم نے مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی"

"مجھے آپ کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا اچھا لگ رہا تھا بہت سکون مل رہا تھا مجھے ایسی اپنائیت کبھی نہیں ملی مگر اس نے جہاں زیب نے آ کر......"

اس نے دانستہ زینب کا نام نہیں لیا۔

"اوہ تو یوں کہیں شاہ رخ بھائی میں چلی جاتی ہوں آپ مزے سے اپنی آنٹی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جائیے۔"

"نہیں! آپ بیٹھیں بس اس جہاں زیب کو بچپن سے ہی میری خوشیوں سے چڑ ہے۔"

"بُری بات بیٹے! ایسے نہیں کہتے بھائی ہے وہ تمھارا"

"سوری آنٹی!"

وہ ایک دم بہت مودب اور شائستہ لگ رہا تھا پہلے سے بہت مختلف۔

"ممی! آپ کو گھر کیسا لگا؟"

زینب نے پوچھا۔

"بہت اچھا گھر ہے چھوٹا ہے لیکن ہمارے لیے بہت ہے۔"

"بس دو چار دنوں میں تمھارے پپا کہہ رہے تھے کہ کچھ دن لگ جائیں گے۔ رنگ وروغن وغیرہ میں۔"

"آپ چلی جائیں گی آنٹی؟"

شاہ رُخ نے چونک کر انھیں دیکھا۔

"ہاں بیٹے! اب جانا تو ہے نا ایک مہینہ ہو گیا ہے تمھارے گھر آئے ہوئے اور تم نہ جانے کہاں تھے؟"

"اب آپ پاکستان میں رہیں گی نا! آپ نے گھر کہاں لیا ہے؟"

"قریب ہی ہے تم آیا کرنا ہمارے گھر۔"

"میں؟" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"آپ تنگ آ جائیں گی۔"

"بھلا بیٹوں کی آمد سے بھی کوئی تنگ ہوتا ہے۔"

زوباریہ نے پیار سے اس کی پیشانی پر آئے بالوں کو پیچھے کیا۔

"بیٹے! تم نے بتایا نہیں تم ایک ماہ سے کہاں تھے؟"

"آنٹی! میں نوکری کی تلاش میں تھا۔"

"تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ تم......"

"آنٹی پلیز امی کی بات مت کریں مجھ سے وہ جو کچھ کہتی ہیں صحیح کہتی ہیں اور میں جو کچھ ہوں صحیح کرتا ہوں اپنے اپنے نقطہ نظر میں ہم دونوں صحیح ہیں پلیز آنٹی آپ مجھ سے اس موضو بات نہ کریں بہت دنوں بعد میں ریلیکسیشن محسوس کر رہا ہوں تو پلیز۔"

"ٹھیک ہے لیکن بیٹا! میں تم سے بات ضرور کروں گی آج نہیں پھر کبھی سہی۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کیا بات کریں گی لیکن اب سب کچھ بیکار ہے آپ کا سمجھانا سب بے فائدہ ہے میں نے جو کچھ بننا تھا میں بن چکا ہوں اچھا یا بُرا آپ نے میرے بار جتنا سنا ہے میں شاید اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں بہت بُرا ہوں اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں کوئی افسوس نہیں ہے اس لیے کہ میں ویسا ہی بنا ہوں جیسا ممی نے مجھے بنانا چاہا ہے۔"

اس کی آنکھیں ایک دم جلنے سی لگی تھیں اور لمحہ بھر پہلے اس کے چہرے پر جو پُرسکون ثر تھا۔ اب اس کی جگہ عجیب سی محرومی نے لے لی تھی جیسے یہ شخص ساری زندگی تنہا سے اور شفقتوں سے خالی زینب کا دل ایک دم کٹنے لگا۔

"آپ بیٹھیں نا کھڑے کیوں ہو گئے؟ ہم کتنے سارے سالوں بعد ملے ہیں۔ کوئی ا بات کریں آپ میرے فرسٹ کزن ہیں اور ممی آپ کو اتنا چاہتی ہیں اور وہاں نیو جرسی آپ کا اتنا ذکر کرتی تھیں کہ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ آپ کو وہ مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔"

زینب نے خوش گوار انداز میں موضوع بدل دیا۔

"اچھا!"

"اس کے چہرے کی کرختگی میں پھر نرمی اُتر آئی اس نے پُر وقار نظروں سے زوبا طرف دیکھا۔"

"سوری آنٹی! آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟"

"نہیں میری جان! بھلا مائیں بھی کبھی بیٹوں سے ناراض ہوئی ہیں۔"

اور زینب کو اس سے......وہ بالکل چھوٹا سا بچہ لگا۔ ذرا سی بات پر خفا ہونے اور ذرا پر ہی مان جانے والا معصوم سا بچہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ تئیس چوبیس سال کا میچور مرد ہے۔

"آنٹی!"

اس نے اپنی باہیں ان کے گلے میں حمائل کر لیں۔

میں آپ کے گھر روز آیا کروں گا۔

زینی کو بُرا تو نہیں لگے گا۔

"نہیں مجھے کیوں بُرا لگے گا۔"

"واقعی!"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں!"

"آنٹی مجھ سے محبت کریں گی تو آپ جلیں گی تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

اور اُسے ہنستی ہوئی وہ بہت اچھی لگی۔

"آنٹی! آپ امریکہ کیوں چلی گئی تھیں پتا نہیں آپ یہاں رہتیں تو میں..

اس کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"زیب نے بتایا تھا آپ تصویریں بہت اچھی بناتے ہیں۔"

زینب نے اس کی آنکھوں میں کروٹیں لیتے درد کو محسوس کر کے بات بدل د

"تصویریں! زیب نے بتایا تھا؟"

"ہاں!"

"زیب نے اور بھی بہت کچھ بتایا ہو گا آپ کو؟"

"نہیں تو۔"

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"اِدھر میری طرف دیکھ کر بات کریں۔"

زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں ملال اور غصہ دونوں گھل مل گئے تھے۔

"بہت تعریفیں کی ہوں گی میری" وہ زور سے ہنسا۔

"اور وہ ہر نئے ملنے والے سے میری بہت تعریفیں کرتا ہے۔" اس نے زینب کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں ہے رتی بھر بھی نہیں وہ پھر کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا

کمرے سے باہر نکل گیا۔

زوباریہ تاسف سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”آپا نے اس کی شخصیت مسخ کر دی ہے کتنا پیارا بچہ تھا بچپن میں کتنا سلجھا ہوا ہوتا تھا۔“

زینی! انھوں نے خاموش بیٹھی زینب کی طرف دیکھا۔

”کبھی کبھی ہم اپنی کم علمی اور ناعاقبت اندیشی میں کتنا بڑا نقصان کر لیتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی کہ اس نقصان میں سراسر ہمارا اپنا ہاتھ ہے اور ہم یونہی مقدر کو برا بھلا کہتے ہیں ہم اپنی کتنی قیمتی اور عزیز چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر لیتے ہیں۔لیکن کاش! ہم اس کا ادراک رکھتے کاش! ہم جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟“

”مگر ممی! شاہ رخ بھائی بھی تو بڑے ضدی سے ہیں جہاں زیب بتا رہا تھا کہ وہ آنٹی کو بہ تنگ کرتے ہیں ضد میں آ کر وہی کرتے ہیں جس سے آنٹی منع کرتی ہیں۔“

”مگر بیٹا! یہ ضد اس کے اندر کیوں پیدا ہوئی ہے؟ تم اس پر بھی غور کرو نا! پتا نہیں کیا با ہے بیٹا شاہ رخ سے مل کر میں خوفزدہ سی ہو گئی ہوں ڈر سی گئی ہوں جیسے یہ لڑکا کسی دن کچھ کر۔ جیسے آپا۔کو کسی دن بھاری صدمہ اٹھانا پڑے گا۔نہیں زینی ایسا نہیں ہونا چاہیے آپا۔اس کی جا برداشت نہیں کر پائیں گے۔مگر جانے اس کی آنکھوں میں کیا ہے جیسے اسے کسی کی پروانہ رہی جیسے اس دنیا میں کوئی اس کا اپنا نہ ہو اور جب یہ احساس کسی کے دل میں راسخ ہو جائے تو پھر ز اس کے لیے مشکل اور موت آسان ہو جاتی ہے۔“

”پھر؟“ زینب خوفزدہ سی ہو گئی۔

”آپ کا مطلب ہے کہ شاہ رخ بھائی کسی دن خودکشی کر لیں گے۔“

”شاید۔“

زوباریہ کو اپنی روم میٹ کا کزن یاد آ گیا وہ بہت ذہین مگر حساس لڑکا!

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ذرا شاہ رخ کی طرف جا رہی ہوں تم ذرا کچن میں جا کر آپا کی مدد کر آؤ۔“

اور زینب کچھ سوچتی ہوئی زوبادیہ کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

پھر بہت سارے دن گزر گئے وہ نئے گھر کو سیٹ کرنے میں مصروف رہی اور اس دوران اسے شاہ رخ کا خیال تک نہ آیا وہ کبھی کبھار شام کو آتا تھا اور زوباریہ کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔جہاں زیب اور بڑی آپا بھی آئیں زیب اس کے کمرے میں بھی آیا تھا اور یہ جان کر کہ شاہ رخ اکثر آتا ہے۔اس نے ایک بار پھر زینب کو تنبیہہ کی تھی کہ وہ انتہائی فلرٹ آدمی ہے اور اسے محتاط رہنا چاہیے جہاں زیب نے اُسے شاہ رخ کے متعلق اور بھی بہت کچھ بتایا تھا۔

”تمہیں نہیں پتا زینی شاہ رخ کس کس طرح ممی کو رُلاتا اور تڑپاتا ہے۔“

”مگر تم نے کبھی غور کیا زیب وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟“

”پتا نہیں مگر وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔“

اور زینب نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا بڑی آپا۔اور جہاں زیب کی باتوں نے شاہ رخ کی جو تصویر بنائی تھی وہ انتہائی قابل نفرت تھی لیکن پتا نہیں۔کیوں اُسے شاہ رخ سے ذرا بھی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ اُلٹا اس کے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اور وہ جب بھی فارغ ہوتی غیر ارادی طور پر شاہ رخ کے متعلق سوچتی رہتی۔اس روز بھی وہ اپنے کمرے کی سیٹنگ کر کے مدھم مدھم دھوپ میں کرسی بچھائے۔آنکھیں موندے اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔اسے شاہ رخ کی نفسیات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔پتا نہیں اس کا اصل مسئلہ کیا تھا بہت سے گھروں میں بچوں کے ساتھ ایسا مسئلہ رہتا ہے لیکن وہ ایسے تو نہیں بن جاتے شاہ رخ کی طرح وہ اید بھی تو تھا۔

اُسے اچانک ہی نوید کا خیال آ گیا۔ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔حالانکہ اُس کے ممی اور ی دونوں کا ہی رویہ اُس کے ساتھ کچھ صحیح نہیں تھا وہ اس کی نسبت دوسرے بہن بھائیوں سے دہ پیار کرتے تھے۔خاص طور پر نوید کے پاپا اُس کے بھائی کو زیادہ چاہتے تھے اُسے یاد آیا کہ اع شروع میں جب نوید سے اُس کی واقفیت ہوئی تھی تو وہ مرجانے اور زہر کھانے کی باتیں کرتا لر پھر وہ اُن کے گھر آنے لگا۔وہ اور زوباریہ دونوں ہی اُس کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اُس بعد سے ہی اُس کی شخصیت میں ایک نکھار سا آ گیا تھا اور اُس میں خود اعتمادی سی پیدا ہو گئی تھی لکہ وہ پہلے بہت خاموش طبع تھا شاید یہ سارا کمال اُس محبت کا تھا جو زوباریہ نے اُسے دی تھی

ب خدا جانے وہ کہاں ہوگا لیکن جہاں کہیں بھی ہوگا یقیناً کسی بڑی پوسٹ پر ہوگا جب وہ یہ سے جا رہا تھا تو کتنا اداس تھا اور اُس نے زوبا ریہ سے بار بار کہا تھا۔

''میں آپ کی محبت اور خلوص کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور یہ خلوص اور محبت زندگی کی ہر کٹھ میں میری راہنمائی کریں گے۔''

شاید......شاید شاہ رُخ صحیح کہتا ہے کہ اگر ممی یہاں ہوتیں تو وہ......اس شاہ رُخ سے مختلف ہوتا جواب ہے۔

کیا اب..........اب اس عمر میں بھی محبت سے پیار سے خلوص سے اس کی زندگی ۔ کو موڑا جا سکتا ہے۔

اُس نے آنکھیں موندے موندے سوچا۔

شاید اور کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔

اُس نے پورے خلوص سے سوچا اور ایک مدھم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آ کر مع ہوگئی اور شاہ رُخ جو کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا اور ذرا سے فاصلے پر کھڑا پُر شوق نظروں سے اُ رہا تھا ایک قدم دو قدم آگے بڑھ آیا۔

''ہیلو۔''

اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور شاہ رخ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''ارے آپ کب آئے؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''بیٹھیں۔''

''ابھی!''

شاہ رخ نے بیٹھتے ہوئے کہا اس کی نگاہیں زیبی کے چہرے پر تھیں اور آج اس کی میں وہی پہلے روز والی چمک تھی۔

''کیا شغل ہے آج کل آپ کا؟''

''ہم بے کار بندے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''آپ سنائیں آپ کو فرصت مل گئی۔''

''ہاں سب سیٹنگ ہوگئی ہے میں نے کو دساری سیٹنگ کی ہے آپ نے دیکھی

کو؟''

''آپ نے کی تو اچھی ہوگی میں تو ایک بے ترتیب سا بندہ ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں ہے ان سب کا۔''

''چلیں میں آپ کو پہلے اپنا کمرہ دکھاتی ہوں آف وائٹ اور نیوی بلو کا امتزاج ہے۔''

پھر وہ اسے ساتھ لیے ہر کمرہ دکھاتی پھری اور وہ دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا اور دیکھتا رہا کبھی کبھی وہ رُک کر اسے دیکھنے لگتا تھا۔

''آپ کو مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا؟''

جب وہ سارا گھر دیکھ کر واپس لان میں آئے تو اُس نے پوچھا۔

''کیوں بھلا مجھے آپ سے کیوں ڈر لگے گا۔''

''آپ گھر میں اکیلی ہیں آنٹی بھی نہیں ہیں اور میں کوئی اچھا بندہ نہیں ہوں۔''

زینب نے بڑے دکھ سے اُسے دیکھا۔

''آپ میرے سگے خالہ زاد ہیں شاہ رُخ! اور یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں ممی آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں اور وہ غلط تو نہیں کہتیں اور پھر یہ فیصلہ کرنا تو دوسروں کا کام ہے کہ کون اچھا ہے یا بُرا۔''

زینب کو اتنی سنجیدگی سے بات کرتے دیکھ کر وہ ذرا سا نادم ہو گیا اور اُس نے سوچا کہ شاید اسے کچھ معلوم نہیں ۔اور حیرت ہے۔کہ جہاں زیب نے اس سے میرے متعلق کوئی بات نہیں کی حالانکہ وہ نوشی صرف چند دن کے لیے آئی تھی اور جہاں زیب نے اُسے میرے سارے رومانس کی کہانیاں سنا ڈالی تھیں اور وہ مجھے دیکھتے ہی ایسی بھاگتی تھی جیسے میں اسے کچا ہی کھا جاؤں گا۔

''بیوقوف لڑکی!''

نوشی کے خیال سے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔اور اُسے مسکراتے دیکھ کر زینب ی مسکرا دی۔

''آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

اور پھر چائے پیتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے زینب اُسے اپنی ممی پاپا کی باتیں تی رہی اور وہ نہایت دلچسپی سے سنتا رہا چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔

حتیٰ کہ زوباریہ آ گئی اور اسے وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

''ارے میرا بیٹا آیا ہے۔''

انہوں نے اُس کی پیشانی چومی تو اُس نے مڑ کر کھلنڈری نظروں سے زینب کی طرف دیکھا

''دیکھ لیں میں آپ کی محبت میں حصہ دار بن گیا ہوں غصہ تو نہیں آتا؟''

''نہیں میرا دل بڑا غنی ہے آپ بے شک میرے حصے کی ساری محبت لے لیں۔''

''سچ کہہ رہی ہیں آپ؟''

''ہاں۔''

''سنا آنٹی! آپ نے۔''

''ہاں شاہ رخ! میری بیٹی کا دل سچ مچ بڑا غنی ہے اور یہ بالکل میرے جیسی ہے۔''

''اچھا۔''

اُس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور آج پہلی بار زینب نے غور کیا کہ وہ جہاں زیب سے کہیں زیادہ خوبرو تھا لیکن وہ جو ہر وقت غصے سے اُس کے ماتھے پر بل پڑے رہتے تھے اس وجہ سے نگاہ اُس کے چہرے کے حُسن پر پڑتی ہی نہ تھی۔

''زینب! آج میں اپنے بیٹے کی پسند کی چیز پکاؤں گی اپنے ہاتھوں سے۔''

زوباریہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا! تمہیں کیا پسند ہے؟''

''آنٹی! آپ کے ہاتھ کی پکی ہوئی ہر چیز مجھے پسند ہے۔''

پتا نہیں کیوں اس کی آواز بھاری ہوگئی۔

''اور اتنی محبت سے تو اگر کوئی زہر بھی مجھے دے گا تو ہنستے ہوئے پی لوں گا۔''

''خدا نہ کرے ایسی فضول باتیں مت کیا کرو۔''

زوباریہ نے کانپ کر کہا۔

''انہیں فضول باتیں کرنے کا شوق ہے ممی۔''

زینب نے آہستگی سے کہا مگر اُس نے سُن لیا اور مسکرا دیا۔

''فضول باتیں کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے بڑا سکون ملتا ہے۔''

''آپ کی ہر منطق نرالی ہے۔''

زوباریہ نے انہیں باتیں کرتے دیکھا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا تم دونوں باتیں کرو میں کچن میں جاتی ہوں۔''

''ممی میں آپ کی ہیلپ کروں۔''

زینب نے پوچھا۔

''نہیں میری جان تم بیٹھو میں خود بناؤں گی اپنے بیٹے کے لیے کوفتے اور شامی کباب بچپن میں بہت شوق سے کھاتا تھا اور فرمائشیں کرتا تھا آنٹی تو فتے بناؤ۔''

''آپ کو میرے بچپن کی ہر بات یاد ہے آنٹی؟''

شاہ رخ نے حیرت سے پوچھا۔

''جن سے محبت ہوتی ہے جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں اُن کی ہر بات یاد ہوتی ہے۔''

''میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی مجھ سے! مجھ سے بھی محبت کرتا ہے کوئی میرا اپنا۔''

''تم سے سب محبت کرتے ہیں شاہ رخ! میں تمہاری ممی اور جہاں زیب سب۔''

''ہوں!'' وہ تلخی سے مسکرا دیا۔

اب بھلا آنٹی کو کیا خبر کہ کون مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے اور بتانے کا فائدہ بھی کیا خواہ مخواہ وہ دکھی ہوں گی۔ ورنہ دل چاہتا ہے کہ کسی دن اپنا سینہ چیر کر اُن کے سامنے رکھ دوں اور سارے گھاؤ سارے زخم اُنہیں دکھاؤں۔ انہیں کیا خبر کہ میری راتیں...... اور میرے دن کیسے گزرے ہیں اور میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو کتنا تنہا اور کتنا اکیلا جانا ہے۔ اور شاید اس لیے میں نے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا ایسا راستہ جو ممکن ہے صحیح نہ ہو مگر۔

''کیا سوچنے لگے؟''

زینب نے اُسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چونک پڑا۔

''شاید کوفتوں اور شامی کبابوں کے خیال سے منہ میں پانی آ رہا ہے۔''

''ہاں'' وہ ہنس دیا مگر اس کے دل پر اچانک ...... ہی بوجھ سا آ گرا تھا اتنی محبتوں سے وہ برا سا گیا تھا...... یکا یک وہ بیزار سا ہو گیا اُس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر چلا جائے مگر پھر آنٹی کی

دل شکنی کے خیال سے وہ دل پر جبر کیے بیٹھا بے دلی سے زینب کی باتیں سنتا رہا۔

☆☆☆

سمندر سے کہیں پیاسے کو شبنم نہیں ملتی اور کہیں سیلاب بستیاں ڈبو دیتے ہیں۔

شاہ رُخ نے کھڑکی میں جھکے جھکے سوچا۔ وہ بڑی دیر سے ممی کو جہاں زیب کے سر میں پیا سے مالش کرتے دیکھ رہا تھا اور وہ تین دن سے بخار میں پھنک رہا تھا لیکن ممی کو خبر تک نہ تھی ابھ تھوڑی دیر پہلے اُس کا کتنا دل چاہا تھا کہ کوئی نرم نرم ہاتھوں سے اُس کا سر دبائے کتنا بھاری ہو تھا سر مگر ممی کو تو یہ تک پتا نہیں کہ اُسے بخار ہے پھر اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ زوباریہ آنٹی کی طرف جائے اور اسی خیال سے وہ اُٹھا تھا لیکن پھر اُس نے ارادہ بدل دیا تھا بہت دنوں سے اُسے ا۔ اندر ٹوٹ پھوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ بدل رہا تھا ہولے ہولے اندر ہی اندر جیسے محبت اُسے پگھلا رہی تھیں زینب اور زوباریہ آنٹی کی محبتیں۔

”نہیں!“

اُس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

یہ بہت غلط بات ہے کہ میں پگھل رہا ہوں وہ تو صرف جہاں زیب کو شکست دینے کے اُسے نیچا دکھانے کے لیے زینب کی طرف متوجہ ہوا تھا اُس کا خیال تھا کہ وہ زینب کے ساتھ دوسری لڑکیوں کی طرح ہی سلوک کرے گا لیکن پھر پتا نہیں کب پتا نہیں کیسے زینب نے اُس دل کے اندر کہیں گہرائی میں اپنی جگہ بنالی تھی اور اُسے خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ پتا بھی نہ چلا تھا سمجھ رہا تھا کہ وہ جو ہر روز زینب سے ملنے جا رہا ہے اور وہ دو تین تین گھنٹے اُس سے گپیں لگا تا محض جہاں زیب کو جلانے کے لیے جس نے اُسے تنبیہہ کی تھی کہ وہ زینب کے ساتھ فلرٹ کر کی کوشش نہ کرے۔

حالانکہ زینب اُس کی بہت ہی اچھی زوباریہ خالہ کی بیٹی تھی اور وہ اس کا احترام کرتا ایک بار بھی اُس نے اُسے غلط نگاہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن جہاں زیب کے منع کرنے پر اُسے ہوگئی تھی مگر...... یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا انکشاف ہوا تھا اُس پر کہ جہاں زیب کو ہراتے ہراتے ہار گیا تھا اور جب سے یہ انکشاف ہوا تھا وہ عجیب سے کرب سے گزر رہا تھا ایسا کرب ج توڑے جا رہا تھا۔ وہ بچپن سے شکست و ریخت کا شکار ہوتا رہا تھا ٹوٹتا پھوٹتا رہا تھا مگر یہ ک

شکست و ریخت اور طرح کی تھی جس نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

میں بھلا اُس اتنی اچھی اتنی پیاری اتنی دلکش لڑکی کے کہاں قابل ہوں؟ نہیں مجھے اس محبت کو اپنے اندر ہی دل کی گہرائیوں میں دفن کر دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہ محبت ایک تناور درخت بنے مجھے اس کونپل کو کچل دینا چاہیے...... مجھے ابھی سے یہیں سے پاٹ جانا چاہیے سو وہ چار دنوں سے زوباریہ کے گھر نہیں گیا تھا مگر ان چار دنوں میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے وہ تھک گیا تھا اور اسی تھکن نے اُسے بیمار کر ڈالا تھا۔

اُس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور کھڑکی کی چوکھٹ پر سر ٹیک دیا اور بیتے ہوئے لمحے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے یوں جیسے کوئی اُس کے دل میں چبھے تیروں کو ایک ایک کر کے باہر نکال رہا ہو وہ جو سمجھتا تھا جہاں زیب سے لڑ کر ممی سے اونچا بول کر جھگڑ کر اُنہیں دُکھ دے کر بغاوت کر کے اُس نے اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ کر لیا ہے تو کتنی غلط سوچ تھی اُس کی۔

اُس کا دل تو روزِ اول کی طرح محروم تھا کوئی اُس کا دل چاک کر کے دیکھتا تو پتا چلتا کہ سارے زخم ہرے تھے اور ساری محرومیوں کے رنگ واضح تھے کوئی زخم نہیں بھرا تھا کوئی حسرت پوری نہیں ہوئی تھی وہ محض اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا تھا کیا ملا تھا اُسے بغاوت کر کے وہی شکستگی وہی محرومی کا احساس وہی بے بسی وہی ذہن وہی دل کیا اتنے سارے برس اُس نے محض دھوکے میں گزار دیے تھے اور سمجھتا رہا تھا کہ ممی کو اذیت دے کر وہ اپنے زخموں کے لیے مرہم مہیا کر رہا ہے کتنا نادان تھا وہ اس کی بغاوت نے کیا دیا تھا اُسے؟ سب نکما بے کار فلرٹ اور جانے کیا کیا کہتے تھے کیا تھا اس کے پاس؟ نہ کوئی تعلیم نہ کوئی شخصیت اُس سے تو جہاں زیب اچھا تھا جس نے تعلیم بھی مکمل کی تھی اور اعلیٰ عہدے پر فائز بھی تھا اور وہ صرف ایم۔ اے سیکنڈ ڈویژن وہ بھی نہ جانے کیسے اُس نے کر لیا تھا۔ اور ممی کو تو یہی علم تھا کہ اُس نے ابھی تک بی۔ اے بھی کلیئر نہیں کیا اور وہ کس برتے پر زینب سے محبت کرنے چلا ہے نہیں وہ اس دلکش لڑکی کی محبت کے قابل نہیں ہے۔

اُس نے ہولے سے سر جھٹکا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا وہ مڑا باہر سے ممی کی آواز سنائی دی نرم محبت کی پھوار میں بھیگی ہوئی آواز۔

”زیب بیٹے! چندا میں دودھ میں بادام ڈال کر لائی ہوں۔ پی لو۔ اتنی محنت کرتے ہو دماغ

کمزور ہو جاتا ہے۔"

"ممی!" جہاں زیب نے لاڈ سے کہا۔

"میرا دل نہیں چاہتا ممی۔"

"پی لو میری جان!"

اور اُس کے سر کا درد یکدم شدید ہو گیا۔ اور اُسے لگا جیسے کسی نے اُس کے دل کو چیر ڈالا ہونٹ بھینچے وہ اپنے بیڈ پر گر سا پڑا تب ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

"ہیلو!"

لمحہ بھر اُسے گھورنے کے بعد اُس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"میں عنبر ہوں شاہ رُخ! تم نے اتنے دنوں سے فون نہیں کیا میں اداس ہو گئی تھی۔"

"سوری عنبر اس وقت میں بزی ہوں پھر کسی وقت فون کرنا۔"

اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج اُٹھی۔ دوسری طرف رخشی تھی۔

"اوہ! شاہ رُخ بھئی میں تم سے بہت ناراض ہوں۔" اُس کی آواز سنتے ہی رخشی نے شکوے شروع کر دیے۔ تو وہ غصّے سے چیخ پڑا۔

"مت کیا کرو مجھے فون نفرت ہے مجھے تم سب سے۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر پھینکا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"اوہ خدایا!"

اُس نے سر تکیے پر ڈال دیا اور اُس کا دل چاہا وہ رونے لگے مگر وہ بڑی مشکل سے خو پائے ہونٹ بھینچے تکیہ اپنے سر پر رکھے پڑا رہا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب روباریہ آنٹی اور کب زینی اُسے ڈھونڈتی ہوئی اُس کے کمرے میں آئی وہ تو جب زینب نے لائٹ جلا آواز دی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا زینب اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے شاہ رُخ! آپ اِس وقت اس طرح کیوں لیٹے ہوئے

"تم کب آئیں؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ابھی کچھ دیر ہوئی آپ اتنے دنوں سے آئے نہیں تھے ممی نے کہا چلو شاہ رُخ کو دیکھ آ

"آنٹی سے کہہ دو زینب! کہ مجھ سے اتنی محبت نہ کریں میں اس محبت کے قابل نہیں

عادی نہیں ہوں میں ان محبتوں کا۔"

"آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں لگتی۔"

وہ مسکرائی۔

"آپ کی آنکھیں بھی کتنی سُرخ ہو رہی ہیں۔"

شاہ رُخ نے کچھ نہ کہا بس چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ تب ہی زوباریہ اُسے پکارتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ارے بیٹا اتنے دنوں سے آئے نہیں میں سمجھ رہی تھی کہ کہیں باہر چلے گئے ہو تمہارے انکل بھی تمہیں یاد کر رہے تھے۔"

"ممی! شاہ رُخ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" زینب نے مڑ کر زوباریہ کو دیکھا۔

"کیا ہوا بیٹے؟"

زوباریہ نے آگے بڑھ کر اُس کی پیشانی کو چھوا پھر ایک دم اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"ارے تمہیں تو بہت تیز بخار ہے؟ جل رہے ہو ڈاکٹر کو دکھایا۔"

"نہیں۔" اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اوہ اتنا تیز بخار ہے حد ہو گئی لاپروائی کی! جہاں زیب آپا بھئی کہاں ہو؟ اتنا تیز بخار ہے سے اور......"

وہ چاہتا تھا آنٹی کو منع کر دے وہ شور نہ کریں اُسے کسی دوا کی اور ہمدردی کی ضرورت نہیں لیکن وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں اور وہ بے بسی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔ زینی پلیز آنٹی کو منع کر دو سولی بخار ہے اتر جائے گا جہاں زیب کو خواہ مخواہ مت بھیجیں کہیں۔

"نہیں شاہ رخ بخار بگڑ بھی سکتا ہے۔"

زینب نے اُسے سمجھایا۔

"اور آپ لیٹ جائیں۔"

"ہاں ہاں لیٹ جاؤ بیٹا جہاں زیب گیا ہے ڈاکٹر کو لینے۔"

زوباریہ بڑی آپا کے ساتھ آتی ہوئی بولی تو شاہ رُخ نے خاموشی سے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

"جانے کب سے بخار ہے؟"

زوباریہ نے بڑی آپا سے پوچھا۔

''لو مجھے کیا خبر؟ نہ مجھے اس کے آنے کی خبر ہوتی ہے نہ جانے کی مجھے کب اس نے مال
ہے اور کب اپنا جانا ہے۔''

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور آپ نے مجھے کب اپنا جانا۔ ممی بلکہ آپ نے تو ہمیشہ مجھ سے سوتیلے بیٹے کا سا سا
کیا۔'' شاہ رُخ کی بند آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں نے ہلچل مچادی مگر وہ ہونٹ بھینچے ضبط کر۔
کوشش کرتا رہا۔

زوباریہ ممی اور زینب اُس کے کمرے میں بیٹھی جانے کیا کیا باتیں کرتی رہیں لیکن وہ
الذہن سا آنکھیں موندے پڑا رہا ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک سب اُس کے کم
میں بیٹھے رہے زوباریہ ہولے ہولے نرم نرم ہاتھوں سے اُس کے سر کو دباتی رہی اور اس کا د
ہوتا رہا پگھلتا رہا اور وہ سوچتا رہا وہ تو زینب سے فلرٹ کرنے چلا تھا جہاں زیب کو ہرانا چاہا
مگر یہ کیا ہو گیا تھا کہ وہ زینب کی شخصیت کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔

زینب اُس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تو نہ تھی رخشی عنبر نادیہ رافعہ کتنی ہی لڑکیو
اُس کی فرینڈ شپ تھی لیکن ایسا جذبہ تو کسی کے لیے اُس نے اپنے دل میں محسوس نہیں کیا تھ
سے ان بیتے دنوں میں اس کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو آپ کے
سے بلانے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی اُس نے محسوس کیا تھا کہ عنبر اور رخشی وغیرہ کے ساتھ ا
رویہ تھا زینب کے ساتھ ویسا نہیں تھا بلکہ بے تکلفی کے باوجود ایک احترام سا تھا شاید یہی
ہے اسے ہی محبت کہتے ہیں اور پھر اسے سوتا سمجھ کر سب ہی...... دھیرے دھیرے اُس کے
سے چلے گئے زینب نے جاتے جاتے پلٹ کر اُسے دیکھا اور آنکھیں کھولے اپنی طرف د
وہ پلٹ آئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں'' وہ اُس کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''تم ٹھیک نہیں لگتے شاہ رُخ! بخار کے علاوہ بھی کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کر

''کیا بات ہو سکتی ہے تمہارا وہم ہے۔''

''نہیں میرا وہم نہیں ہے۔''

زینب سنجیدہ تھی۔

''تمہیں یاد ہے اُس روز تم نے کہا تھا ہم اچھے دوست ہیں اور دوستوں میں آپ جناب کا
تکلف نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاں یاد ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو شاید تمہیں یہ نہیں پتا شاہ رُخ کہ اچھے دوست ایک دوسرے سے اپنی پریشانیاں نہیں
چھپاتے''

''مگر زینی!''

''اگر کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے شاہ رخ تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی
لیکن اگر آدمی اپنی پریشانیاں اپنے دوستوں سے کہہ دے تو اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے ہو سکتا
ہے کہ میں تمہاری پریشانی دور کرنے پر قادر نہ ہوں لیکن میں تمہاری پریشانی کو شیئر SHARE تو
کر سکتی ہوں۔''

''زینی تم بہت اچھی ہو بہت اچھی دوست ہو اور میں...... میں بہت بُرا ہوں۔''

''غلط تم بہت اچھے ہو۔''

وہ مسکرائی مسکراتے ہوئے اُس کا سنہرا رنگ دمک اٹھا تھا۔

''نہیں زینی! تم کچھ نہیں جانتیں تمہیں پتا نہیں میں بہت بُرا ہوں۔''

''کیا بُرائی ہے تم میں نشہ کرتے ہو شراب پیتے ہو چوری کرتے ہو۔''

''خدا نہ کرے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''پھر؟''

''تمہارے نزدیک برائی صرف یہی ہے زینی؟''

''پتا نہیں برائی کیا ہے۔''

زینب نے اُلجھ کر اُسے دیکھا۔

"زینی میں۔"

اُس نے تکیے کا سہارا لیا اور اُس کی آنکھوں میں کوئی درد سا آ کر ٹھہر گیا۔ وہ لمحہ بھر
زینب کو دیکھتا رہا اُس کے دمکتے ہوئے سنہرے رنگ کو اس کی شفاف خوبصورت آنکھوں کو اور
کے بے حد دلکش ہونٹوں کو۔

"ابھی تم نے کہا تھا زینی کہ ہم اچھے دوست ہیں۔"

"ہاں کہا تھا!"

"تو پھر میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں آج اپنے سینے کے وہ سارے زخم دکھاؤں جو میں
کسی کو نہیں دکھائے وہ سارے دُکھ تمہارے ساتھ شیئر کروں جو میں تنہا جھیلتا رہا ہوں وہ
اعتراف تمہارے سامنے کروں جو کبھی کسی کے سامنے نہیں کیے۔"

زینی! میں نے بہت سارے دن بہت ساری راتیں اپنے کمرے میں تنہا روتے ہو
گزاری ہیں اور میرے آنسو پونچھنے کوئی نہیں آیا میں نے بڑا کرب جھیلا ہے۔ زینی بڑا درد
بچپن سے ہی بہت چھوٹی عمر سے ہی میں کرب کے سمندر سے گزرا ہوں۔ مجھے یاد ہے میں
چھوٹا سا تھا۔

"اور جب ممی کسی گھر آئے مہمان کے سامنے زیب کی تعریف کرتی تھیں اور میرے با
میں کہتی تھیں کہ میں اُس جیسا لائق اور ذہین نہیں ہوں تو میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ سی جا
میں بجھ سا جاتا تھا۔ اور پھر پتا نہیں کیوں سب کچھ میرے ذہن سے اُتر جاتا تھا ذہن کی
ایک دم صاف ہو جاتی تھی۔ زیب فر فر کوئی پوئم کوئی سورۃ سنا دیتا اور میں اٹک اٹک جاتا۔
سے زیب کو دیکھتیں۔ تو میں وہاں سے کھسک جاتا اور چپکے چپکے چھپ کر روتا۔ اور کوئی نہیں
میرے اس کرب کو سمجھتا۔"

زینی بہت انہماک سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی اور وہ ایک ایک کانٹا نکالتا جا رہا
میں ایسا ہی بن گیا زینی جیسا ممی نے کہا۔

وہ کہتی تھیں میں نالائق ہوں میں نالائق بن گیا انہوں نے کہا میں نافرمان ہوں بدتمیز
سو میں ایسا ہی ہو گیا۔

"پتا نہیں ممی کو مجھ سے اتنی نفرت کیوں تھی یہ مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کوئی ماں۔"

"نہیں شاہ رُخ تمہاری سوچ غلط ہے کوئی ماں اپنی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتی اور آنٹی بھی
تم سے بہت محبت کرتی ہیں ابھی تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے کتنی پریشان ہو رہی تھیں"

"زینی!" وہ ہولے سے ہنسا۔

"محبت اور نفرت کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں محبت پر آدمی کو نفرت کا اور نفرت پر آدمی کو
محبت کا گمان کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نہیں شاہ رُخ! آنٹی تم سے نفرت نہیں کرتیں ممکن ہے انہیں تم سے اتنی محبت نہ ہو جتنی
زیب سے ہے۔ لیکن نفرت نہیں کرتیں وہ تم سے یہ خیال دل سے نکال دو ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا ہو
جاتا ہے کہ والدین کو اپنے سارے بچوں میں سے ایک بچے سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے یہ کوئی اَن
نیچرل بات نہیں ہے۔"

تم شاید صحیح کہتی ہو زینی لیکن میں کیا کروں میرے دل میں بچپن سے ہی یہ خیال راسخ ہو گیا
ہے تم میرے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتیں زینی! کہ تم اس کرب سے گزری نہیں ہو تم نے اسے
محسوس نہیں کیا جب کسی کی موجودگی میں ممی میرا اور زیب کا موازنہ کرتی تھیں تو میں جس کرب
سے گزرتا تھا میں اُسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا توہین کا وہ احساس جو مجھے ہوتا تھا اُس نے
میری شخصیت کو توڑ پھوڑ دیا میں تسلیم کرتا ہوں کہ زیب مجھ سے زیادہ ذہین ہو گا لیکن کند ذہن میں
بھی نہیں ہوتا تھا بچپن میں کئی بار میں نے سوچا کہ میں بھی زیب کی طرح بن جاؤں اور میں نے
بڑی محنت بھی کی ممی کی ہر بات مانی لیکن پھر بھی ممی کی ایک بات سے میری ساری محنت اکارت ہو
جاتی جب وہ کہتیں بھئی زیب اور رُخ کا کیا مقابلہ رُخ تو ہے ہی نالائق اور بدتمیز پھر میں سب کچھ
بھول جاتا۔

ہولے ہولے مجھے احساس ہوتا گیا کہ میں واقعی زیب جیسا نہیں بن سکتا پھر شاید لاشعوری
طور پر میں وہی کچھ بنتا گیا جو ممی کہتی تھیں شروع شروع میں کم نمبر لے کر مجھے دُکھ ہوتا تھا ممی کو تنگ
کر کے میں گھنٹوں پریشان رہتا تھا لیکن پھر ہولے ہولے یہ سب مجھے اچھا لگنے لگا ممی روتیں تو
میں لاشعوری طور پر پُرسکون ہو جاتا۔ میں زیب کو مار کر اُس سے جھگڑ کر پتا نہیں اپنے کس جذبے کو
تسکین دینے لگا۔

اُس نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کو مسلا اور زیب کی طرف دیکھا۔

"زینب تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"نہیں تم کہتے رہو کہو جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے میں سُن رہی ہوں۔"

"میں کیا کہوں کیا کیا بتاؤں زینی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو روح کو ٹکڑے ٹکڑے کرد والے دُکھ ہیں اور بس! یہ احساس کہ ممی مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ میں زیب کی طرح نہیں ہ میں اُس جیسا نہیں بن سکتا اندر ہی اندر مجھے کچوکے لگاتا رہتا ہے میں اندر ہی روتا...... چپکے چ

پھر مجھے منزہ آنٹی ملیں وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں یوں جیسے میں اُن کا اپنا سگا بیٹا ہ مجھے اُن کے گھر میں جا کر بڑا سکون ملتا میں تمہیں کیا بتاؤں زینی کہ وہ کتنی شفیق کتنی مہربان ت میرے کان محبت بھرے لہجے سے نا آشنا تھے میرا دل صدیوں سے بنجر پڑا تھا منزہ آنٹی کی شفق اور محبت میرے بنجر دل کے لیے بارش کی پھوار کی طرح تھی مگر ممی نے۔

اُس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا ممی کو میرا وہاں جانا پسند نہیں تھا وہ خوامخو منزہ آنٹی سے چڑنے لگی تھیں پھر پتا نہیں انہوں نے منزہ آنٹی سے کیا کہا کہ منزہ آنٹی نے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا انہوں نے مجھ سے کہا۔

"شاہ رخ تم مجھے اپنے شیبی کی طرح ہی عزیز ہو تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے مرحوم بیٹے کا خ جاتا ہے۔ وہ ہوتا تو بالکل تمہارے جیسا ہوتا مگر تمہاری ممی نے بڑی غلط باتیں کی ہیں آ ہمارے گھر نہ آنا جہاں رہو خوش رہو...... اور گھر آ کر میں ممی سے بہت لڑا لیکن کیا فائدہ تھا مجھ منزہ آنٹی کی شفقت و محبت تو چھن گئی تھی نا۔"

تم تم اندازہ نہیں کر سکتیں زینی کہ میں اُن دنوں کس کرب سے گزرا تھا کیسی تکلیف برد کی میں نے کیسی اذیت سہی میں نے۔

اُس کی آنکھیں ایک دم خوں رنگ ہو گئی تھیں جیسے وہ اب بھی ایسی اذیت سے گزر رہا ہ

"اور پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر گئے اُن دنوں کا کرب میں بیان نہیں کر سکتا ک میرا دل چاہا اپنی بے مقصد زندگی کو ختم کر ڈالوں کئی بار سوچا کہیں چلا جاؤں اور پھر پلٹ کر نہ اُن دنوں مجھے لگتا تھا جیسے میں آگ کے سمندر پر برہنہ پا چل رہا ہوں اور پھر ایک دن اسی و میں گھر سے نکلا ارادہ تھا کہ خود کو سمندر کی لہروں کی نذر کر دوں مگر پھر وہاں مجھے رافعہ ملی اُس یوں ہی مجھ سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور مجھے اُس سے باتیں کرنا اچھا لگا اُس نے مجھ

تم مجھے اچھے لگے ہو اور یوں میں نے اُس سے دوستی کر لی جب میں واپس گھر آیا تو میری وحشت کچھ کم ہو گئی تھی رافعہ اکثر مجھے فون کرتی تھی۔"

ممی کو پتا چلا تو انہوں نے رافعہ کو بہت ڈانٹا مگر مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی جب آدمی کو گھر سے محبت نہ ملے تو وہ باہر محبتوں کی تلاش کرتا ہے رافعہ کوشی ایمی بہت سی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں میں بہت بُرا ہوں زینی! بہت بُرا۔

"نہیں شاہ رُخ! تم بہت اچھے ہو بے حد اچھے جب آدمی کو اپنی بُرائیوں کا ادراک ہو اور اُسے احساس ہو کہ اُس کے اندر یہ بُرائی ہے تو وہ بہت اچھا ہوتا ہے شاہ رُخ اور تم نے کچھ بُرا نہیں کیا یہ سب ردِعمل تھا اُس احساس کا جو تم محسوس کرتے تھے حالانکہ......"

"حالانکہ میں غلط سوچتا تھا۔" وہ ہنس دیا

"یہی کہنا چاہتی ہو تم؟"

یہ تم اس لیے کہتی ہو کہ تم نے اس کرب کو اپنے دل پر نہیں جھیلا۔

"نہیں میں اس سب پر کچھ تبصرہ نہیں کروں گی۔" وہ بھی ہنس دی۔

"جو گزر گیا سو گزر گیا اُس پر پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن آنے والا کل تمہارے اختیار میں ہے۔"

"میں کیا کروں کیا کر سکتا ہوں اب۔"

اُس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

"تم کیا نہیں کر سکتے شاہ رُخ! انسان چاہے تو ایک دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے ایک عالم کو فتح کر سکتا ہے تم بھی ایک دنیا کو تسخیر کر سکتے ہو۔"

"زینی میں۔"

اُس نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کو دبایا۔

"میں نے تمہارے سامنے اعتراف کیا ہے کہ میں بہت بُرا ہوں اور میں تمہارے سامنے یہ عدہ کر رہا ہوں کہ آج کے بعد میں اُن راستوں کو چھوڑ دوں گا جو غلط ہیں میں تمام لڑکیوں کے اتھ اپنی فرینڈ شپ ختم کر لوں گا میں جہاں زیب سے اور ممی سے نہیں جھگڑوں گا۔"

"تھینک یو شاہ رُخ! مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اندر چھپے ہوئے بہت اچھے آدمی کو بہت جلد

باہر لے آؤ گے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آنٹی تم پر فخر کریں گی۔"

"زینی! تم بہت اچھی ہو۔"

اُس نے سچے دل سے اعتراف کیا تو وہ مسکرا دی۔

"مجھے پتا ہے۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ زور سے ہنس دی۔

"چلو تم لیٹ جاؤ۔ میں تمہارا سر دباتی ہوں۔"

"تم!" اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کیا حرج ہے۔"

"تھینک یو۔"

شاہ رُخ کی آنکھیں ایک دم چمک اُٹھی تھیں اور وہ ممنون نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ ہولے ہولے نرم نرم ہاتھوں سے اُس کا سر دبانے لگی اور اُس کے اندر سکون کی لہر اُترنے لگیں اور اُسے یوں لگا جیسے برسوں کی تشنگی ختم ہو رہی ہو۔

زندگی ایک دم بڑی خوبصورت ہو گئی تھی شاہ رُخ کو اپنا آپ بڑا اچھا لگنے لگا تھا۔ اُسے لگتا جیسے اُس کے اندر بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہوں۔ اُس کی سوچ اُس کے خیالات سب میں تبد رونما ہو رہی ہو۔ اب وہ چیزوں کو اس طرح نہیں دیکھتا تھا۔ جیسے پہلے دیکھتا تھا حالانکہ بظاہر کو تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ممی اب بھی اُس کی نالائقیوں کا رونا روتی تھیں۔ اُس کی بیکاری کڑھتی تھیں جہاں زیب کا رویہ اب بھی اُس کے ساتھ ویسا ہی تھا۔ لیکن اُسے اب اتنا بُرا نہ لگتا ٹھیک ہی تو کہتی تھیں کہ وہ بیکار اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اُسے کچھ کرنا چاہیے اور وہ سب کر سکتا۔ چاہے تو ایک دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے زینی نے بھی تو کہا تھا۔

ایک دنیا اُس کی مٹھی میں ہو سکتی ہے یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔

اچانک اتنی بڑی تبدیلی اُس کے اندر کیسے آ گئی تھی۔

وہ حیران ہو کر سوچتا۔

اس سے پہلے آخر اُس نے اس انداز میں کیوں نہ سوچا تھا تو کیا۔

تو کیا یہ سارا اعجاز اُس محبت کا تھا جو اچانک ہی اُس کے دل ہی لو دینے لگی تھی۔

تم...... تم اُس وقت کیوں نہ آ گئیں زینی جب میں ٹوٹ رہا تھا ٹکڑے ہو رہا تھا۔

اگر اُس وقت کہیں سے محبت کی چند بوندیں میرے وجود کو سیراب کر دیتیں تو شاید میں آج اتنا تہی دامن نہ ہوتا لیکن نہیں اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ زینی نے یہی تو کہا تھا کہ میں چاہوں تو اب بھی بہت کچھ میرے اختیار میں ہے۔ اور تب دل ہی میں پختہ ارادہ کر کے وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ جب وہ تھک جاتا تو زینی کو فون کرتا۔

زینی نے ایک ناصح دوست کے فرائض سنبھال لیے تھے وہ ہولے ہولے نرم نرم لہجے میں اُسے سمجھاتی اور وہ نہایت دھیان سے اُس کی باتیں سنتا۔ کبھی کبھی اُس کا دل چاہتا نرمی سے محبت سے بات کرتی ہوئی اس بے حد دلکش لڑکی کے سامنے اعتراف کر لے کہ وہ...... اُس سے محبت کرنے لگا ہے چاہنے لگا ہے لیکن پھر وہ اپنے آپ کو روک لیتا منع کر دیتا ابھی نہیں ابھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ ایک اتنی پیاری اور دلکش لڑکی سے محبت کا دعویٰ کروں۔

اور کبھی پڑھتے پڑھتے وہ ایک دم گھبرا جاتا ہمت ہارنے لگتا شاید میں کامیاب نہ ہو سکوں یہ سب میرے بس کا کام نہیں ہے۔

مایوسی اُسے گھیر لیتی تو زینب اُسے سہارا دیتی۔

"کچھ بھی مشکل نہیں ہے شاہ رُخ بات صرف ارادے کی ہے اگر تمہارا ارادہ پختہ ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہاری منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔"

اور اُمید کی بجھتی لو پھر بھڑک اُٹھتی مگر وہ التجا کرتا۔

"دیکھو زینی! ابھی یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ ورنہ اگر میں ناکام ہو گیا تو جہاں زیب مجھ پر ہنسے گا اور ممی کہیں گی کہ میں تھا ہی ایسا مجھے تو ناکام ہی ہونا تھا۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کیا کرو شاہ رخ! تم ناکام نہیں ہو گے اور کوئی تم پر نہیں ہنسے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم کسی سے کہنا مت آنٹی سے بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے نہیں کہوں گی۔"

اور اُس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا ٹیلی فون اُٹھا کر باہر رکھ دیا۔

ممی اور جہاں زیب کو حیرت تھی کہ یکا یک ہی اُسے کیا ہو گیا ہے پہلے تو رات گئے تک گھومتا

پھرتا تھا اور گھر ہوتا تو ٹیلی فون پر گپ لگاتا۔

''کیا بات ہے بھائی؟ آج کل کیا ساری فرینڈز سے ناراضگی ہوگئی ہے؟''

اُس روز ناشتا کرتے ہوئے جہاں زیب نے طنز کیا تو وہ مُسکرادیا۔ اور بنا کچھ بولے اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

''شاہ رُخ!''

''جی۔''

اُس نے نگاہیں اُٹھائیں۔

ممی بڑے غور سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''کب تک تم یونہی بے کار گھومتے رہو گے کچھ کرو کوئی بزنس ہی کرلو چھوٹا بھائی نوکر ہوگیا ہے اور تم!''

''ممی! میں کوشش کررہا ہوں بہت جلد مجھے اچھی نوکری مل جائے گی۔''

خلاف توقع اس نے نرمی سے جواب دیا تو وہ بھی نرم پڑ گئیں۔

''نوکری مل بھی گئی تو کیا ملے گی شاہ رخ! بہتر تو یہی ہے اپنے انکل کے مشورے سے بزنس کرلو۔''

''جی اچھا!''

اُس نے کوئی تبصرہ نہ کیا تو جہاں زیب نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پھر طنز کیا۔

''ان سے کچھ نہیں ہوگا ممی انہیں تو بس صرف باتیں بنانا آتی ہیں۔''

اُس کا دل چاہا وہ اُسے کوئی سخت سا جواب دے لیکن تب ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور وہ کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری طرف زینی تھی...... اور اسے سالگرہ کی مبارکباد دے رہی تھی۔

''میرا برتھ ڈے ہے آج؟''

اُسے حیرت ہوئی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا زینی؟''

''جن سے محبت ہوتی ہے اُن کے متعلق ہر بات کی خبر ہوتی ہے جناب۔''

اور اسے لگا جیسے اُس کے اردگرد پھول ہی پھول کھل اُٹھے ہوں۔

''خدایا کیا میں اتنا خوش نصیب بھی ہوسکتا ہوں۔''

''ہیلو بھئی کہاں گم ہوگئے؟ ممی نے تمہاری سالگرہ منانے کا اہتمام کیا ہے۔''

''مگر''

''اگر مگر کچھ نہیں بس مل بیٹھنے کا بہانہ ہے ہماری خوشیاں بھی کس قدر مختصر اور چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں انہیں گنوانا نہیں چاہیے آنٹی اور زیب تم تینوں آجانا جلدی اور دیکھو ابھی آنٹی کو کچھ نہ بتانا ابھی سرپرائز دیں گے سب کو...... بس تم آنٹی کو کہہ دو رات کا کھانا اور شام کی چائے ہمارے ہاں''

''تم خود ہی کہہ دو۔''

''ممی زینی کا فون ہے۔''

ممی کو ریسیور پکڑا کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اُس کی عجیب سی کیفیت ہورہی تھی۔

خوش نصیبی ہوتی ہے آدمی کی کہ کوئی اس کی خوشیوں پر خوش ہونے والا ہو اور یہ خوش نصیبی کب ملی تھی اُسے اب عمر کے اس دور میں اور اُسے وہ بہت سارے سال یاد آگئے جب اُس نے تنہا اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنا برتھ ڈے گزارا تھا اور اُس کی خوشی کو کسی نے شیئر نہیں کیا تھا نہ ممی نے نہ جہاں زیب نے اور اب یہ زینی تھی جو اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھی اور...... اس سے محبت کرتی تھی اور یہ محبت بھی عجیب شے ہوتی ہے کیسے پتھر کو موم کردیتی ہے اور اگر زندگی کے باقی ماندہ سفر میں زینی میرے ساتھ ہوئی تو میں پچھلی ساری صعوبتوں کو بھول جاؤں گا اور سارے زخم فراموش کردوں گا۔

اُس نے بڑی خوش دلی سے سوچا اور کتاب اُٹھالی۔

☆☆☆

''ممی اب تو آپ خوش ہیں نا! اب تو خفا نہیں ہیں مجھ سے۔''

شاہ رخ کی آواز سُن کر زینب وہیں دروازے کے پاس رُک گئی اُس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

''ممی! میں نے آپ کو بہت رُلایا بہت تنگ کیا میں بہت بُرا تھا ممی مجھے معاف کردیجیے گا میری ساری غلطیوں کو آپ اب مجھ سے ناراض نہیں ہیں نا ممی!''

"نہیں...... ماؤں سے زیادہ اولاد کی کامیابی پر کسے خوشی ہوتی ہے تجھے کیا پتا تیری کامیابی سے میں کتنی خوش ہوں خدا نے خود ہی تیرے دل میں کچھ خیال ڈالا ورنہ میں تو تیرے لیے ہر وقت پریشان رہتی تھی۔"

"مجھے اعتراف ہے ممی! میں نے آپ کو تنگ کیا لیکن آپ نے بھی ممی!"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"میں سمجھتا تھا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے آپ صرف جہاں زیب سے محبت کرتی ہیں"

"پگلا۔"

اُس نے جھانک کر دیکھا وہ ممی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا اور وہ محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں مجھے تم سے بھی اتنی ہی محبت ہے تھی جتنی زیب سے ہے میں تو تم پر اس لیے غصہ ہوتی تھی کہ میں چاہتی تھی تم اور زیب دونوں بہت لائق بہت اچھے بنو۔

"ممی!"

اُس نے اپنا سر اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"آپ نے کبھی سوچا اچانک میرے اندر اتنی تبدیلی کیوں پیدا ہوگئی ہے میں جو ہر وقت لڑ جھگڑتا رہتا تھا آوارہ گھومتا پھرتا تھا اور خواہ مخواہ ضد میں آ کر آپ کو تنگ کرتا تھا اچانک میں نے سب کچھ کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہاں حیرت تو مجھے بہت ہوئی تھی اور میں نے سوچا شاید اللہ نے میری دعائیں سُن لی ہیں"

"ممی میں اپنے آپ کو بہت اکیلا بہت تنہا محسوس کرتا تھا جیسے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں کوئی نہیں جو مجھ سے محبت کرتا ہو مجھے چاہتا ہو پھر اُس نے مجھے احساس دلایا کہ سب میرے آپ...... اور جہاں زیب ممی اُس نے اُس لڑکی نے اپنی پُرخلوص باتوں سے میرے احساس جگایا اور میں ہولے ہولے بدلتا چلا گیا۔

"کون! کون ہے وہ لڑکی؟ مجھے بتاؤ میں اُس کا شکریہ ادا کروں گی اُس کا احسان زندگی نہیں بھولوں گی۔"

"مجھے لگتا ہے ممی! جیسے وہ لڑکی میرے لیے اندھیرے راستے میں جلتا ہوا چراغ ہے اگر وہ لڑکی مجھے نہ ملی تو میں پھر ایک بار اندھیروں میں بھٹک جاؤں گا ممی میں اُس سے شادی کرنا

ہوں میں! میں سوچتا تھا میں اُس کے قابل نہیں ہوں مگر اب جبکہ میں نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا ہے اور میں اُسے ایک بہتر مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہوں تو میں چاہتا ہوں ٹریننگ کے لیے جانے سے پہلے آپ مجھے یہ یقین دلا دیں کہ آپ اُسے میرے لیے مانگ لیں گی! مانگیں گی نا۔"

"کیوں نہیں وہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے اور پھر میں تو اُس کی شکرگزار ہوں کہ اُس نے میرے بگڑے ہوئے بیٹے کو سنوارا ہے تم بتاؤ تم وہ کون ہے؟ میں آج ہی جاؤں گی اُس کے گھر۔"

"آج نہیں ممی! میں ٹریننگ مکمل کرلوں پھر۔"

"تم بتاؤ تو۔"

"زینی ممی۔"

اور باہر کھڑی زینب نے ایک دم دروازے کی چوکھٹ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ خوفزدہ تھی ڈر رہی تھی اور یہی لمحہ کتنی آسانی سے گزر گیا تھا...... بارہا اُس نے سوچا تھا کہ اگر یہ لمحہ اُس کی زندگی میں آیا تو کیا ہوگا؟ کیا وہ اس لمحے سے بچ سکے گی اور پھر بارہا اُس نے اپنے دل کو یقین دلایا تھا کہ نہیں یہ لمحہ اُس کی زندگی میں نہیں آئے گا مگر یہ لمحہ آ کر گزر گیا تھا اور اندر شاہ رخ بے حد اضطراب سے کہہ رہا تھا۔

"ممی! آپ چپ کیوں ہوگئی ہیں؟ خاموش کیوں ہوگئی ہیں؟ آپ بولتی کیوں نہیں؟ کیا آپ کو زینی پسند نہیں ہے ممی وہ بہت اچھی ہے، بہت نرم دل مخلص اور...... اور"

"ہاں وہ بہت اچھی ہے مگر"

"مگر کیا۔"

شاہ رخ نے اُنہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"ممی! آپ سے میں نے کبھی نہیں مانگا آپ نے زندگی بھر مجھے محروم رکھا اپنی محبتوں اور شفقتوں سے آپ نے میرے حصے کی محبتیں بھی جہاں زیب کو دے دیں اور میں۔"

یکدم ہی اُس کی آواز ٹوٹ گئی۔

"میں آپ سے کبھی نہیں مانگوں گا آپ سب کچھ زیب کو دے دیں لیکن ممی! میں سچ کہتا ہوں اگر زینی مجھ سے چھن گئی تو میں مر جاؤں گا میں اب میں آپ سے کیا کہوں ممی وہ میرے۔"

"نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو بیٹا میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ کہیں زینی کی بات زوباریہ نے طے نہ رکھی ہو۔"

"نہیں ممی ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے پتا ہے۔"

شاہ رخ نے اطمینان سے کہا۔

"زینی! مجھے ہر بات بتاتی ہے اور پھر آنٹی نے بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔"

اور زینب نے ایک اطمینان بھرا سانس لے کر اپنے ہاتھ چوکھٹ سے اُٹھا لیے شکر ہے آ نے بھی اُسے کچھ بتایا نہیں ورنہ۔

"ممی! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"نہیں بیٹا! میں آج ہی زوباریہ سے بات کروں گی۔"

"تھینک یو ممی!"

شاہ رُخ بے حد خوش تھا اور وہ جو شاہ رخ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ کب اکیڈمی جا رہا ہے سے ملے بغیر واپس پلٹ آئی وہ ایک دم ہی بہت پریشان ہو گئی تھی نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور اُس کے اندر چھپے ہوئے اچھے انسان کو باہر لانا چاہ رہی تھی مگر وہ کتنے اٹل لہجے میں رہا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ تو...... تو کیا وہ اُسے مرنے دے اُسے بتا دے کہ زندگی بھر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی کیونکہ تین سال قبل! مگر وہ جو اُس سے اتنی اُمیدیں وابستہ کر ہے اُس کا دل ٹوٹ جائے گا اور...... پھر ممکن ہے ایک بار پھر وہ اُنہی راستوں پر چلنے لگے جن پہلے چل رہا تھا اب جبکہ اُس کے پاؤں منزل کو چھونے والے ہیں اور وہ......

اوہ میرے خدا میں کیا کروں۔

اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"کیا بات ہے زینی بیٹا! تم جلد ہی آ گئیں شاہ رخ کب جا رہا ہے؟"

زوباریہ نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

تو اُس نے اسے ساری بات بتا دی۔

وہ رو دی.........

"آپ کو تو سب کچھ پتا ہے آپ تو سب جانتی ہیں آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اُس

سے پیش آیا کرو۔ نرمی سے بات کیا کرو اسے احساس دلایا کرو کہ وہ اکیلا نہیں ہے ہم سب اُس کے ہیں اس سے محبت کرتے ہیں آپ تو عقلمند تھیں۔ آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے؟ ایسا بھی ممکن ہے ایسا تو ہونا ہی تھا ممی۔"

"زینی بیٹے!"

زوباریہ اُلجھ سی گئی تھی خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اس وقت جب وہ اکیڈمی ...... جا رہا تھا جب اُس نے شاید زینی کے لیے ہی ایک راہ کا تعین کر لیا تھا وہ اُسے بہت عزیز تھا بہت پیارا تھا بہت پہلے بچپن میں انہوں نے ایک بار نہیں کئی بار سوچا تھا کہ اگر زینی اور شاہ رخ مگر جب اُس نے بڑی آپا سے ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔

"زوبا! مجھے زینی بہت پیاری ہے شاہ رخ جیسے نالائق لڑکے کے ساتھ اُس کا بندھن باندھ کر میں اُس پر ظلم نہیں کروں گی ارے تجھے کیا خبر زوبا یہ شاہ رخ کیسا فضول لڑکا ہے ہاں میرا زیب زینی کے قابل ہے۔"

اور تب پتا نہیں کیوں زوباریہ نے سوچا تھا شاہ رخ نہیں تو زیب بھی نہیں اور تین سال قبل زینب کی رضامندی سے اس نے زینب کے چچا کو زبان دے دی تھی۔ فواد ٹورنٹو میں تھا اور اچھا لڑکا تھا محنتی اور سنجیدہ سا۔

"ممی! آپ کیا سوچنے لگیں؟"

زینب نے روتے روتے سر اُٹھایا۔

وہ شاہ رُخ کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن فواد فواد اُس کا چچا زاد تھا۔ اور منگنی کے بعد وہ ان کے لیے اہم ہو گیا تھا۔ اور اکثر اُس کے متعلق سوچتے ہوئے اُس کا دل دھڑک اُٹھتا تھا وہ سے پسند کرتی تھی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا بیٹے؟"

"ممی! آپ آنٹی کو بتا دیں کہ یہ بات ناممکن ہے وہ شاہ رُخ کو سمجھا دیں گی یا پھر میں ہی۔"

"نہیں چاند! تم ابھی اس سے کچھ مت کہنا ابھی اُسے جانے دو وہ ٹریننگ کر کے آ جائے

پھر۔ پھر میں اُسے خود ہی سمجھا دوں گی مجھے ڈر ہے وہ کچھ کر نہ لے۔"

زوباریہ نے ملتجی نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

اور اُسی شام جب وہ بہت دل گرفتہ سی بیٹھی تھی کہ اُس کا فون آ گیا۔

"زینی! کیسی ہو؟"

"فائن!"

"تمہیں پتا ہے زینی میں آج کیوں نہیں آیا۔"

"کیوں نہیں آئے؟"

"میں میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں دو ایک......روز میں میں چلا جاؤں گا اور جانے پہلے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ میں تمہارے سامنے کچھ کہہ نہ پاؤں گا اس میں نے فون کا سہارا لیا تم خفا تو نہیں ہو جاؤ گی؟"

"نہیں!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

حالانکہ وہ جانتی تھی کیا بات ہے وہ کیا کہنے والا ہے۔

"زینی۔ تم۔ آئی۔ لو۔ یو زینی!"

"یہ بات تو تم نے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں سے کہی ہوگی۔"

اس نے یونہی کہہ دیا مگر وہ تڑپ اٹھا۔

"زینی! آدمی جن سے محبت کرتا ہے جن کا احترام کرتا ہے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا میں نے شاید بہت لڑکیوں سے یہ کہا ہو لیکن تم جانتی ہو تمہیں خبر ہے کہ اس کہنے اور اُس کہنے بہت فرق تھا۔ اور یہ اتنی سی بات تم سے کہنے میں مجھے بہت وقت لگا ہے اگرچہ اس کا انکشاف پر بہت پہلے ہو گیا تھا کہ میں۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن میں خود کو تمہارے قابل سمجھتا تھا اور اب زینی مجھے دُکھ ہوا کہ تم بھی مجھے نہیں سمجھتیں۔"

"سوری شاہ رُخ! میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

"زینی!"

وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"میرے کان بھلے لفظوں کو ترس گئے میرے میرا دل مدتوں سے بنجر پڑا تھا نہ اس میں کبھی کوئی بیج گرا تھا نہ کبھی روئیدگی نے سر اُٹھایا تھا محبت سے خالی دل ویران اور بنجر زمینوں کی طرح پھر تمہارے خلوص اور محبت نے اس بنجر زمین میں پھول کھلا دیے میں تمہیں کیسے بتاؤں زینی کس طرح سمجھاؤں کہ تم میرے لیے کیا ہو اندھیرے راستے میں جلتا ہوا چراغ خزاں میں بہار کی پیغامبر زینی میں نے ان بیتے بہت سے دنوں میں اکثر اپنے آپ سے سوال کیا ہے پوچھا ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو اور ہر بار میرے دل نے کہا تم میرے لیے اب اتنی ہی ناگزیر ہو گئی ہو جیسے جسم کے لیے روح ہوتی ہے میں نے کئی بار پورے خلوص کے ساتھ اپنا تجزیہ کیا ہے اور ہر بار میں نے یہی جواب پایا ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملیں زینی تو میں۔ میں شاید جی نہ پاؤں گا زینی میرا ہاتھ پکڑا ہے تو چھوڑ نہ دینا۔ تم ناراض تو نہیں ہوئیں میری اس جسارت پر۔"

"نہیں!"

زینی کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں مگر وہ ضبط کیے کھڑی تھی۔

"تھینک یو زینی! میں کوشش کروں گا کہ تمہیں......زندگی کی ہر خوشی دے سکوں بس تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرنا۔" وہ یکدم چپ ہو گیا۔

"زینی!"

لمحہ بھر چپ رہ کر اس نے پھر کہا۔

"مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا تم تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟ ممی آنٹی سے بات کریں گی مگر میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا ہے کہ ابھی نہیں دراصل میں پہلے تم سے بات کرنا چاہتا تھا مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم کہیں تم مجھے ٹھکرا نہ دو۔"

اوہ خدایا! وہ کیا کرے کیسے بتائے اسے کہ وہ ایک شخص جو بہت دور ٹورنٹو میں ہے اس کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن کر وہ۔

"زینی! بولو نا تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں نا۔"

"نہیں!"

"اوہ سمجھا تمہیں شرم آ رہی ہے اچھی لڑکیاں......کاش میں اس وقت وہاں ہوتا اور تمہارے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھ سکتا زینی تمہیں پتا ہے تم بہت پیاری ہو؟"

وہ شوخ ہو رہا تھا اس نے ریسیور رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

یکا یک وہ بیچ دوراہے میں آ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کس سمت جائے۔

شاہ رخ کی پوسٹنگ حیدر آباد ہو گئی تھی اور وہاں جانے سے پہلے وہ منگنی کرنا چاہتا تھا اور بڑی آپا نے اپنا دامن زوباریہ کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

"میں جانتی ہوں زوبا! مجھے پتا ہے کہ تو نے زبان دے دی ہوئی ہے لیکن پھر بھی تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تیری منت کرتی ہوں شاہ رُخ نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں اور اب شاید تجھے نہیں پتا وہ کا آگے نکل آیا ہے میرا بیٹا مر جائے گا زوبا تم سہیل کو کسی طرح منا لو فواد کو اچھی سے اچھی لڑکی مل جائے گی لیکن میرے شاہ رُخ کے لیے شاید زینی سے بہتر کوئی لڑکی نہیں اور شاید وہ۔"

اور بڑی آپا کے آنسوؤں نے اور اس سے بڑھ کر اس محبت نے جو شاہ رُخ کے لیے زوباریہ کے دل میں تھی زوباریہ کو مجبور کر دیا کہ وہ بڑی آپا کو خالی ہاتھ نہ لوٹائے۔

"ٹھیک ہے آپا میں سہیل کو منا لوں گی اور زینی سے بھی بات کر لوں گی مگر شاید اس میں کچھ دن لگیں۔"

"خدا تجھے اس کا اجر دے گا زوبا۔"

اور اب انہوں نے زینب سے شاہ رُخ کی زندگی کی بھیک مانگ کر اسے بیچ دوراہے میں کھڑا کیا تھا۔

"ممی! آپ جانتی ہیں کہ مجھے فواد سے کوئی وابستگی نہیں تھی اور جب تک میری منگنی ان سے نہ ہوئی تھی میں نے کبھی ان کے متعلق اس طرح نہیں سوچا تھا مگر منگنی کے بعد یہ فطری بات ہے مجھے ان سے دلی......وابستگی ہو گئی اور شاہ رُخ ممی یہ کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے کہ کل میں فواد کے نام کی انگوٹھی پہنی اور آج شاہ رُخ۔"

"زینی میں تیرا کرب سمجھ رہی ہوں تیرے دُکھ کو محسوس کر رہی ہوں میری جان مگر کبھی کبھی کسی زندگی کو بچانے کے لیے تھوڑی سی قربانی دینی ہی پڑتی ہے فواد کو شاید دُکھ ہو گا ملال ہو گا مگر بہت جلد یہ دُکھ کم ہو جائے گا لیکن شاہ رُخ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں وہ بہت مختلف ہے بہت حساس یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے زینی میرے لیے میری خاطر تو جانتی ہے میں نے ہمیشہ اسے اپنا بیٹا جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے ممی!"

زینب نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور زوباریہ نے بے اختیار اُسے گلے سے لگا لیا۔

"مجھے یقین ہے زینی بہت جلد تم یہ سب کچھ......فراموش کر دو گی اور شاہ رُخ"

"ممی پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔"

اس نے التجا کی تو زوباریہ ایک دُکھ بھری نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"شاہ رُخ بھائی سو رہے ہو۔"

جہاں زیب نے اس کے کمرے میں آتے ہوئے آواز دی لیکن وہ تکیہ آنکھوں پر رکھے چپ لیٹا رہا۔

"بھائی اٹھو نا ممی تمہیں بلا رہی ہیں۔"

اس نے پھر کہا مگر شاہ رُخ نے کروٹ بدل کر پورا چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔

"یہ بھی کوئی سونے کے دن ہیں ہم اُدھر آپ کی منگنی کا پروگرام ترتیب دے رہے ہیں اور آپ اِدھر استراحت فرما رہے ہیں جناب اُٹھیے اُدھر تشریف لے چلیے۔"

اس نے آگے بڑھ کر تکیہ اس کے چہرے سے اُٹھا لیا۔

"زیب پلیز مجھے تنگ نہیں کیا کرو۔"

اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ بھی تپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" جہاں زیب پریشان ہو گیا۔

"ہاں شاید طبیعت کچھ ٹھیک نہیں سر میں درد ہے۔"

"ٹیبلٹ لا دوں۔"

"نہیں میں سوؤں گا کچھ دیر تم جاؤ۔"

"اچھا مگر زیادہ تکلیف ہو تو بتانا ڈاکٹر کے پاس چلے چلتے ہیں۔"

"نہیں یار! آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

اور زیب کے جانے کے بعد وہ اُٹھ بیٹا اِدھر اُدھر کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے وہ سوچتا رہا کہ اس کے مقدر میں ہمیشہ پیاسا رہنا ہی لکھا ہے اور کیا وہ ہمیشہ محروم ہی رہے گا اور تمہیں کیا خبر زینب سہیل احمد کہ تم میرے لیے کیا ہو مگر وہ کتنا خوش تھا کتنا بے تحاشا خوش مگر پھر کیا ہوا تھا وہ یکا یک آسمان سے زمین پر آ گرا تھا۔ اس نے یہ کیا سُنا تھا زوبا آنٹی ممی کو بتا رہی تھیں کہ انہوں نے زینی کو کس طرح منایا اور یہ شخص فواد کس قدر خوش قسمت ہے کہ وہ پیاری دلکش لڑکی اسے چاہتی ہے اور تم میرے لیے قربانی مت دو زینی اور شاید تمہیں نہیں پتا کہ جن سے محبت کی جاتی ہے انہیں دُکھ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

درد کی ایک شدید لہر اس کے دل میں اُٹھی۔

"اور یہ کتنا مشکل ہے تم سے دستبردار ہونا مگر۔"

اس نے نمبر ملائے دوسری طرف زینب ہی تھی۔

"زینی!"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں تمہارا بہت ممنون ہوں اور میرے پاس شاید وہ الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہارے خلوص کا شکریہ ادا کرسکوں میں بہت بُرا تھا تم نے مجھے آگہی دی تم نے میری محبتوں سے ناآشنا دل کو محبت کے گداز سے پگھلایا یہ میری نادانی تھی کہ میں اپنے قد سے بڑی خواہش کر بیٹھا میں نادم ہوں زینی بخدا مجھے خبر نہیں تھی کہ تم کسی سے منسوب ہو اگر مجھے علم ہوتا تو میں یہ خواہش کبھی نہ کرتا تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زینی میں اتنا خودغرض تو نہیں تھا۔"

"شاہ رُخ میں۔"

نہیں زینی کچھ مت کہنا پلیز اور یہ مت سمجھنا کہ میں مرجاؤں گا نہیں اچھا ریسیور رکھ دو بخدا

اس کے ہاتھ سے چھٹ گیا تھا پتا نہیں یکا یک کیا ہوا تھا زمین آسمان سب کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے تھے۔ میز، کرسی، بیڈ، سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہو رہا تھا اور درد ناقابل برداشت درد کی لہریں سی اُٹھ رہی تھیں یہاں سے وہاں تک ہر طرف درد ہی درد تھا اس نے بے چینی سے اپنے سینے کو مسلا اور زیرلب بڑبڑایا۔

رُت کوئی صورت مرہم بھی میسر آتی۔

اب تو دریا کوئی جھرنا کوئی برکھا مولا۔

مگر شاید ذرا سی خوشی کے بعد عمر بھر کی محرومی اس کا مقدر لکھ دی گئی تھی۔

اور تم کیا جانو زینی کہ تم سے بچھڑ کر تم سے الگ ہو کر میں کیسے جی پاؤں گا اور ان بیتے دنوں میں میں نے کیا کیا خواب نہیں دیکھ ڈالے تھے۔

اور خواب دیکھنے کی عادت تو اس بچپن سے ہی تھی جب کبھی بچپن میں ممی اُس سے پیار سے نرمی سے بات کر لیتی تھیں۔ تو وہ کتنے ہی خواب دیکھ ڈالتا تھا مگر اگلے روز اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے تھے۔ اس سے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی تھی کہ ممی کو غصہ آ جاتا تھا مگر اب اب تو اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ پھر پھر کیوں اس کے خواب بکھر گئے تھے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں وہ رونا چاہتا تھا مگر رو یا نہیں تھا جس سے اس کے دل پر بے انتہا بوجھ آ گرا تھا ناقابل برداشت لگتا تھا اس بوجھ سے اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔

"بھائی!"

"جہاں زیب نے پھر کمرے میں جھانکا۔"

"ممی کہہ رہی ہیں سونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو ہمارے ساتھ بازار چلنا ہو گا منگنی کی انگوٹھی پسند کرنے کے لیے۔"

"زیب!"

"اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔"

"ممی سے کہہ دو منگنی نہیں ہو گی میں زینی پر ظلم نہیں کرسکتا۔"

"بھائی!"

"جہاں زیب حیران سا اندر چلا آیا۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔"

"تم ممی سے کہہ دو زیب!"

"اس نے بے چینی سے اپنے سینے کو مسلا۔"

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

زیب نے اس کی خطرناک حد تک زرد ہوتی...... رنگت کو دیکھا اور گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں!"

اس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر درد برداشت کرنے کی کوشش کی۔

"شاہ رُخ"

زیب اس پر جھک گیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے اور یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

اور وہ ساری زندگی جن محبتوں کے لیے ترستا رہا تھا یہ محبتیں اسے کب ملی تھیں جب ج
شاید زندگی کا ناتا ٹوٹنے والا تھا۔

اس نے زیب کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"آئی۔لو۔یو زیب!"

پھر اس کے ہاتھ پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

"آئی۔لو۔یو ٹو شاہ رُخ۔لو۔یو۔" زیب چیخ پڑا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اس نے زینب سے کہا تھا وہ نہیں مرے گا وہ مر کر اسے احساس جرم
مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں نہیں مروں گا۔"

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

"مجھے نہیں مرنا اور یہ محض وقتی تکلیف ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ میں سنبھل جاؤں گا۔"

"شاہ رُخ! بھائی!"

جہاں زیب نے اسے جھنجوڑ ڈالا مگر اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں۔

پھر جانے کتنے دن یونہی بے خبری میں گزر گئے اُسے تو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کی اس بے خبری سے سب پر کیا بیتی تھی۔ ممی صبح سے شام تک جانماز بچھائے بیٹھی رہتی تھیں زوباریہ اور جہاں زیب چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کے باہر بیٹھے رہتے اور ان کے ہونٹ ہلتے رہتے رو رو کر زینب کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے شاہ رخ کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی نہ بچے گی اور اچانک ہی اس پر...... انکشاف ہوا تھا کہ وہ خود بھی اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔

اس نے موت کو شکست دے دی تھی اور اسے چھو کر پلٹ آیا تھا۔ ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جائے گا اس نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا اور جہاں زیب اور ممی کو تسلی دی تھی مگر خود جیسے وہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ ہاسپٹل میں اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ سوچتا رہتا شاید اس کے دل کی زمین کو ہمیشہ بنجر ہی رہنا تھا۔ کوئی جھرنا کوئی بادل اس کے نصیب میں نہیں تھا اس روز بھی وہ چپ لیٹا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ حسب معمول زینب پھول لیے آئی۔

"کیسے ہو شاہ رُخ"

"ٹھیک ہوں۔"

"یہ بستر چھوڑنے کا ارادہ نہیں؟ کیا ہاسپٹل بہت...... پسند آ گیا ہے۔"

"کوشش کر رہا ہوں سنبھلنے کی۔"

"نہیں تم کوشش نہیں کر رہے ہو شاہ رُخ۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"کر تو رہا ہوں"

وہ مسکرایا۔

"اچھا تو پھر جلدی سے اچھے ہو جاؤ نا ایک کام سے پپا کو امریکہ جانا ہے اور وہ محض تمہاری
سے رُکے ہوئے ہیں۔"

"میری وجہ سے کیوں؟"

اس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ تمہاری بیماری سے پہلے تمہاری منگنی کی......"

"بھولا نہیں ہوں"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مگر میں نے ممی کو کہلوا دیا تھا کہ یہ منگنی۔"

"یہ کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے کہ تمہارے کہنے سے۔"

"زینی میں تمہاری مرضی کے خلاف تم......"

"تم سے کس نے کہا کہ میری مرضی نہیں ہے۔"

"وہ جانتا ہوں۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"تم مجھ پر ترس کھا رہی ہو مگر زینی مجھے نفرت ہے ہمدردی اور ترس سے اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس وجہ سے بیمار ہو گیا تھا تو یہ تمہارا وہم ہے۔ اصل میں حد سے زیادہ محنت نے مجھے تھکا دیا تھا۔ اور مجھے تمہارے ترس اور...... ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے تم سہیل انکل سے کہہ دو کہ وہ بے شک امریکہ چلے جائیں اور......"

"شاہ رُخ"

زینب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا کہ نفرت اور محبت کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں آدمی کو محبت پر نفرت کا اور نفرت پر محبت کا گماں کیسے ہو سکتا ہے اس طرح ترس اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے اور میں......"

اس کے رخساروں پر شفق دوڑنے لگی۔

"زینی!"

شاہ رُخ نے اس کے چہرے پر رنگوں کو پھیلتے اور سمٹتے دیکھا اور حیرت سے کہا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولنا زینی میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔"

"فواد کو میں نے پسند کیا تھا اور تم...... تم سے میں نے محبت کی ہے شاہ رُخ اور اس

انکشاف مجھ پر اب ہوا ہے زینب نے اعتراف کیا۔

اور اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"زینی!"

فرطِ مسرت سے شاہ رُخ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"زینی سچ کہہ رہی ہو نا ترس تو نہیں کھا رہی نا؟"

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تم کوئی لولے لنگڑے تو نہیں ہو کہ تم پر ترس کھاؤں گی"

اس نے چڑ کر کہا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"ہاں واقعی ترس تو لولے لنگڑوں پر کھایا جاتا ہے اور مابدولت ٹھہرے۔"

"بس......بس اب زیادہ نہ اتراؤ۔"

"زینی سنو ایک معاہدہ ابھی نہ کر لیں۔"

"کیا؟"

اس نے بمشکل پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ بے حد گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور ابھی تک اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ہم کبھی بھی اپنے بچوں میں تفریق نہیں کریں گے۔" سب سے ایک جیسی ایک جتنی محبت کریں گے۔ کبھی کسی بچے کو یہ احساس نہیں دلائیں گے کہ وہ دوسرے سے کمتر ہے چاہے ہمارے بچے بھی کیوں نہ ہوئے۔

"یہ تعداد کچھ کم نہیں ہو سکتی بڑے بھائی۔"

جہاں زیب نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئی اور دونوں کا مشترکہ قہقہہ دور تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔

● ○ ●

"تو میں جا رہا ہوں صبو!"

عاطی بالکل میرے پیچھے کھڑا تھا لیکن میں نے اسے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ میرا سارا دھیان

اپنی تصویر کی طرف تھا۔

''کہاں؟'' میں نے جھک کر برش تصویر پر پھیرا۔

''کہیں بھی''

''اچھا!''

میں نے تنقیدی نظروں سے تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ڈل سی لگی شاید میں نے رنگو صحیح استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا یہاں اس جگہ مجھے برائٹ کلر استعمال کرنا چاہیے تھ یہاں سبزے پر بھی کچھ چمک ہونی چاہیے تھی۔ یوں لگے جیسے انجانی سمتوں سے نہ دکھائی د والی روشنیاں آ کر ساری فضا کو روشن کر رہی ہیں۔ حالانکہ میں نے نیچے سبزے پر اور پھولو رنگوں کی ایک بوچھاڑ سی پڑتی دکھائی تھی۔ جس میں قوس قزح کے سارے رنگ تھے لیکن پھ کہیں کچھ کمی تھی اور وہ کمی کیا تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دراصل یہ تصویر میں ایک مقابلہ حصہ لینے کے لیے بنا رہی تھی اور اس کے لیے جو موضوع دیا گیا تھا وہ تھا ''امید'' لیکن میں ا تاثر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جو دینا چاہتی تھی حالانکہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں میں نے جو بھی اور جتنی بھی تصاویر بنائی تھیں۔ سب کی سب بہت پسند کی گئی تھیں اور ان تاثر بھرپور ہوتا تھا جو میں دینا چاہتی تھی۔

شاید یہ اس لیے تھا کہ میرا موڈ قطعی تصویر بنانے کا نہیں تھا اور تخلیقی عمل تو جبراً کبھی بھی پاتا۔ اس کے لیے تو پہلے اندر سے نمو اٹھتی ہے اور میرے اندر کہیں کوئی چیز تخلیق کرنے کی نہیں اٹھی تھی نہ ہی کچھ باہر آنے کو بے قرار تھا بلکہ میرا تو جی کوئی بھی کام کرنے کو نہیں چا چیز سے بیزار ہو گیا تھا ایک دم پورے وجود میں ایک بیزاری اور تھکن سرایت کر گئی تھی جی چا آنکھیں بند کیے لیٹی رہوں۔ کچھ کھانے پینے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا حالانکہ میں اتنی سست بھی نہ تھی اور ماما کا کہنا تو میں نے کبھی ٹالا ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی جو ماما نے کہا میں لیکن اب کے میں اتنی سست اور بیزار ہو رہی تھی کہ جب ماما نے کہا۔

''صبو! تمہیں اس مقابلہ میں حصہ لینا ہے۔''

تو بے اختیار کہہ بیٹھی۔

''پلیز ماما! میرا موڈ نہیں ہے۔''

''تم موڈ بناؤ نا جانی!''

انہوں نے پیار سے میرے رخساروں کو تھپکا۔

''ماما؟ کیا ضروری ہے اس مقابلہ میں حصہ لینا۔''

''ہاں! ان کی مسکراہٹ ان کے باریک لبوں کے گوشوں میں گم ہو گئی۔ اور تمہیں انعام بھی حاصل کرنا ہے ہر صورت مجھے پتا ہے میری بیٹی میں اتنا ٹیلنٹ ہے۔ اور وہ مسز بخاری کی بیٹی اسے تو صحیح طرح سے برش پکڑنا بھی نہیں آتا اور وہ سارے جیم میں کہتی پھرتی ہیں۔ کہ ان کی ڈیزی اس مقابلہ میں حصہ لے گی اور جیتنے کی صورت میں وہ سب کو پی سی میں ڈنر دیں گی۔''

''تو یہ ماما کی پرائیڈ کا سوال ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''اور رات جیم خانہ میں برج کی ٹیبل پر حامد انصاری نے مجھ سے کہا کہ صبوحی کیوں نہیں اس مقابلہ میں حصہ لیتی۔ وہ اتنی ٹیلنٹڈ ہے اور تمہیں پتا ہے جانو۔'' ان کی آنکھیں چمکیں اور ان کے ب ذرا سے کھلے یوں کہ صبوحی کو ان پر مسکراہٹ کا گمان ہوا۔

''حامد انصاری اس مقابلہ کے ججز میں سے ایک ہے۔''

''مگر ماما! میں'' میں بتانا چاہتی تھی کہ مجھے رنگوں کی مہک سے ابکائی آتی ہے۔ لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

''صبوحی! بحث مت کرو میں نے جو کہا ہے تمہیں وہی کرنا ہے اور انعام بھی حاصل کرنا ہے ہیں۔''

یہ ماما کا حتمی انداز ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد وہ کسی دلیل کو نہیں سنتی تھیں۔

''جی!''

میں نے بے دلی سے سر جھکا لیا تھا۔ میں ماما سے کسی بھی بات میں بحث نہیں کر سکتی تھی حتیٰ ہ اپنی زندگی کے بہت اہم معاملوں میں بھی نہیں جبکہ مجھے ماما سے بحث کرنا چاہیے تھی اور پاپا نے ما مجھے سمجھایا تھا۔

''بیٹا! یہ تمہاری زندگی ہے۔ اور تمہیں اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق ہے۔''

لیکن پتا نہیں ماما کے سامنے میں کبھی بول کیوں نہیں سکی تھی جیسے میں ان کے ٹرانس میں ہوا
اور میں ان کی مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہیں کر سکتی اور یوں میری زندگی کا ایک بہت اہم معا
میری بزدلی کی وجہ سے میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور سالوں اس کی کسک میرے دل میں ر
بلکہ اب بھی کبھی نہ کبھی کسک جاگ اٹھتی ہے تو دل چاہتا ہے پھوٹ پھوٹ کر روؤں حالانکہ عا
کتنا اچھا ہے کتنا خیال رکھتا ہے میرا۔ اور کس قدر محبت کرتا ہے مجھ سے لیکن وہ ایک درد جو سی
کہیں ٹھہر گیا ہے۔ کبھی کبھی کتنا بے کل کر دیتا ہے اتنا بے چین اور مضطرب کہ عاطی کی محبت بھ
درد کو کم نہیں کرتی۔ اور عاطی، ہاں عاطی ابھی کیا کہہ رہا تھا کہیں جانے کو مگر کہاں؟ میں
تصویر کی طرف دیکھا۔ تصویر بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی تھی حالانکہ اس تصویر پر میں نے کتنی مح
تھی پچھلے چار دنوں سے میں کام کر رہی تھی اس پر۔ اور اس سے پہلے میں نے کتنے ہی
بنائے تھے اور پھر پھینک دیے تھے کوئی ادھورے اور کوئی مکمل۔ کوئی بھی مجھے مطمئن نہیں کر
پھر یہ آئیڈیا مجھے اچھا لگا اور میں نے ماما سے بھی ڈسکس کیا تھا اور ماما نے بہت سراہا تھا۔

”میں جانتی تھی۔ میری بیٹی بہت ٹیلنٹڈ ہے۔“

ان کی آنکھیں اور لو دینے لگی تھیں۔ اور شاید ان کی آنکھوں کی یہی چمک تھی جو مجھ
وہ کام بھی کروا لیتی تھی جو میں نہیں بھی کرنا چاہتی تھی۔ یہ چمک میرے لیے ہوتی تھی۔

”فخر“

غرور، محبت اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا تھا اس چمک میں۔

”مجھے یقین ہے جانی! جب میں کراچی سے واپس آؤں گی تو تمہاری تصویر مکمل
گی۔ تمہیں پتا ہے ناں اس مقابلہ میں تصویر بھیجنے کے لیے صرف پندرہ دن رہ گئے ہیں۔“

”جی!“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”آپ نے بتایا تھا۔“

”تو بس پھر میری جان! آج سے ہی اس پر کام شروع کر دو۔“

وہ خود شام کی فلائٹ سے اپنی کمپنی کی کوئی نہایت اہم میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے
رہی تھیں اور اس ایک میٹنگ کے علاوہ بھی انہیں کئی کام تھے۔ انہیں تقریباً دس بارہ دن
رکنا تھا۔ ان کے جاتے ہی میں اپنے اسٹوڈیو میں گھس گئی تھی۔ اور چار دن سے مسلسل

تھی اگرچہ کچھ دیر کام کر کے مجھے تھوڑا RELAX ہونا پڑتا تھا۔ عجیب سی تھکن پورے وجود میں
اتر آئی تھی حالانکہ پہلے یہاں اسی اسٹوڈیو میں دس دس گھنٹے میں نے مسلسل ایزل کے سامنے
کھڑے ہو کر کام کیا ہے۔ لیکن ان دنوں پتا نہیں کیوں طبیعت اتنی مضمحل...... سی رہتی تھی پھر بھی
وقفے وقفے سے ہی سہی میں نے مسلسل چار دن تک کام کر کے اس تصویر کو مکمل کر لیا تھا۔ مگر یہ
تصویر ذرا بھی مجھے ایٹریکٹ نہیں کر رہی تھی امید کی روشنی کے بجائے پوری تصویر مایوسی کی دھند میں
ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”اف بھئی۔ آخر کیا کمی ہے اس تصویر میں۔“

میں نے غور سے دیکھا۔

پہاڑوں کے دامن سے نکلتا سورج۔

زمین پر بکھرا سبزہ اور کھلے ہوئے رنگ برنگے پھول۔

ان پر منڈلاتی تتلیاں۔

اور نامعلوم سمت سے آتی قوس قزح کے رنگ کی پھوار۔

اور پھولوں کے کنج میں بیٹھی۔

بڑی بڑی دلکش آنکھوں والی وہ بچی۔

اپنے گھیر دار فراک کے دامن میں پھول بھرے۔

میں نے برش رکھ کر قدرے پیچھے ہٹ کر تصویر کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”یہ عاطی بھلا کہاں جانے کو کہہ رہا تھا؟“

رات شاید وہ کسی جاب کا ذکر کر رہا تھا لیکن بھلا اسے جاب کی کیا ضرورت ہے ماما کا یہ سارا
ﺰنس اسے ہی تو سنبھالنا ہے اور پھر اتنے عرصے سے وہ سنبھال بھی رہا ہے۔ پھر بھلا جاب......؟
ات اس نے بتانے کی کوشش تو کی تھی لیکن پورا دن اسٹوڈیو میں گزار کر میں اتنی تھک چکی تھی اور
ری آنکھیں نیند سے اتنی بوجھل ہو رہی تھیں کہ بیڈ پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

”پلیز عاطی! صبح بات کرنا۔ اس وقت مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔“

”اور صبح تم اسٹوڈیو میں گھس جاؤ گی۔“ وہ روٹھا روٹھا لگ رہا تھا۔

"اچھا کہو۔"

میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔لیکن اس کی پوری بات تو میں نے سنی ہی نہیں تھی اور جو س بھی تھی وہ بھی جیسے زمین کی سلیٹ سے صاف ہوگئی تھی شاید اس نے کہیں جاب ملنے کی بات کی تھ کسی بہت اچھی جگہ پر اور اسے جاب ملنا تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔

اس نے ایم۔بی۔اے میں ٹاپ کیا تھا۔کوئی بھی کمپنی یا کوئی بھی ادارہ اسے اچھی جا دے سکتا تھا۔لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے بھلا جاب کی کیا ضرورت تھی۔وہ "انتخاب اینڈ ک کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا پھر بھلا۔

"عاطی! تم جاب۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ جاب کیوں کرنا چاہتا ہے اور اسے بتانا چاہتی تھی کہ ا اس بات کو ہرگز پسند نہیں کریں گی۔لیکن اس نے میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"صبو! پھر ہم دونوں اپنی مرضی سے جیئں گے...... بہت گھومیں گے۔تمہیں شوق اپنے ملک کا چپہ چپہ دیکھنے کا۔"

میں اس کے ہاتھوں کی حدت سے پگھل سی گئی تھی اور مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں اس کیا کہنے لگی تھی اس کی آنکھیں جذبے لٹا رہی تھیں۔

"اور صبو! ہم کاغان جائیں گے اور سوات بھی۔"

شاید وہ یہی کہہ رہا تھا میں نے یاد کرنے کی کوشش کی سوتے سوتے جو جملے میرے کا میں پڑے تھے وہ کچھ اس طرح کے تھے شاید وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم خوب گھومیں گے صبوحی زندگی کو اس کے اصل رنگوں کے ساتھ محسوس کریں گے گھٹن زدہ ماحول سے باہر جہاں سانسیں بھی اپنی نہیں ہیں کھلی فضا میں خوب انجوائے کریں گ

وہ کتنا خوش لگ رہا تھا اور اس روز خوش تو میں بھی تھی۔حالانکہ میں بہت بے دلی سے بنا رہی تھی۔پھر بھی میں خوش تھی اور چاہ رہی تھی کہ وہ اپنی بات ختم کرلے۔تو میں اسے بتا اور وہ کس قدر ضروری بات تھی۔جو میں اسے بتانا چاہتی تھی لیکن میں تو اس کی باتیں سنتے سوگئی تھی۔

"افوہ! وہ کیا ضروری بات تھی جو مجھے عاطی کو بتانا تھی۔"

میں نے اپنی پیشانی کو دبایا اور سوچا۔

"اور یہ عاطی کیا اکیلا ہی گھومنے جا رہا ہے میرے بغیر" اور بے اختیار پلٹ کر میں نے اسے آواز دی۔

"عاطی!"

وہ دروازے کی دہلیز پار کر چکا تھا۔میری آواز پر یکدم پلٹا۔اس کا چہرہ روشن ہوگیا تھا ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور آنکھوں میں رنگوں کی برسات ہونے لگی تھی جیسے کوئی امید کا تارا۔

کوئی اس کا جگنو اس کے ہاتھ آ لگا ہو۔اور اس تارے اور اس جگنو نے اس کی آنکھوں میں رنگوں کی برسات اتار دی ہو۔

"صبوحی!" اس کی آواز ایک دم بوجھل ہوگئی تھی یا پھر مجھے لگی تھی۔

"تم نے مجھے بلایا کیا تم نے.........."

"ہاں عاطی! دراصل مجھے ایک ضروری بات بتانا تھی تمہیں۔"

میں نے دونوں انگلیوں سے پھر پیشانی کو دبایا اور اس کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں امید کے جو تارے دمک رہے تھے ان سے اس کا پورا چہرہ روشن ہوگیا تھا دفعتاً میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور مجھے اپنی تصویر کی خامی کا پتا چل گیا۔میں اس سے کچھ کہتے کہتے ایک دم مڑ گئی اور میں نے تصویر کو دیکھا۔

بچی کی آنکھیں اداس بے رنگ اور ویران تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا امید کی روشنی کی کوئی لپک نہ تھی۔

جھولی میں پھول بھرے ہونے کے باوجود آنکھوں میں مایوسی کی تھکن تھی اور مایوسی کا یہ تاثر پورے ماحول کو افسردہ کر رہا تھا اور منظر کو دھندلا بنا رہا تھا۔

بچہ تو بذات خدا ایک امید ہوتا ہے اور خدا کا یہ پیغام لے کر دنیا میں آتا ہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔اور میں نے اسے پینٹ کرتے ہوئے اسے امید کا پیامبر بنانے کے بجائے مایوسیوں کا علمبردار بنا دیا تھا۔

میں نے کینوس ایزل سے اتار کر پھینک دیا اور خود تھکی تھکی سی کرسی پر گر گئی۔ ماما کے آنے میں صرف چھ دن رہ گئے تھے اور تصویر نہیں بن سکی تھی۔ میں نے آنکھیں موند کر سر کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ اور سوچا ذرا سا ریلیکس ہو جاؤں تو پھر نئے سرے سے تصویر بنانا شروع کرتی ہوں۔ لیکن یکا یک مجھے لگا جیسے سارا کھایا پیا باہر آ جائے گا۔ میں واش روم کی طرف بھاگی اور کلی کرتے ہوئے مجھے اچانک یاد آیا کہ وہ کیا ضروری بات تھی جو مجھے عاطی کو بتانا تھی تو میں یونہی ہاتھ پونچھے بغیر باہر کی طرف لپکی۔

”عاطی! عاطی!“

میں اسے پکارتی ہوئی اسٹوڈیو سے باہر آ گئی میرے رخساروں پر آپوں آپ شفق اتر آئی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ وہ کس قدر خوش ہو گا یہ سن کر۔

اسے تو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔

اور کتنا انتظار تھا اسے اس لمحے کا۔

اور میں اتنی اہم بات اسے بتانا بھول گئی تھی۔

”عاطی!“ میں اسے پکارتے ہوئے کوریڈور تک آ گئی۔

”عاطی میاں تو چلے گئے۔“

بابا جانے کس کونے سے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”اچھا چلے گئے“ میرے چہرے کے رنگ مدھم پڑ گئے۔

”مگر گڑیا رانی! عاطی میاں گئے کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں“ وہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے واپس پلٹی۔

”بیٹا! وہ آپ کو بتا کر نہیں گئے۔“ بابا سامنے آ گئے۔

”جی!“ میں سٹپٹا گئی میں نے پوچھا نہیں تھا لیکن وہ کہہ رہا تھا کہیں بھی۔

”مگر کہاں؟“

میں نے پریشانی سے سوچا۔

”بھلا عاطی کہاں جا سکتا ہے کیا گاؤں میں مگر بھلا وہاں اس کا ہے ہی کون........

کے سوا اور کوئی بھلا اس کا کہاں ہے۔“

”بیٹا! اتنی بے نیاز نہ رہا کرو۔ شوہر ہے وہ تمہارا تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا ناں کہ کہاں جا رہا ہے بڑا اٹیچی تھا ساتھ لگتا ہے زیادہ دنوں کے لیے گیا ہے۔“

”ہاں وہ شاید کہیں گھومنے گیا ہے شمالی علاقہ جات کی سیر کو رات کچھ بتایا تو تھا اس نے لیکن میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔“

”تو گڑیا رانی! آپ بھی چلی جاتیں ساتھ کتنا پیلا رنگ ہو رہا ہے۔“

”ہاں عاطی نے کہا تو تھا لیکن میں.......... مجھے تصویر بنانا تھی۔“

”تصویر تو پھر بھی بن سکتی تھی گڑیا رانی! لیکن آپ کو عاطی میاں کے ساتھ ہی جانا چاہیے تھا تبدیلی آب و ہوا کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی۔“

اور اب بابا کو کیا پتا کہ تصویر پھر نہیں بن سکتی یہ ماما کی پرائیڈ کا سوال ہے وہ مسز بخاری سے کبھی بھی کسی بھی معاملے میں نیچے نہیں ہونا چاہتیں۔

اور بابا ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں وقتاً فوقتاً اور بابا کی باتیں مجھے متاثر بھی کرتی ہیں لیکن پھر ماما کی باتیں بابا کی باتوں پر حاوی ہو جاتی ہیں ماما کی باتیں زیادہ پاورفل ہیں وہ لمحوں میں ہر پچھلا۔ تاثر ختم کر کے بڑی سے بڑی بات کو ختم کر دیتی ہیں۔ شاید میں ماما سے بہت زیادہ مرعوب ہوں تب ہی تو بابا کی باتوں کو دل میں تسلیم کرنے کے باوجود میں ان پر عمل نہیں کر پاتی بابا کہتے ہیں کہ مجھے عاطی کا خیال رکھنا چاہیے۔

مرد بھی بچے کی طرح ہوتا ہے اور اسے بھی ہر وقت دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر بیوی لاپروائی کرے تو وہ گھر سے دور ہو جاتا ہے۔

اور ماما کہتی ہیں۔

یہ جاہل عورتوں کے کام ہیں مرد کے آگے پیچھے پھرنا اس کے پاؤں دبانا اور اس کی چاکری کرنا ایسی ہی باتوں نے تو مرد کو سر پر چڑھا دیا ہے اور وہ اپنے سامنے عورت کو کچھ نہیں سمجھتا اور ہر لمحہ اس کی انا کو کچلتا رہتا ہے اور ماما تو کبھی کبھی بابا کو بھی جھاڑ دیتی ہیں۔

”ماموں! آپ صبوحی کو الٹی سیدھی پٹیاں نہ پڑھایا کریں۔“

حالانکہ بابا وہ واحد شخصیت ہیں جو ماما کو ٹوک بھی دیتے ہیں تو وہ خاموش رہتی ہیں دراصل بابا کسی دور پار کے رشتے سے ماما کے ماموں لگتے ہیں۔ وہ کب یہاں ''انتخاب بلڈنگ'' میں آئے مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں نے تو جب سے آنکھ کھولی ہے۔ انہیں یہاں ہی دیکھا ہے سفید جھاگ بالوں والے بابا۔

بے حد مشفق اور مہربان ہیں۔

بچپن میں ان کی گود میں سر رکھ کر میں نے کہانیاں سنی ہیں اور ان کے ساتھ کئی کھیل کھیلی ہوں۔

لڈو اور کیرم۔

حتیٰ کہ میرے گڑیوں کے کھیل میں بھی بابا پورے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے میرے ساتھ مل کر جھوٹ موٹ کے کھانے تیار کرتے اور کھاتے تھے لیکن ان کا احترام کرنے کے باوجود ماما نے اس بات کو کبھی پسند نہ کیا کہ میں زیادہ دیر بابا کے پاس رہوں سو میں ماما کی موجودگی میں بابا کے پاس کم ہی جاتی تھی کہ بچپن سے ہی مجھے ماما سے خوف آتا ہے شاید اس وقت سے جب پاپا اور ماما میں علیحدگی ہوئی تھی اور پاپا اس گھر سے چلے گئے تھے۔

تب بھی بابا نے ماما کو سمجھایا تھا۔

''کمال میاں صبوحی کے باپ بھی ہیں روشن آرا بیٹی۔''

''ماموں پلیز۔ آپ اس معاملے میں کچھ نہ بولیں۔''

لیکن بابا پھر بھی انہیں سمجھانے سے باز نہ آئے تھے۔

''روشن آرا بیٹی! اسے روک لو۔ مرد کا قدم ایک بار آگے نکل جائے تو پھر وہ پیچھے پلٹ نہیں آتا۔ صبوحی کو ان کی ضرورت ہے روشن آرا۔''

''اور یہی تو میں اسے بتانا چاہتی ہوں ماموں کہ صبوحی کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کے سائے کے بغیر بھی پل سکتی ہے اور یہ آپ مردوں کے پاس بہت اچھا ہتھیار رہتا ہے کہ۔ کیسے پلیں گے۔''

بابا خاموش ہو گئے تھے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ماما اپنے فیصلوں میں کتنی سخت اور پختہ ہیں مجھے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ پاپا اور ماما کی علیحدگی کی کیا وجہ ہے لیکن میرا دل اس علیحد

انتہائی دکھی تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ قصور کس کا ہے پاپا کا ماما کا لیکن میرا دل پاپا کو ہی مظلوم سمجھ رہا تھا اور پاپا کے جانے کے بعد میں کتنے ہی دن چھپ چھپ کے روتی رہی تھی اور جب پاپا جا رہے تھے تو میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ پاپا مجھے اپنے ساتھ لے جائیں زبردستی۔

حالانکہ میں پاپا یا ماما دونوں سے ہی زیادہ قریب نہ تھی دونوں کی اپنی اپنی لائف تھی اور میرے لیے تو دونوں کے پاس ہی زیادہ وقت نہ تھا ماما بہت سوشل تھیں۔

اور پاپا کا بزنس بہت وسیع تھا۔

اور میں ایسے میں بہت بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی پھر بھی میری خواہش تھی کہ پاپا مجھے اپنے ساتھ لے جائیں لیکن پاپا نے بہت رسان سے مجھے سمجھایا تھا۔

''دیکھو بیٹا! تمہاری ماما کو تمہاری ضرورت ہے تم اگر میرے ساتھ چلی گئیں تو وہ تو اکیلی ہو جائیں گی۔''

''اور آپ؟''

''میں'' ان کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں میں تو مرد ہوں ناں میری زندگی! اور میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں لیکن تمہاری ماما۔

میں اگرچہ تب نو دس سال کی تھی پھر بھی مجھے پتا تھا کہ ماما پاپا سے زیادہ بہادر ہیں اور وہ بھی اکیلی رہ سکتی ہیں۔ لیکن میں نے پاپا سے یہ سب نہیں کہا تھا اور اس ایک بات پر کہ پاپا مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ میں ابھی تک شاید دل میں پاپا سے خفا تھی۔ پاپا کے چلے جانے سے رازی نے بھی تو آنا چھوڑ دیا تھا اور رازی سے میری کتنی دوستی تھی وہ جب بھی آتا تھا مجھے اس کے ساتھ کھیلنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تھا بھی تو خوبصورت سا براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والا اور کس قدر شرارتیں کرتا تھا وہ.......... ماما کو اس کا آنا کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

پاپا ہمیشہ ان سے معذرتیں کرتے۔

مجھ سے بہت مانوس ہے ضد کرنے لگا آنے کی اور میں انکار نہیں کر سکا بچہ ہے کیا کروں وہ مجھ سے تھوڑا سا ہی بڑا تھا شاید ایک سال یا چند مہینے لیکن وہ مجھ پر یوں حکم چلاتا جیسے بہت بڑا ہو۔

''دیکھو ادھر نہ جانا ماما کی اسٹڈی میں۔ میں اسے سمجھاتی ان کی کتابوں کو نہ چھیڑنا وہ غصہ ہوں گی۔''

''واہ کیوں نہ جاؤں میرے چاچو کا گھر ہے اور کتابیں تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور جب میں بڑا ہوں گا ناں تو تمہاری ماما کی یہ ساری کتابیں پڑھ لوں گا۔''

''ماما تمہیں نہیں پڑھنے دیں گی۔''

میں اسے ڈراتی لیکن وہ ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا اور اس کی سب سے زیادہ یہی بات مجھے بھاتی تھی کہ وہ ماما سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ اور جب پاپا اس گھر سے چلے گئے تھے تو مہینوں میں نے پاپا کے ساتھ ساتھ اسے بھی یاد کیا تھا۔ اور جب کبھی پاپا کا فون آتا تو میرا بہت جی چاہتا تھا کہ میں اس کے متعلق پوچھوں لیکن پتا نہیں کیوں میں کبھی نہ پوچھ سکی ہاں پاپا خود ہی کبھی کبھی بتا دیتے کہ رازی تمہیں یاد کر رہا تھا یا وہ تمہیں سلام کہہ رہا ہے ماما جب گھر پر نہ ہوتیں پاپا مجھے فون کرتے اور مجھ سے ڈھیروں باتیں کرتے۔

• معلوم نہیں انہیں کیسے پتا چل جاتا تھا کہ ماما گھر پر نہیں ہیں۔ اور کون انہیں میرے متعلق بتاتا تھا کہ وہ میری ہر بات سے باخبر ہوتے تھے۔

میں بیمار پڑتی خواہ معمولی فلو ہی کیوں نہ ہوتا۔

ان کا فون آجاتا۔

میرا رزلٹ آتا۔

میں اداس ہوتی پتا نہیں۔ کون انہیں یہاں کی خبریں دیتا تھا۔ شاید بابا لیکن میں نے بابا کو کبھی انہیں فون کرتے نہیں دیکھا تھا۔ جانے کب وہ پاپا کو یہ سب بتاتے تھے اور یہ معمول اب بھی جاری تھا۔

اب بھی پاپا اسی طرح اسی باقاعدگی سے فون کرتے تھے جب کبھی ماما گھر پر نہ ہوتیں۔

اور جن دنوں ماما باہر جاتی تھیں تو پھر تو وہ ہر روز ہی فون کرتے تھے چاہے کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوتے تھے لیکن اس بار ہاں اس بار انہوں نے فون نہیں کیا تھا حالانکہ ماما کو کراچی گئے چھ سات دن ہو گئے تھے۔

''ارے کہیں وہ بیمار ہی نہ ہوں پھر وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہیں پتا نہیں کوئی ان کی دیکھ بھال بھی کر رہا ہو گا یا نہیں اور.........اور وہ رازی..........''

دل میں اس نام سے ایک ہوک سی اٹھی۔

پتا نہیں کیوں اس کا نام اب بھی دل میں کسک سی پیدا کرتا تھا وہ بھی تو پاکستان میں نہیں ہے۔

میں نے پریشان سا ہو کر بابا کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہاں ہی کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''بابا! پاپا کا تو فون نہیں آیا تھا۔''

حالانکہ مجھے پتا تھا اگر پاپا کا فون آتا تو وہ مجھے بھلا نہ بتاتے۔

''وہ تو آج کل ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں امریکہ اور یہ سوچے بغیر کہ بھلا بابا کو کیسے پتا کہ پاپا یہاں نہیں ہیں میں مطمئن سی ہو کر اسٹوڈیو میں آگئی۔''

''اور مجھے پاپا سے ملے کتنا عرصہ ہو گیا۔''

اسٹوڈیو میں آ کر اپنی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے میں نے سوچا۔

تقریباً تین سال۔

ہاں تین سال پہلے پاپا مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اور اس شام بھی ماما یہاں پر نہیں تھیں...... لیکن جانے سے پہلے وہ اپنا حتمی فیصلہ مجھے سنا گئی تھیں۔

''بحث نہیں کرو صبو! میں جانتی ہوں کہ عاطی کے ساتھ ہی تم خوش رہ سکتی ہو اور عاطی ہر لحاظ سے تمہارے لیے مناسب ہے۔''

حالانکہ میں نے تو ماما سے کبھی بحث نہیں کی تھی۔ اور اب بھی کوئی بحث نہیں کی تھی بس اتنا ہی کہا تھا کہ ابھی مجھے شادی نہیں کرنا لیکن ماما ہمیشہ ہی کہتی تھیں۔

''صبو! بحث نہیں کرو۔''

اور میں اپنے بستر پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی کہ بابا نے آ کر بتایا تھا کہ پاپا آئے ہیں مجھ سے ملنے پاپا جب سے اس گھر سے گئے تھے کبھی یہاں نہیں آئے تھے البتہ جب میں نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا تو وہ کبھی کبھی مجھے کالج سے چھٹی کے بعد مل لیا کرتے تھے کالج گیٹ سے ذرا پرے ان کی سیاہ گاڑی ہفتے میں ایک بار ضرور مجھے اپنی منتظر ملتی تھی اور پھر جب نیشنل کالج آف

آرٹ میں مجھے رازی ملا تھا تو کبھی کبھی میں اس کے ساتھ ان سے ملنے چلی جاتی تھی۔

اور رازی بھی بالکل اچانک ملا تھا۔ مجھے میں سر اعجاز کے ساتھ نادیہ علی کی پینٹنگ پر باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی کہ وہ اچانک سامنے آ گیا اور سر اعجاز نے تعارف کروایا۔

"یہ رازی ہے ہمارے کالج کا ایک ہونہار اسٹوڈنٹ اور یہ صبوحی کمال ہیں یقیناً یہ بھی ایک دن اپنے کالج کا نام روشن کریں گی۔"

"صبوحی کمال!" وہ ذرا سا چونکا تھا آپ سے کر خوشی ہوئی۔

"تھینک یو۔"

میں نے اسے بالکل بھی نہیں پہچانا تھا۔ اور نہ ہی ناموں کی مماثلت نے مجھے چونکایا تھا۔ در اصل میرا اسارا دھیان نادیہ کی پینٹنگ کی طرف تھا۔ جس کی نمائش کے انتظام سر اعجاز بذات خود کر رہے تھے اور اس سلسلے میں ان کی مدد کر رہی تھی۔ نادیہ اس کالج کی ایک سابق اسٹوڈنٹ تھی لیکن شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور بہت بعد میں ایک بار اس نے بتایا تھا۔

"میں تمہارا نام سن کر چونکا تھا اور پھر تمہارے اس تل نے جو تمہارے بائیں رخسار پر ہے مجھے بتایا تھا کہ تم صبوحی ہو میرے چاچو کی بیٹی۔ لیکن پھر میں نے چاچو سے بھی تصدیق کر لی تھی کہ تم یہاں ہی زیر تعلیم ہو۔ اور تم سے تمہاری ماما کا نام بھی پوچھ لیا تھا بعد کی کسی ملاقات میں۔"

لیکن بہت عرصہ تک اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا البتہ اس پہلی ملاقات کے بعد دوسرے روز بھی میری اس سے ملاقات ہوئی تھی شاید پاپا سے تصدیق کرنے کے بعد وہ دانستہ وہاں آیا جہاں میں کچھ دوسری کلاس فیلوز کے ساتھ بیٹھی تھی اور پھر پتا نہیں چلا کب اور کیسے وہ۔

"تم صبوحی ہو نا.........کمال انکل کی بیٹی۔" ایک روز جب ہم دونوں کالج لان میں بیٹھے تھے تو اس نے انکشاف کیا۔

"ہاں!" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اور میں رازی ہوں.........ایاز جمال رازی تمہیں یاد ہے نا بچپن میں چاچو کے ساتھ میں تمہارے گھر آتا تھا۔"

اور میری آنکھوں کے سامنے رازی آ گیا جسے مہینوں میں نے یاد کیا تھا......

"اور جب میں یہاں داخلہ لے رہا تھا تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ ایک دن یہاں مجھے تم مل جاؤ گی۔"

"اور میں.........میں نے تو کبھی بھی یہاں اس کالج میں ایڈمیشن کا نہیں سوچا تھا۔ میں تو پاپا کی طرح آرکیٹیکٹ بننا چاہتی تھی.........بچپن سے ہی مجھے ڈرائنگ سے دلچسپی تھی اور جیومیٹریکل ڈیزائن اور اسکیچ بناتی رہتی تھی لیکن میں نے سوچا ہوا تھا کہ میں آرکیٹیکٹ بنوں گی لیکن ماما مجھے آرٹسٹ بنانا چاہتی تھیں۔"

یہ میری خواہش ہے صبو اور پھر یہ قدرتی صلاحیت ہے تمہارے اندر پینسل تمہارے ہاتھ میں آ کر جان دار ہو جاتی ہے وہ میرے پینسل سے بنائے گئے اسکیچز کو سراہتیں۔

"مگر ماما! مجھے شوق نہیں ہے۔"

"بحث نہیں کرو صبو!"

اور ہمیشہ کی طرح میں خاموش ہو گئی تھی کہ میں ماما کی کسی بات سے انحراف نہیں کر سکتی تھی اور میں ایک دن بھی کالج آ کر خوش نہیں ہوئی تھی......لیکن اس روز پہلی بار مجھے خوشی ہوئی تھی اور اس روز رازی مجھے اپنے ساتھ پاپا سے ملانے لے گیا تھا اور پاپا بھی بہت خوش ہوئے تھے......

"اس گھر میں ہر جگہ میں نے تمہارے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ اور تمہیں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔"

پاپا کا گھر بہت خوبصورت تھا اگرچہ وہ اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کہ "انتخاب منزل" تھی لیکن مجھے وہ بہت اچھا لگا تھا۔ اور پاپا کے بیڈروم میں میری بڑی سی تصویر لگی تھی دس سال کی عمر کی اور اس کے علاوہ بھی پاپا کے پاس میری ہر عمر کی تصاویر تھیں اور یہ تصاویر کون بھجواتا تھا انہیں یقیناً بابا ہی......لیکن میں نے کبھی اس کی تصدیق نہیں کی۔

اور انہی دنوں ماما عاطی کو لے آئیں۔

عاطی میرے سگے ماموں کا بیٹا تھا لیکن میں ان سے کبھی ملی نہیں تھی بابا نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ میرے نانا نے انہیں عاق کر دیا تھا اور پھر وہ کبھی "انتخاب منزل" نہیں آئے تھے۔ اور حیدر آباد میں رہتے تھے ماما سے جانے کب اور کیسے ملے تھے معلوم نہیں لیکن نانا کی وفات کے بعد ماما

نے انہیں واپس آنے کی دعوت دی تھی بلکہ خود لینے گئی تھیں۔ لیکن وہ اتنے خوددار تھے کہ انہوں نے آنا پسند نہ کیا اور نہ ہی باپ کی جائیداد میں سے کچھ لینا گوارا کیا ہاں ایک بار ماما کے اصرار پر وہ جاں بلب ماں سے ملنے آئے تھے اور پھر ان کی وفات کے بعد واپس چلے گئے لیکن شاید ماما سے ان کا رابطہ تھا جب ہی تو ان کی وفات کے بعد وہ عاطی کو ساتھ لے آئی تھیں۔

''یہ عاطف ہے۔''انہوں نے مجھ سے تعارف کروایا تھا یہ اب یہاں ہی رہے گا۔

انہوں نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے.........یہ تو بعد میں بابا نے بتایا تھا کہ عاطی کی والدہ تو بہت پہلے وفات پا گئی تھیں اور اب والد بھی جو میرے سگے ماموں تھے فوت ہو گئے ہیں۔

عاطی کے ساتھ میری زیادہ بات نہیں ہوتی تھی وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا خاموش طبع سا لڑکا تھا۔ اور طبعاً میں بھی گم گو تھی.........یہ تو رازی تھا جو کالج میں وہاں مجھے بولنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسا اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا کبھی کبھار کھانے پ ناشتے کی ٹیبل پر رسمی سی بات چیت ہو جاتی تھی بس۔ میں نے تو کبھی اسے دھیان سے دیکھا بھی نہ تھا اور ماما میری شادی اس کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اس نے اسی سال شاندار نمبروں کے ساتھ ایم۔ بی۔ اے کیا تھا۔ اور ماما کا خیال تھا کہ اس کی کامیابی کی خوشی میں دی جانے والی پارٹی میں وہ اس منگنی کا اعلان کر دیں گی.........اور ایک سال بعد شادی ہو گی تب تک وہ عملی زندگی میں سیٹ ہو چکا ہو گا۔

اور مجھے لگتا تھا جیسے میرا دل پگھل کر پانی ہو جائے گا.........میں ماما کو بتا بھی نہیں سکی میں.........میں رازی کو.........اور مجھ پر یہ انکشاف اچانک ہوا تھا کہ میں رازی سے۔

ایک لمحے کو تو میں خود ششدر رہ گئی تھی۔ یہ کیسا درد سا جاگ اٹھا تھا میرے دل میں......

تمام رات مضطرب و بے چین رہی.........صبح میں نے ماما کو بتایا تھا کہ مجھے کچھ ضروری چیز لینے کالج جانا ہے حالانکہ میرا تعلیمی سلسلہ ختم ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔

ماما جلدی میں تھیں اس لیے انہوں نے وضاحت نہیں چاہی تھی اور میں نے رازی کو فو کہ وہ کالج آ جائے۔

''ارے سچ!''وہ بے تحاشا خوش ہو گیا تھا۔ ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ ایک ہی دن ملاقات ہو گی جب سہرا باندھ کر آؤں گا۔

''تو.........تو کیا وہ بھی.........''

ایک لمحہ کو میں حیران رہ گئی تھی۔

''صبوحی.........''رازی مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تم.........تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

اور میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

''کیا ہوا پلیز۔''وہ پریشان ہو رہا تھا پلیز صبوحی کچھ تو کہو۔

اور میں روئے چلی جا رہی تھی میں بھلا کیا کہتی اس سے ہمارے درمیان دل کے موسم تو کبھی زیر بحث ہی نہیں آئے تھے پھر بھی جیسے ہم دونوں کے درمیان تعلق کا جو دھاگا سا بندھا تھا وہ بڑا! مختلف بڑا انوکھا تھا۔

رازی میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے بتایا ماما عاطی سے میری منگنی کر رہی ہیں۔

''نہیں''وہ بھی بھونچکا رہ گیا یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے.........تم نے ماما کو منع نہیں کیا صبوحی......تم نے انہیں بتایا نہیں کہ......اور کیا بھلا یہ ضروری تھا کہ میں ہر لمحہ زبان سے تمہیں کہتا رہتا کہ۔

I Love You.........کیا تمہیں پتا نہیں تھا۔

وہ بے ربط سا بول رہا تھا اور شدید اضطراب کے عالم میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑے جا رہا تھا۔

''یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہر لمحہ کہتا......آئی لو یو......اور مجھے پتا تھا کہ......لیکن ماما......ماما تو ہمیشہ سے اپنے فیصلے مسلط کرنے کی عادی تھیں۔''

''یہ ناممکن ہے صبوحی میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''اور ماما؟''میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''چلو چل کر چاچو سے بات کرتے ہیں۔''وہ ایک دم پر یقین نظر آنے لگا تھا۔

''چاچو! میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔''

میرا ہاتھ تھامے وہ پاپا کے سامنے کھڑا تھا۔ اور پاپا نے جو اچانک مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہو گئے تھے۔ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''یہ پوچھنے کی تمہیں کیوں ضرورت پیش آ گئی۔''

وہ مسکرائے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اپنے بیٹے کو دیکھے اتنی مدت ہو گئی تھی کیسی ہو اور ماما کیسی ہیں تمہاری.........''

وہ جب بھی ملتے تھے ماما کی خیریت ضرور پوچھتے تھے اور ماما نے تو شاید کبھی ان کے متعلق ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا ہو۔

''چاچو!'' رازی نے پھر انہیں متوجہ کیا۔

''اپنے بیٹے کیسے لگتے ہیں؟'' پاپا نے الٹا سوال کر دیا۔ اور پھر اسے خاموش دیکھ کر خود جواب بھی دے دیا۔

''تم تو میری جان ہو رازی اور مجھے تم پر فخر ہے۔''

''تو پھر'' رازی ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''صبوحی کے لیے مجھے قبول کر لیں۔''

پاپا ایک لحہ کو تو اس کی جرات پر بھونچکا سے رہ گئے تھے۔ بلاشبہ وہ ان سے بہت بے تکلف بلکہ وہ انہیں اپنے چاچو سے زیادہ دوست سمجھتا تھا۔ اور بہت عرصہ پہلے جب پاپا یہاں اس گھر منتقل ہوئے تھے۔ تو وہ ان کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔ اپنے گھر تو وہ کبھی کبھار ہفتہ دس دن جاتا تھا۔

''چاچو اکیلے تھے ناں اور اداس بھی تو میرے ابا نے مجھے چاچو کو دے دیا اور اب میں بیٹا ہوں۔''

ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا۔

میں پاپا کی خاموشی پر سہمی سی ان کا ردعمل جاننے کی کوشش میں ان کے چہرے پر جمائے کھڑی تھی ایک دم پاپا زور سے ہنس پڑے۔

''بہت شریر ہو گئے ہو تم.........''

اور پھر انہوں نے اٹھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''کیا تم میری بیٹی کے قابل ہو اتنی پیاری ہے میری بیٹی۔''

''یہ تو ہے لیکن آپ کا بیٹا بھی کم نہیں ہے۔''

اس نے کالر سے فرضی گرد جھاڑی پاپا کی آنکھوں میں ایک دم خوشی کے تارے جگمگ جگمگ کرنے لگے تھے۔

''ہم سوچیں گے پاپا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور اب تم بھاگو یہاں سے تمہارے ابا کا فون آ چکا ہے کئی بار بلا رہے ہیں تمہیں۔''

''خیریت''

''ہاں خیریت ہے مونا کے سسرال سے لوگ آ رہے ہیں دعوت ہے۔''

مونا رازی کی بہن تھی۔

''اور کیا آپ نہیں چلیں گے۔''

''میں کچھ دیر سے آؤں گا صبوحی کو ڈراپ کر کے۔''

میں نے کالج سے گاڑی واپس بھیج دی تھی۔ اور اس روز پاپا بہت خوش تھے وہ جیسے مجھے وہاں اس اپنے گھر میں دیکھنے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔

''اور یہ کتنا اچھا ہو گا صبوحی.........اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے''

''لیکن'' میں رونے لگی ماما تو میری منگنی عاطی سے کرنے لگی ہیں۔

''اور تمہیں عاطی پسند نہیں ہے؟''

پاپا کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔

''میں نے اس کے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا۔''

''تو ٹھیک ہے بیٹا! تم اپنی ماما سے بات کرو پہلے اور پھر میں رازی کے لیے بات کرتا ہوں''

میں از حد مایوس تھی۔

''یہ زندگی تمہاری ہے صبوحی اور اسے تم نے گزارنا ہے تمہاری ماما نے نہیں۔''

''پاپا نے مجھے بہت حوصلہ دیا تھا لیکن میں ماما سے بات نہ کر سکی۔ رازی کا ذکر ہی کیا میں تو

انہیں یہ بھی نہ بتا سکی۔ کہ میں عاطی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اور میں نے اس کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا۔“

پاپا ان دنوں از حد پریشان تھے رازی نے مجھے بتایا تھا۔

”آخر تم کچھ کہتی کیوں نہیں ہو اپنی ماما سے۔“

”میں ان کے سامنے بول نہیں سکتی۔“

”تو پھر کیا ہوگا صبوحی تم خاموشی سے عاطی سے شادی کر لوگی اور میں...... میں کیا کروں گا“

وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

”مجھے ہی خود کرنا ہوگا صبو! تم کچھ نہیں کر سکتیں کچھ فائدہ نہیں۔“

میں نے ہمت ہار دی تھی تم ماما کو نہیں جانتے۔

”جانتا ہوں تم سے زیادہ جانتا ہوں تمہاری ماما انتہائی خود پسند ہیں اور جس طرح انہوں چاچو کی زندگی تباہ کی ہے اس طرح وہ تمہاری زندگی بھی تباہ کر دیں گی......... پلیز صبو اپنے سوچو چلو تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں پھر چاچو کے پاس چلتے ہیں تم ایک بالغ لڑکی اپنی ذات کے متعلق خود فیصلے کر سکتی ہو......... اور پھر تم اپنے باپ کے گھر آؤ گی کسی غیر کے نہیں اور کل ہی چاچو ہمارا نکاح کر دیتے ہیں۔“

”نہیں پلیز نہیں“

میرے اندر اتنی ہمت نہ تھی شاید میں اتنی بہادر نہ تھی کہ ماما کی خفگی برداشت کر سکتی اس خ سے ہی میرا دل بند ہونے لگتا تھا کہ ماما خفا ہوں گی ناراض ہوں گی۔

”تو ٹھیک ہے پھر مجھے مت یاد کرنا کبھی۔“

اس نے غصے سے ریسیور رکھ دیا تھا اور میں خاموشی سے رونے کے سوا کچھ نہ کر سکی تھ

اسی شام رازی اپنے والد اور والدہ کے ساتھ آ گیا تھا ماما انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی تھیں۔

”تمہاری اور کمال کی نہ نبھ سکی یہ مقدر کی بات ہے لیکن ہم رازی کا پرپوزل صبوحی کے لے کر آئے ہیں کہ وہ کمال کی بیٹی ہے ہماری اپنی ہے اور رازی پر سب سے زیادہ حق اس کا۔

رازی کے والد جو میرے سگے تایا ہوتے تھے......... بالکل پاپا کی طرح ہی تھے ا

لمبے خوبصورت اور نرم خو میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔

ماما نے خلاف توقع ان سے نرم لہجے میں معذرت کر لی۔

”صبوحی کا رشتہ تو طے ہے میرے بھتیجے کے ساتھ۔“

”پھر بھی آپ سوچیے گا کہ یہ بچوں کی پسند کا معاملہ بھی ہے زندگی انہوں نے گزارنی ہے“

رازی کے والد جاتے جاتے کہہ گئے تھے اور ماما سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ میرے کمرے میں آئی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے صبوحی؟“

لیکن میں تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی تھی بس خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

”اور یہ ناممکن ہے“

وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں اور پھر پاپا نے بھی فون پر بات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ میری بیٹی کہاں اور کس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔“

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے مجھے لگتا جیسے میرا دل کٹ کٹ کر گر رہا ہو...... میں زیادہ تر کمرے میں ہی گھسی رہتی تھی۔ بہت کم کھاتی پیتی تھی جس سے میرا رنگ زرد ہو گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ لیکن ماما کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ مجھے دیکھتیں اور میرے دل کا لہو انہیں نظر آتا وہ بے طرح مصروف تھیں اور عاطی کو بھی ساتھ ساتھ لیے پھرتیں عاطی ان کے ساتھ ہی آفس جاتا تھا۔ عاطی کو ماما نے اپنی کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا تھا...... اور وہ عاطی سے بہت خوش تھیں.........

پھر اچانک ہی انہوں نے میری اور عاطی کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کی خبر انہوں نے مجھے صرف پندرہ دن پہلے دی اس روز وہ کراچی جا رہی تھیں۔

میں دو ماہ تک باہر جا رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ جانے سے پہلے تمہاری شادی کر دوں سو میں نے اور وہ اکثر سال دو سال بعد باہر کا چکر لگایا کرتی تھیں۔

”مگر ماما! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

میں نے بہت آہستگی سے کہا تھا لیکن ماما نے میرے چہرے کی طرف دیکھا تھا نہ میری آنکھوں میں پھیلتے آنسوؤں کو اور نہ میرے لہجے میں بکھرتے درد کو اور حسب معمول سخت لہجے میں مجھے ٹوک دیا تھا۔

"بحث نہیں کرو صبو..........! تم عاطی کے ساتھ خوش رہو گی۔"

اور ان کے جانے کے بعد پاپا آ گئے تھے..........اور گھر سے جانے کے بعد پہلی بار...... جیسے انہیں میرے دل کے کٹنے کی خبر ہو گئی تھی۔

"پاپا!" میں ایک دم ان کے سینے سے جا لگی..........اور بہت دیر تک یوں ہی ان سے لپٹ روتی رہی اور وہ ہولے ہولے مجھے تھپکتے رہے..........جب انہوں نے مجھے الگ کیا تو ان کی اپنی آنکھیں بھی خون رنگ ہو رہی تھیں۔

"صبوحی بیٹا! عاطی اچھا لڑکا ہے میں اس سے ملا ہوں نرم خو اور محبت کرنے والا......بہت ذمہ دار ہے وہ یقیناً وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔"

میں نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے نظریں چرا لیں۔

"تمہاری ماما کبھی نہ مانتیں......صبو! میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں..........او مجھے بہت پہلے ہی تمہیں روک دینا چاہیے تھا تمہیں اور رازی کو..........لیکن پتا نہیں کیوں میں خواب دیکھنے لگا تھا......اتنا خوش گمان کیوں ہو گیا تھا کہ شاید تمہاری خاطر وہ......لیکن نہیں روشن آرا انتخاب کبھی بدل نہیں سکتی..........اس نے صرف اپنی ذات سے محبت کی ہے اور ا آئینے میں سب کو دیکھتی ہے..........ہمیشہ بلندی پر کھڑے رہ کر..........اسے باقی بہت لوگ بونے نظر آتے ہیں بیوقوف اور کم عقل۔"

"پاپا باتیں کرتے کرتے یکدم چپ ہو گئے شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہیں یہ س نہیں کہنا چاہیے۔"

"رازی کی تجویز مجھے قبول نہیں ہے صبوحی..........میں تمہاری ماما کو توڑنا نہیں چاہتا...... ہی تم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتا ہوں..........میں نے رازی کو امریکہ بھجوا دیا اور مجھے لگا جیسے میرا دل ڈوب رہا ہو..........نیچے ہی گہرائیوں میں۔

پاپا نے میرے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیے۔

"گھر بہت مشکل سے بنتے ہیں صبو! اور بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں ذرا سی بے احتیاطی سے..........کوشش کرنا کہ تمہارا گھر کبھی نہ ٹوٹے۔ عاطی کا بہت خیال رکھنا اس کی عزت نفس کو کبھی مجروح نہ کرنا..........اس کا خیال رکھو گی تو وہ تمہیں بہت محبتیں دے گا اس کا کوئی نہیں ہے وہ سارا کا سارا تمہارا ہو جائے گا بس اس کا بہت دھیان رکھنا وہ اپنوں سے بچھڑا ہوا ہے اس کا دل بہت نازک ہو چکا ہے میں نے تمہارے لیے ایک خوبصورت گھر خریدا ہے..........میری طرف سے تمہارے اور عاطی کے لیے گفٹ ہے تمہاری شادی کا......اگر ہو سکے تو اپنے الگ گھر میں منتقل ہو جانا......اسے اپنی مرضی سے سجانا سنوارنا۔"

پاپا کی آواز بھرا گئی تھی اور میرا دل بھی بھر آیا تھا۔

"خاموشی سے آنسو میرے رخساروں کو بھگوتے جا رہے تھے۔ پاپا نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے تھے اور پانچ لاکھ کا چیک دیا تھا کہ اپنی مرضی سے شاپنگ کر لوں شادی کے لیے..........لیکن میں نے تو کبھی بھی اپنی مرضی سے شاپنگ نہیں کی تھی..........سو شادی کی بھی ساری شاپنگ ماما نے ہی کی تھی اور میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ اس روز پاپا بھی ہوتے..........لیکن پاپا نہیں آئے تھے حالانکہ بابا نے بھی اور میں نے بھی ماما سے کہا تھا کہ وہ پاپا کو بھی بلوائیں لیکن شاید انہوں نے نہیں بلوایا تھا..........جب میں پارلر جا رہی تھی تو پاپا کا فون آیا تھا۔ اور انہوں نے مجھے ڈھیروں دعائیں دے کر پھر سے عاطی کا بہت خیال رکھنے کو کہا تھا..........اور میری تو سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ میں عاطی کا کیسے خیال رکھوں۔

"وہ صبح ماما کے ساتھ ہی آفس چلا جاتا تھا..........آتا تو میں اسٹوڈیو میں ہوتی دراصل ماما کا خیال تھا کہ مجھے اپنی تصاویر کی ایک EXHIBITION (نمائش) کرنا چاہیے۔ اس کم عمری میں شہرت ملنے کی اور ہی بات ہوتی ہے۔ سو میں مصروف رہتی تھی..........وہ بہت نرم خو اور سادہ مزاج تھا۔ پاپا صحیح کہتے تھے..........وہ چاہتا تھا ہم کہیں گھومنے جائیں۔ کاغان یا سوات۔ لیکن ماما کا خیال تھا یہ ضروری نہیں ہے پھر کبھی چلے جانا پہلے کام مکمل کر لو۔"

اس نے ماما سے اصرار نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس نے سوات کے لیے سیٹیں بھی بک کروالی

تھیں مگر وہ کئی دن تک چپ چپ سا رہا تھا.......... ہمارے درمیان تو بہت کم بات ہوتی تھی کئی دفعہ تو ہم دونوں ایک ایک گھنٹہ خاموش بیٹھے رہتے۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے صبوحی! جیسے تم خوش نہیں ہو میرے ساتھ۔''

ایک روز اس نے انتہائی افسردگی سے کہا تھا۔

''تم اتنی چپ چپ رہتی ہو اور اتنی اداس۔''

''میں تو ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں عاطی دراصل میرا مزاج۔''

''ہاں!'' اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا میں جانتا ہوں صبوحی! ہم کبھی آپس میں نہیں لڑیں گے اور کبھی علیحدگی اختیار نہیں کریں گے.......... تاکہ ہمارے احساس محرومی کا شکار نہ ہوں...... میں تمہارے سارے دکھوں کو اپنے دل میں اتار لینا چا ہوں......اور تمہارے سارے خلا اپنی محبتوں سے پر کر دینا چاہتا ہوں تمہیں اتنی خوشیاں دینا چا ہوں کہ تمہارا دامن تنگ ہو جائے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں تمہارے لیے۔''

اور اس سے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے تھے اور پورا چہرہ روشن روشن سا گیا تھا۔

''مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں صبوحی۔ میں اور تم ہم دونوں اکلوتے تھے لیکن ہمارے اکلوتے نہیں ہوں گے۔''

اور اس روز پہلی بار اس کی موجودگی میں میرا دل زور سے دھڑکا تھا اور میرے رخساروں آگ سی دہک اٹھی تھی اور پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ اور وہ بہت دیر تک یونہی میرے ہاتھوں کو ا ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا تھا۔

اور اب رات میں اسے یہی خوشخبری تو دینا چاہتی تھی لیکن پہلے وہ اپنی باتیں کرنے لگا اور میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور جانے کب میں اس کی باتیں سنتے سنتے سو گئی تھی اور اب کہیں جانے کی بات کر رہا تھا۔

لیکن کہاں..........؟ یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا اور مجھے تصویر بنانا تھی.......... اور میر پاس صرف چھ دن تھے پتا نہیں اب بھی میں تصویر کو ٹچ دے سکوں گی یا نہیں..........

میرے اندر مایوسی تہہ در تہہ کر کے اترنے لگی اور میں بہت دیر تک آنکھیں موندے کرسی پر جھولتی رہی یہاں تک کہ بابا نے آ کر اسٹوڈیو کی لائٹیں جلا دیں۔

''بیٹا! اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو۔''

''یونہی بابا!'' میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''عاطی میاں ناراض ہو کر گئے ہیں؟''

''نہیں تو'' میں نے ذہن پر زور دیا ہمارے درمیان تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

''اچھا!'' بابا مطمئن ہو گئے پھر شاید وہ کمپنی کے کام سے گئے ہوں۔

''ہاں کمپنی کے کام سے'' میں چونکی۔

''وہ تو کسی جاب کا ذکر کر رہا تھا لیکن بھلا اسے کسی جاب کی کیا ضرورت ہے یقیناً میں نے غلط سنا ہوگا۔''

''اور بیٹا؟ آپ نے اپنی دوائیں لیں۔''

''نہیں تو''

''بہت بری بات ہے وہ خفا سے ہو گئے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

وہ ناراض ناراض سے میری دوائیں لینے چلے گئے اور بابا ہی تھے جو مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے ''انتخاب منزل'' کے قریب ہی ڈاکٹر آصفہ کا کلینک تھا میری کئی دنوں سے طبیعت خراب تھی چکر آ رہے تھے اور دل بے حد خراب سا رہتا جیسے ابھی متلی ہو جائے گی۔

''روشن آرا کو تو کچھ خیال نہیں اور یہ عاطی میاں کو بھی اتنا مصروف کر رکھا ہے انہوں نے۔''

بابا میری حالت دیکھ کر بڑبڑاتے رہتے اور روز مجھے تاکید کرتے تھے کہ میں عاطی سے کہوں کہ وہ مجھے ہاسپٹل لے چلے اور کسی اچھے سے ڈاکٹر سے میرا چیک اپ کروائے.......... مگر مجھے یاد نہ رہتا کہ مجھے عاطی سے کہنا ہے کہ وہ مجھے ہاسپٹل لے چلے۔ اس روز میری طبیعت بہت خراب تھی صبح سے الٹیاں کر کر کے مجھے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی کھڑی ہوتی تو آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگتے تب میں نے سوچا یہ قریب ہی تو کلینک ہے آخر میں خود کیوں نہیں چلی جاتی ڈاکٹر کے پاس شاید میں مرنے والی ہوں میں نے سوچا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بابا

تے مجھے جاتے دیکھا تو وہ خود ہی ساتھ چل پڑے۔

”کسی کو کسی کا خیال نہیں اور یہ روشن آرا کتنا پیسہ اکٹھا کرے گی اور پھر کس کے لیے ـــــ ج ہے وہ ہی نہیں رہی تو۔“

وہ راستہ بھر بڑبڑاتے رہے تھے ـــــ

”آپ کے ساتھ کون ہے ـــــ آپ کی والدہ ہسبینڈ یا ساس ذرا انہیں بلوائیں۔“

”ان میں سے تو کوئی نہیں پاپا ہیں! دراصل ماما ـــــ ماما تو کراچی گئی ہوئی ہیں اور میری ساس ہیں ہی نہیں۔“

”اوکے“ ڈاکٹر آصفہ ذرا سی دیر کو حیران سی ہوئیں۔

”آپ ماں بننے والی ہیں۔“

اور میں حیران سی انہیں دیکھتی اور ان کی ہدایت سنتی رہی تھی ـــــ اور پھر اچانک ہی میرے اندر خوشی و مسرت کی لہر سی اٹھی تھی ـــــ اور بہت دنوں بعد میں نے اپنے اندر رنگوں کی پھوا برسے محسوس کی تھی۔

اور عاطی ـــــ عاطی کتنا خوش ہوتا اسے سن کر ایک بار پھر مجھے عاطی کا خیال آ گیا تھا او مجھے افسوس ہونے لگا تھا کہ میں اسے اب تک کیوں نہیں بتا سکی کہ ـــــ

اور تب ہی پاپا میری ساری دوائیں لے کر آ گئے۔ اور خود سب دوائیں کھلائیں اور اصرار ک کہ کھانا کھا کر آرام کروں ـــــ لیکن میں نے انہیں بتایا کہ آج میں اسٹوڈیو میں ہی رہوں گ اور کھانا نہیں کھاؤں گی بس دو سلائس بنوا کر بھجوا دیں۔ پہلے بھی جب کبھی میں دیر تک کام کرتی تھی عاطی کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے اسٹوڈیو میں ہی سو جاتی تھی ایک طرف کارپٹ پر میں۔ میٹرلیس بچھا رکھا تھا۔

”اپنی صحت کا خیال نہیں اور کام کیے جائیں گی۔“

پاپا بڑبڑاتے رہے اور میں نے اٹھ کر ایزل پر نیا کینوس لگایا اور کام کرنے لگی ـــــ

پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ مجھے تو کچھ ہوش نہ تھا ـــــ ماما کے آنے میں صرف ایک دن ر تھا۔ جب میں نے تصویر مکمل کر کے اسے دیکھا۔

امید کے سارے رنگ اس تصویر میں موجود تھے ننھی بچی کی آنکھوں میں اس کے جگنو دمک رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنیاں ہر چیز کو روشن کر رہی تھی ـــــ دھنک کے سارے رنگ امید کا لبادہ پہنے دھرتی پر اتر آئے تھے ایک ننھا سا فرشتہ آسمان سے امید کا پیغام لے کر اتر رہا تھا اور اس کے سفید لباس اور پروں سے بھی رنگ اور روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

میری تصویر مکمل تھی۔

مطمئن ہو کر جب میں نیند سے بوجھل آنکھیں لیے اپنے بیڈ روم میں آئی تو سائیڈ ٹیبل پر نیلے رنگ کا لفافہ دیکھ کر حیران ہو گئی اور اسے کھول کر مندھی مندھی آنکھوں سے پڑھا یہ عاطی کا خط تھا جسے گئے اتنے روز ہو گئے تھے اور اتنے سارے دن میں تصویر بنانے میں مگن رہی تھی اور میں نے اس کی کمی محسوس ہی نہیں کی تھی۔

”صبوحی“ اس نے لکھا تھا ـــــ میں جا رہا ہوں ـــــ میں نے زنجیریں کاٹ دی ہیں اور اپنا آپ چھڑا لیا ہے ـــــ بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم نے بھی اپنا آپ اپنی ماما کے پاس گروی رکھ چھوڑا ہے میں چاہتا تھا صبو! تم بھی اپنے آپ کو آزاد کر لو ـــــ ہم اپنی زندگی جئیں ماما کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر نہیں ـــــ جب سے میں یہاں آیا تھا مجھے لگتا تھا جیسے میں اپنا آپ کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں جیسے میری اپنی کوئی خواہش کوئی مرضی نہیں میں انجینئر بننا چاہتا تھا ماما نے کہا نہیں تمہیں ایم۔ بی۔ اے کرنا ہے مجھے شوخ و شنگ چنچل اور بااعتماد لڑکیاں پسند تھیں لیکن ماما نے کہا۔

”عاطی تم اور صبوحی ایک دوسرے کے لیے بہت موزوں ہو ـــــ“ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی خاص جذبہ نہ تھا صبو! لیکن جب تم میری زندگی میں شامل ہو گئیں تو ہولے ہولے میری دھڑکنوں میں بھی سما گئیں میرے دل میں اتر آئیں۔ صبو! میں تمہیں دیکھتا تو مجھے لگتا جیسے تم کوئی لڑکی نہ ہو جیتی جاگتی بلکہ قربان گاہ کے لیے مخصوص کی گئی بھیڑ ہو معصوم یا پھر ماما کی کوئی غلام۔

ان کا ہر حکم کو بجا لانے کی پابند۔

کبھی مجھے تم پر بہت غصہ آتا جب تمہارا انتظار کرتے کرتے میں تھک جاتا اور تم اسٹوڈیو یں ماما کے حکم پر کام کر رہی ہوتیں ـــــ لیکن پھر تمہاری تھکی ہوئی صورت دیکھ کر میں چپ کر

جاتا.........لیکن میں نے فیصلہ کرلیا صبو! اپنے لیے اور تمہارے لیے کہ ہمیں یہاں سے جانا۔ ....اور ان دیکھی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دینا ہے.........میں نے جاب کر لی ہے... کراچی کی ایک پرائیویٹ کمپنی میں......پندرہ دن بعد مجھے جوائن کرنا ہے بہت پرکشش تنخواہ ا بے شمار سہولتیں۔

صبو! آؤ ہم اپنی چھوٹی سی دنیا الگ تخلیق کریں.........اور اس دنیا کو چھوٹی چھوٹی خوشیوا اور مسرتوں کے پھولوں سے سجالیں.........میں نے سوچا تھا یہ پندرہ دن ہم خوب گھومیں گ سیر کریں گے......لیکن صبو تم.........میں جارہا ہوں.........میں تمہاری خاطر بھی اب یہا نہیں رک سکتا۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہاں میرا دم گھٹ جائے گا.........کیا تمہارا دم نہیں گھٹتا صبو! کیا اپنی زندگی نہیں جینا چاہتیں.........میں تمہیں بتانے آیا تھا صبو کہ میں جارہا ہوں لیکن تم نے مجھ روکنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی خود میرے ساتھ چلنے کا کہا......صبو! اگر آنا چاہو تو اس نمبر پر مجھ رنگ کر لینا......کراچی جانے سے پہلے میں کچھ دن یہاں رکوں گا......مجھے تم پر ترس آتا ہے۔

میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔

تم قربان گاہ کے لیے مخصوص کی گئی معصوم بھیڑ لیکن میں یہاں رہ بھی نہیں سکتا مجھے خوف ہ اگر آج میں رک گیا تو پھر کبھی بھی یہ زنجیریں نہیں کاٹ سکوں گا.........چلی آؤ صبو.........

زندگی بہت خوبصورت ہے۔

آؤ ہم اس کی خوبصورتیوں کو اپنے دامن میں بھر لیں۔ اور بہت دیر تک خط ہاتھ میں لے ساکت بیٹھی رہی نیند میری بند ہوتی آنکھوں سے غائب ہو گئی.........اور مجھے لگا جیسے میرا کو بہت نقصان ہو گیا ہے۔ جیسے میرے اندر جلتی کوئی بے نام سی روشنی ایک دم بجھ کر اندر اندھیرا کر گ ہو......ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی.........اور میں نے عاطی کو لکھا ہوا نمبر ڈائل کیا۔

''عاطی......! وہ میرا مطلب ہے عاطی صاحب ہیں؟''

''وہ اس وقت تو نہیں ہیں آپ کون؟''

''اور میں نے ریسیور......کریڈل پر ڈال دیا میری پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی تو عاط ابھی یہاں ہی ہے۔''

اور میں ایک بار پھر اس کا خط اٹھا کر پڑھنے لگی پتا نہیں یہ عاطی نے کیا لکھ دیا تھا میں صحیح طرح سے سمجھ نہیں پارہی تھی.........اور میرا دل ازحد بوجھل ہو رہا تھا۔ اور اندر تاریکی پھیلتی جارہی تھی ....اور ماما کے آنے تک میں اس خط کو کوئی بیس دفعہ پڑھ چکی تھی.........حالانکہ ماما اگلے ہی روز آ گئی تھیں.........میری تصویر انہیں پسند آئی تھی اور انہوں نے اسے مقابلے میں شمولیت کے لیے بھجوایا تھا.........لیکن عاطی کے جانے پر وہ ازحد غصے میں تھیں۔

عاطی نے باقاعدہ استعفیٰ دے کر ان کی کمپنی میں کام کرنے سے معذرت کی تھی۔

''احسان فراموش وہ غصے میں ٹہلتی رہیں بہت دیر تک یہ میں تھی جو اسے یہاں لائی تھی وہاں گوٹھ میں رہتا تو زیادہ سے زیادہ اسکول ماسٹر بن جاتا.........اور میں نے سوچا تھا بھائی کا بیٹا ہے اور اب اس کا اپنا کوئی نہیں۔''

وہ بہت دیر تک بابا کے سامنے بولتی رہیں بابا خاموش بیٹھے سنتے رہے وہ ماما کا مزاج جانتے تھے کہ اگر اس وقت بولے تو ماما ان کی بزرگی کا بھی خیال نہیں کریں گی۔

وہ تو صبو جی کے قابل بھی نہیں تھا.........میں نے سوچا تھا.........وہ لمحہ بھر کو بات ادھوری چھوڑ کر کچھ سوچنے لگیں اور پھر بابا سے بولیں۔

''اس کا پتا کروائیں ماموں! اور اسے طلاق کا نوٹس بھجوا دیں.........اور اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو خلع کے لیے کیس کر دیں۔''

''روشن آرا بیٹی۔'' بابا نے ازحد حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''وہ اس کا دوست ہے یہاں دلدار ٹمن جس کے پاس وہ کبھی کبھی جاتا ہے.........اس سے پتا کریں اس کا ٹھکانا ضرور جانتا ہو گا وہ۔''

بابا کی بات کاٹ کر انہوں نے فیصلہ سنایا۔

''مگر روشن آرا بیٹی! تم اس وقت جذباتی ہو رہی ہو تم عاطی سے ملو تو.........اس سے پوچھو کہ اسے کیا شکایت ہے۔''

''میں نے جو کہا ہے ماموں! وہی کریں پلیز۔''

ماما اپنا فیصلہ سنا کر چلی گئیں اور مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ کہ میں کیا چاہتی ہوں میں جو

اس کہانی کا سب سے اہم کردار تھی جس کا سب سے گہرا تعلق تھا عاطی کے ساتھ۔

جو اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

مجھ سے ماما نے پوچھا تک نہیں کہ کیا میں بھی عاطی سے علیحدہ ہونا چاہتی ہوں............ آ ر
پہلی بار ماما مجھے بہت خود پسند اور خود غرض لگیں صرف اپنی انا کے خول میں بند............۔

میں نے چاہا کہ ماما سے کہوں کہ مجھے عاطی سے طلاق نہیں لینا۔ وہ تو بہت اچھا ہے۔ بہت مہربان اور شفیق۔ بہت محبت کرنے والا لیکن میرے لب کھولنے سے پہلے ہی ماما کمرے سے ج
چکی تھیں۔ اور میرے اندر کچھ پگھل پگھل کر پانی ہونے لگا............ میں ہاتھ گود میں دھرے یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے میرے ہاتھوں پیروں میں جان ہی نہ ہو۔

بابا نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے انہیں مجھ سے شکوہ ہو کہ میں کیوں نہیں بولی میں
نے کیوں نہیں کچھ کہا۔

لمحہ بھر وہ مجھے یوں ہی شاکی نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر باہر چلے گئے............ میرا ج
چاہا............ انہیں بلاؤں............ انہیں آواز دوں اور انہیں منع کروں کہ وہ سب کچھ جو ماما نے
کہا ہے وہ مت کریں۔ لیکن میری زبان میرے منہ کے اندر جیسے لکڑی کی طرح اکڑ گئی تھی اور با
چلے گئے۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکی............ میرا دل چاہا۔ میں عاطی کو فون کروں لیکن میرے ہاتھ بھی
جیسے پتھر ہو گئے تھے۔

میں سوچتی رہی کہ عاطی کو فون کروں۔

لیکن میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس سے کیا کہوں۔ اور ماما نے اسے کہلوا بھیجا کہ وہ مجھے طلاق
دے دے اور میں ماما کو منع بھی نہ کر سکی ہمیشہ کی طرح انہوں نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

”بحث نہ کرو صبو............ تم کچھ نہیں جانتیں۔“

”مگر ماما میں............“

میں ماما کو نہ بتا سکی کہ عاطی اور میں............ میں اور عاطی ایک دوسرے کے لیے ضروری ہو چکے
ہیں ہم دونوں کے درمیان ابھی تک بہت زیادہ بے تکلفی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے بغیر ”انتخاب
منزل“ ایک دم ویران لگنے لگی تھی............ میں بولائی بولائی پھرتی جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو جو تلاش بسیار

کے باوجود نہ مل رہا ہو۔

ماما عاطی کی خاموشی پر جز بز ہو رہی تھیں۔

”ماموں! آپ خلع کے لیے کسی وکیل سے بات کریں۔“

”مگر روشن آرا ابھی عاطی نے کوئی جواب نہیں دیا کیا خبر ابھی اسے پیغام نہ ملا ہو کیا عدالتوں میں جانا ضروری ہے روشن آرا ہر کام میں جلدی نہ کیا کرو۔“

ماما اس وقت آفس جا رہی تھیں اس لیے انہوں نے بابا سے بحث نہ کی اور میرا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا بابا مجھے بہت دیر تک تاسف سے دیکھتے رہے۔

”تم بھی کچھ بولو بیٹا۔“

میں نے نظریں اٹھائیں اور پھر اپنے آنسو چھپانے کے لیے چائے کا کپ یونہی ٹیبل پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور اسی روز عاطی کا فون آ گیا۔

”یہ............ یہ کیا ہے صبو............“

وہ بے حد مضطرب بے حد بے چین لگ رہا تھا۔

”یہ............ یہ تمہارا فیصلہ ہے یا کہ ماما کا............ نہیں یہ تمہارا فیصلہ نہیں ہو سکتا! صبو کبھی بھی نہیں۔ تم بے زبان گائے تم بھلا کیا فیصلہ کرو گی...... دیکھو صبو! یہ تمہاری اور میری زندگی کا معاملہ ہے ماما کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہماری زندگیوں سے اس طرح کھیلیں............ میں ہرگز طلاق نہیں دوں گا صبو............ میں نے ان کی زنجیریں کاٹ دی ہیں میں ان کے کسی بھی فیصلے کا پابند نہیں ہوں............ لیکن تم............ اگر تمہارا بھی یہی فیصلہ ہے تو............ ایک بار زبان سے کہہ دو صبو! میں تمہیں اپنی زندگی سے علیحدہ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن ماما کے کہنے پر نہیں............ ہرگز نہیں۔“

میں بے آواز روتی رہی۔

”صبو! خدا کے لیے کچھ بولو............ کچھ تو کہو............“

”مجھے پتا ہے ناں تم ایسا نہیں چاہتی ہو............ نہیں چاہتی ہو نا؟“

میرے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

"تم رو رہی ہو؟" اس نے ایک دم تڑپ کر پوچھا۔

شاید اسے آگاہی ہو گئی تھی۔

"مت رو صبو..........! میں پھر فون کروں گا ابھی تم اپ سیٹ ہو ریلیکس ہو جاؤ...... پھر بات کرنا.......... تم نے جو چاہا وہی ہوگا.......... لیکن پلیز صبو.......... خود فیصلہ کرنا...... ماما کے ٹرانس سے نکل کر.......... اچھا خدا حافظ۔"

"سنو.......... سنو عاطی! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی" میں نے ایک دم کہا۔

"کیا؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"کیا".......... اور میرا دماغ جیسے سن ہو گیا.......... ہر چیز ذہن سے نکل گئی۔

"پتا نہیں مجھے کیا بتانا تھا لیکن وہ بے حد ضروری بات تھی عاطی۔"

"او کے صبو.......... کارڈ ختم ہو رہا ہے میں پھر فون کروں گا۔"

اور جیسے ہی اس نے فون رکھا مجھے یاد آ گیا کہ مجھے اسے کیا بتانا تھا.......... اور میں بے بسی سے فون کو دیکھ کر رہ گئی۔

اور پھر اگلے کئی دن ماما مجھے ساتھ ساتھ لیے پھریں.......... میری تصویر اول آئی تھی...... جیم خانہ میں فنکشن تھا اور پھر ماما نے سب کو اس خوشی میں پی۔سی میں ڈنر دیا تھا اور بابا نے مجھے بتایا کہ عاطی مسلسل مجھے فون کر رہا ہے۔

"بیٹا! تمہاری ماما میں لچک بالکل نہیں ہے لیکن تم.......... تم اپنا گھر برباد مت کرنا...... عاطی بہت اچھا ہے۔"

اور میں.......... میں بھی تو اپنا گھر برباد کرنا نہیں چاہتی تھی...... ماما تو بہادر تھیں...... انہوں نے اکیلے زندگی گزار لی تھی لیکن میں تو بزدل تھی بے حد..........۔

"میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔" اس روز ماما آفس سے آئیں تو انہوں نے بتایا لیکن فی الحال ہم انگلینڈ جا رہے ہیں.......... واپس آ کر کیس کریں گے اس دوران وکیل ساری فائل تیار کر لے گا۔

"انگلینڈ مگر کیوں؟"

میں نے لحہ بہ لحہ ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا۔

"تمہیں تمہاری تصویر اول آنے پر انگلینڈ کا ریٹرن ٹکٹ ملا ہے اور میں...... مجھے تو یوں بھی جانا تھا وہاں.......... دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔ تمہاری بھی آؤٹنگ ہو جائے گی...... اور پھر وہاں وہ بابا سے مخاطب ہو گئیں۔"

"حسنین بھی ہے مسز ارباب کا بھانجا اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی.......... پہلے بھی صبو کے لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی.......... اور اب جبکہ میں نے انہیں عاطی سے خلع لینے کا بتایا ہے تو اب پھر وہ خواہش کر رہی تھیں...... اچھا ہے صبو بھی دیکھ لے گی اسے۔"

"یہ ماما کس قدر ظالمانہ باتیں کرتی ہیں۔"

میرا دل اب کے جو ڈوبا تو مجھے لگا جیسے ابھر نہیں سکے گا۔ میں نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر میرا سر ٹیبل پر جا لگا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں تھی اور ماما انتہائی تشویش سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور ڈاکٹر آصفہ اپنا میڈیکل باکس بند کر رہی تھیں۔

"ان کے لیے ریسٹ بہت ضروری ہے مس انتخاب۔" (ماما خود کو مس انتخاب کہلوانا پسند کرتی تھیں.......... اس وقت بھی جب پاپا سے ان کی علیحدگی نہیں ہوئی تھی وہ مس انتخاب ہی کہلواتی تھیں۔)

"مکمل بیڈ ریسٹ.......... کم از کم تین ہفتے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحبہ! کیا یہ سفر کر سکتی ہے اگلے ہفتے ہم لوگ انگلینڈ جا رہے تھے۔"

"نہیں...... کم از کم دو ماہ مزید اسے کوئی سفر نہیں کرنا چاہیے بہت کمزور ہیں کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

ماما نے سر ہلا دیا لیکن وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھیں۔ اور جب وہ ڈاکٹر کو سی آف کر کے واپس کمرے میں آئیں تب بھی ان کی پیشانی پر کسی خیال سے لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔

"اور تم نے بتایا بھی نہیں صبو۔"

انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

کیا انہیں اس بات کی خوشی نہیں ہوئی۔

میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"عاطی کو پتا ہے؟" انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہوں تو پھر بہتر ہے کہ۔"

"نہیں" میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"جب عاطی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے تو پھر اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں یوں بھی اگلے سنڈے کے لیے میں نے سیٹیں بک کروالی ہیں۔"

درد............درد کی ایک شدید لہر پیٹ میں اٹھی اور پورے وجود پر پھیل گئی............ ماما کمرے سے جا چکی تھیں............انہوں نے مڑ کر مجھ سے پوچھا تک نہ تھا کہ مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے یا نہیں۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں کے سامنے وہ آ گیا جو ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

ہنستا کھلکھلاتا ہوا۔

اپنے گدگدے ہاتھوں سے میرے چہرے کو چھوتا۔

اور پھر یکا یک ماما نے اسے میرے ہاتھوں سے چھین لیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا۔

"نہیں میں زور سے چیخی پاپا شاید کہیں باہر تھے میری چیخ سن کر بھاگتے ہوئے اندر آ گئے"

"کیا ہوا کیا ہوا بیٹی۔"

وہ سراسیمہ ہو رہے تھے۔

"پاپا!" میں ان سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی ماما نے اسے مار دیا۔

"کیا ہوا بیٹا............کیا ہوا؟"

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور مجھے تسلی دے رہے تھے۔

"شاید خواب میں ڈر گئی ہے میری بیٹی۔"

"نہیں پاپا............ماما نے سچ مچ اسے مار دیا ہے میرے بچے کو" میں ابھی تک حواس میں نہیں تھی۔

"ہوش میں آؤ بیٹا"

انہوں نے مجھے ساتھ لپٹا لیا اور ہولے ہولے نرم نرم لہجے میں باتیں کرنے لگے میرے آنسو پونچھے اور پھر مجھے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا ہولے ہولے میں سنبھل گئی۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات تھی۔"

اور میں نے بلا جھجک سب کچھ بتا دیا۔

"روشن آرا اس قدر بھی ظالم ہو سکتی ہے۔"

پاپا کے چہرے پر رنج حیرت ملال اور دکھ کے سائے سے پھیل گئے۔

"اب پھر کیا سوچا ہے تم نے؟"

میں نے تو کچھ بھی نہیں سوچا تھا میرے اندر تو جیسے کوئی چھریاں چلا رہا تھا اور میں بچھڑ جانے کے کرب سے گزر رہی تھی جیسے میں اور میرا بچہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑنے والے ہوں۔

"بیٹا!" پاپا میرے سامنے بیٹھ گئے۔

"تمہاری ماں ہمیشہ سے خود پسند تھی خود پسند اور اپنے فیصلے خود کرنے والی.....اور ایسا شاید تمہارے نانا کے رویے نے اسے بنا دیا تھا............تمہارے نانا بہت سخت مزاج کے تھے ساری زندگی ڈکٹیٹر بنے رہے اپنی مرضی چلائی تمہاری نانی اور تمہاری ماما ان کی زندگی میں اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہ کر سکیں............روشن آرا مصورہ بننا چاہتی تھی انہوں نے اسے ایف۔اے کے بعد گھر بٹھا لیا وہ تمہارے پاپا سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن تمہارے نانا نے زبردستی شادی کر دی.......اور ان کی ضد میں اس نے کبھی تمہارے پاپا کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی کوشش نہیں کی اور.......ان کی وفات کے بعد روشن آرا ہر چیز کی مالک تھی............تمہارے ماموں کو تو پہلے ہی تمہارے نانا عاق کر چکے تھے............اور پھر............اس نے اپنی ایجوکیشن مکمل کی............جن دنوں وہ اپنا ماسٹرز کر رہی تھی ان ہی دنوں میں یہاں آیا تھا تمہاری نانی سے ملنے اور پھر ان ہی دنوں تم پیدا ہوئی تھیں اور تمہاری پیدائش کے بعد سے ہی تمہارے پاپا کے ساتھ اس کے اختلافات بڑھ گئے تھے۔ حالانکہ وہ بہت نفیس انسان تھے مگر روشن آرا کو ان سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ تمہارے نانا کی پسند تھے.......اور اب عاطی............عاطی میاں تو اس کے سگے بھتیجے ہیں............لیکن وہ اپنی بات کی نفی کرنے والے کو

معاف نہیں کر سکتی......عاطی میاں نے استعفیٰ دے کر اس کی توہین کی ہے اس لیے......مگر بیٹا تم سمجھدار ہو شاید وہ تمہاری شادی بھی کر دے۔''

''شاید حسنین اچھا لڑکا ہو اور شاید یہ شادی صرف دولت کے لالچ میں ہو کچھ بھی ہو...... لیکن عاطی میاں۔ عاطی میاں بہت اچھے ہیں بالکل تمہارے پاپا کی طرح نرم خو اور نفیس اور پھر یہ بچہ......یہ تو قتل ہے بیٹا۔''

میں نے جھکا ہوا سر اٹھایا مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود کے اندر کہیں ہلچل سی مچی ہو۔

''عاطی کا فون نمبر۔''

''ہاں......ہاں ہے......لکھوا دیا تھا انہوں نے۔''

بابا کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔

''لاتا ہوں ابھی لاتا ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور پھر نمبر لا کر مجھے دیتے ہوئے تاکید کی فون ضرور کر لینا کتنے پریشان تھے۔ وہ اور پھر کتنی ہی دیر تک بابا کے جانے کے بعد بھی میں نمبر ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ کبھی ایک دم خوف سے زرد ہو جاتی اور کبھی آنسو رخساروں پر بہہ نکلتے۔

''عاطی!'' آخر میں نے ہمت کر کے نمبر ملا ہی لیا۔

''صبو......صبو! یہ تم ہی ہو نا۔''

عاطی نے از حد بے چینی سے پوچھا۔

''کہاں تھیں تم کب سے ٹرائی کر رہا ہوں کیسی ہو بابا نے بتایا تھا کہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' میرے اندر جل تھل ہونے لگا۔

''بولو نا صبو......! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''عاطی'' آنسوؤں نے میرا حلق سی دیا۔

''عاطی!'' میں نے بمشکل کہا۔

''مجھے وہ بات یاد آ گئی ہے جو مجھے تمہیں بتانی تھی وہ تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں نا......اور

میرے رخساروں پر سرخی سی دوڑ گئی۔

''اور......اور کیا۔''

عاطی کی مضطرب آواز میں ایک خوشی کا سا رنگ تھا۔

''اور وہ ڈاکٹر آصفہ نے بتایا ہے کہ میں۔''

''کیا وہ زور سے چیخا کیا یہ سچ ہے صبو......تم کہو......کیا کہا تم نے کیا میں......کیا ہم۔''

''ہاں''

''Reallay صبو!''

اس کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔

''مجھے اس لمحے کا کتنا انتظار تھا صبو لیکن تم......یکایک اس کی آواز گر گئی''

''اور وہ جو تمہاری طرف سے مجھے طلاق دینے اس کی آواز بھرا گئی۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا۔''

''ٹھیک ہے صبو! میں آ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری طرح ہمارا بچہ بھی باپ کی شفقت سے محروم رہے......میں اس بچے کی خاطر عمر بھر کے لیے اپنے آپ کو تمہاری ماما کے پاس گروی رکھنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس کی آواز میں تاسف دکھ بے بسی سب کچھ تھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

میرے لہجے اور انداز میں خود بخود ہی ایک اعتماد در آیا تھا اس بچے نے جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا مجھے مضبوط اور توانا کر دیا تھا اور مجھے اتنا حوصلہ بخش دیا تھا کہ میں اپنے فیصلے خود کر سکوں۔

''اور میں نے وہ ان دیکھی زنجیریں کاٹ دی ہیں عاطی اور اپنے رہن رکھے وجود کو آزاد کر لیا ہے۔''

''صبوحی!'' عاطی کی آواز اور لہجے میں از حد حیرت تھی۔

''سنو کیا وہاں وہ گھر جو تمہیں ملا ہے ضرورت کی سب چیزیں ہیں اور اگر نہیں ہیں تو خرید لو''

''صبو......صبوحی! صبوحی یہاں سب کچھ ہے......سب کچھ میں آ رہا ہوں......میں پہلی

فلائٹ سے تمہیں لینے آ رہا ہوں صبو۔"

"اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی لگتا تھا۔ جیسے وہ ابھی جذبات کی شدت سے رو دے گا اوکے میں تیار ہوں۔"

میں نے آہستگی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور ایک پرسکون سانس لیتے ہوئے سر بیڈ کی پشت سے لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

● ○ ●